مولانا آزاد کی آخری تصویر

# مقدّس سرزمین کی حفاظت

## صرف عربوں پر نہیں کل مسلمانانِ عالم پر فرض ہے۔

عربوں نے بیت المقدس کی حفاظت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔ آپ بھی اپنا فرض انجام دیجئے۔ اگر آپ اس جہاد میں عملی حصہ نہیں لے سکتے تو کم از کم مالی امداد ضرور دے سکتے ہیں۔ کُل دشمنانِ اسلام جماعتیں آج غریب اور نہتّے عربوں کے خلاف بالواسطہ یا بلا واسطہ برسرِ پیکار ہیں۔ انہوں نے دنیائے اسلام کو چیلنج دیا ہے۔ مسلمانو! تم اُن کو اس چیلنج کا جواب دو۔ یقین جانو۔ جو کچھ بھی تم اس جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لوگے، وہ بہت تھوڑا ہوگا۔

رقومات صرف با اختیار اشخاص کو ایسی رسیدیں حاصل کرکے دیجائیں جو سنٹرل پاکستان فلسطین فنڈ کمیٹی نے جاری کی ہیں۔ چیک کے ذریعہ رقومات حبیب بنک کی شاخوں میں بھی جمع کرائی جاسکتی ہیں۔

[illegible] ادارہ فردوس

# پاکستان کی خوش حالی میں اضافہ کیجئے

ہم سب آزاد مملکت پاکستان کی ترقی و کامرانی کے خواہاں ہیں لیکن کیا ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ ملک کو خوش حال اور ترقی یافتہ بنانے کی ذمہ داری صرف عمال حکومت یا اراکین سلطنت ہی پر نہیں بلکہ ہم سب پر ہے اور ہم ہی ملک کی تجارت و صنعت کو فروغ دے کر اور خام اور تیار شدہ اشیا کی درآمد و برآمد میں اضافہ کر کے ملک کو خوش حال بنا سکتے ہیں۔

چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر

## ایلائڈ ٹریڈنگ کارپوریشن لمیٹڈ

جیسے تجارتی ادارہ کا وجود عمل میں لایا گیا ہے، جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں خوش معاملگی۔ دیانتداری مالی استحکام اور عمدہ طرز عمل سے تجارتی حلقوں میں ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی ہے۔ اور مختصر سے عرصہ میں ہی انگلستان۔ امریکہ اور یورپ کے مشہور اور ممتاز تجارتی حلقوں سے تعلقات قائم کر لئے ہیں۔ اس لئے آپ جب کبھی سوتی۔ اونی۔ اور ریشمی کپڑا۔ سوت، ریشم یا ہوزری کا سامان وغیرہ یا۔۔ اور کسی قسم کی چیز باہر سے منگانا چاہیں تو

## ایلائڈ ٹریڈنگ کارپوریشن لمیٹڈ کراچی

سے مشورہ کر لیں۔

اس طرح آپ کو داموں میں بھی کفایت رہیگی اور آپ بہتر سے بہتر مال حاصل کر سکیں گے۔

چندہ سالانہ
پانچ روپے آٹھ آنے
ٹیلیفون نمبر ۳۶۶۳

# فردوس

قیمت فی رسالہ
آٹھ آنے
پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱

جلد ۱ — کراچی۔ نومبر سنہ ۱۹۴۸ء — نمبر ۳


## فہرست مضامین

# خدا کے حضور میں

او جگ داتا . داتا جگ کے
او پرکھن ہارے رگ رگ کے

او بن باپ کے او بن ماں کے
مالک دل کے مالک جاں کے

بے کھٹکے مرنے جینے سے
بے پروا کھانے پینے سے

کیونکر کوئی تجھ سے بھاگے
تو موجود ہے آگے آگے

چاہے جس جنجال میں رکھے
مالک ہے جس حال میں رکھے

جو چاہے تو کردے پل میں
چاہے آگ لگا دے جل میں

کانٹوں سے تو پھول نکالے
پھولوں میں تو کانٹے ڈالے

سوکھی شاخ میں کوپل پھوڑے
گیلی ڈال کے پتے توڑے

او فریاد کے سننے والے
کانٹے دل سے چننے والے

دکھ کو سکھ کر دینے والے
سکھ کو دکھ کر دینے والے

سکھ کے مالک دکھ کے مالک
او میرے دکھ سکھ کے مالک

دکھ کے بعد سکھی تو کیجو
سکھ کے پیچھے دکھ نا دیجو

مضطر

# تقدیر

آیئے، کچھ دیر اس مسئلے پر غور کریں اس لفظ کے ایک سادہ معنی ہیں۔ اندازہ کرنا۔

انسان ایک پینٹر ہے جو اپنے فکر و عمل سے اپنی زندگی کی بساط (Canvas) پر اس رنگ و روغن سے جو اسے اپنی جگہ میسر ہے، اپنی تصویر بنا رہا ہے، بُری، یا بھلی تصویر، مگر یہی تصویر اس کی اصلی تصویر ہے، سچی تصویر، اور جیسے جیسے یہ تصویر بن رہی ہے، اُس کی تقدیر بن رہی ہے۔ اچھی یا بری۔ زندگی ختم ہو جاتی ہے، تصویری عمل بند۔ اب ایک شب آتی ہے، عالم برزخ، اور پھر ایک صبح، صبح قیامت۔ اس دن یہ تصویر انسان کے سامنے رکھدی جائے گی۔

یا انسان اپنے صفحۂ زندگی پر اپنے افکار و اعمال کا کاتب ہے، کاتب تقدیر جس قلم بظاہر ہاتھ میں نہ سہی، مگر واقعہ یہی ہے کہ اپنی کتاب زندگی کو لکھ وہی رہا ہے۔ اور وہ نہیں تو فرشتے، مگر لکھ وہ بھی وہی رہے ہیں جو آدمی لکھوا رہا ہے۔ اگر میں یہ سطور کسی دوسرے سے لکھواؤں تو اس کا لکھنا بھی ایسا ہی ہوگا جیسا میرا لکھنا۔ لکھنے یا لکھوا دینے سے اصل مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ غالب مرحوم کا یہ شعر کہ ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق<br>
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

محض شوخیٔ فکر ہے، اور بس۔ محض تفریح طبع جس کا حقائق کی دنیا میں کوئی وزن نہیں۔

خیر تو آدمی کی زندگی کا یہ حساب و کتاب اس کی زندگی میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اور حشر کے دن اس کے ہاتھ میں ہوگا۔

وکل انسان الزمنٰہ طائرہ فی عنقہ

وَنُخۡرِجُ لَهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ کِتٰبًا یَّلۡقٰىهُ مَنۡشُوۡرًا

آپ نے کاغذ پر ایک خط کھینچا۔ خط زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ یہ خط میں ہوں، اور یہ چیز کہ میں اتنا لمبا ہوں، اتنا گہرا ہوں، سیدھا ہوں اور سیاہ، یہ سب میرا اندازہ ہے اور اندازہ، بالفاظ دیگر میری تقدیر، اس کے علاوہ ایک خط کا یہ اندازہ، یہ تقدیر کوئی باہر کی چیز نہیں، خود خط ہی کے اندر موجود ہے۔ پس جو پیش آیا ہے وہ تقدیر ہے۔ جو پیش آئے گا، وہ غیب ہے۔ اور خدا عالم الغیب۔

خط آپ کا عمل تھا، اور جامد۔ جتنا کھینچا، کھنچ گیا۔ مگر آپ خدا کا نقش ہیں، جامد نہیں، نامی، ذی شعور، یہ سچ ہے کہ خدا نے آپ کو جیسا چاہا بنا دیا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ خود آپ بھی اپنے شعور (ارادہ و اختیار سے) اپنے آپ کو بنا رہے ہیں، یا بگاڑ رہے ہیں۔ آپ کے افعال اپنی علت میں خدا سے منسوب ہیں، اور صدور میں آپ سے۔ خدا سے اس لئے کہ وہ خالق اشیا بھی ہے اور خالق افعال بھی۔ اور آپ سے اس لئے کہ وہ افعال آپ ہی کے اعضا و جوارح سے سرزد ہوئے۔ مگر آپ اپنے شعوری دائرے کے اندر اپنے اعمال میں آزاد ہیں، بالکل ہی آزاد نہیں، ایک حد تک آزاد، اور جس حد تک آزاد ہیں اسی حد تک اپنے عمل کے ذمہ دار اور جوابدہ۔

بچہ دوڑتا ہے۔ دوڑنا اس کا ذاتی فعل ہے، جتنی دور دوڑ کر رہ گیا، وہی اس کا اندازہ ہے، اس کی تقدیر۔ کہاں تک دوڑ سکے گا، یہ علم ایک حد تک باپ کو ہے، اسی طرح یہ چیز کہ ایک انسان اپنی زندگی میں کیا کچھ کرے گا، علم الٰہی ہے، اور کس حد تک کرے گا، تقدیر الٰہی، یا اندازۂ الٰہی۔ بچے کے باپ کا علم و اندازہ ظن و قیاس ۔ علم الٰہی۔ تقدیر الٰہی قطعی اور یقینی۔ خدا نے انسان کی زندگی کے نشیب و فراز (معروف و منکر) سب بتا دیئے اور اپنا منشا و رضا بھی؛ اس کے بعد وہ اس کے عمل سے تعرض نہیں کرتا۔ بندے کو اختیار ہے، چاہے غلط راہ چلے، چاہے صحیح۔ اِنَّا هَدَیۡنٰهُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوۡرًا

ایک مثال لیجیے مولانا مودودی کی دی ہوئی مثال۔

بادشاہ اپنی سلطنت کا ایک صوبہ ایک گورنر کے سپرد کرتا ہے، گورنر کا فرض کیا ہے بادشاہ

کی اطاعت۔ اطاعت کیا ہے، بادشاہ کی تنظیم، صوبے میں بادشاہ کے قانون کا نفاذ، صوبے کو بادشاہ ہی کا صوبہ سمجھنا، اور بادشاہ کے دیے ہوئے اختیارات سے اسی کے منشا کو پورا کرنا۔ گورنر نے یہ سب کچھ کیا، اپنی تقدیر بنالی، جب تک گورنر رہا عزت و توقیر سے رہا، جب واپس بلا لیا گیا، انعام و اکرام اور بلندئ درجات کا مستحق ٹھیرا۔ اگر اس کے خلاف کیا تو مترود و مردود۔

انسان اس دنیا میں خدا کا نائب ہے، خدا کا خلیفہ۔ انسان کی زندگی کیا ہے، اس کا صوبہ۔ بڑی عمر ہے تو بڑا صوبہ، چھوٹی عمر ہے تو چھوٹا صوبہ۔ موت کیا ہے اس گورنری سے دستبرداری، حشر کیا ہے، پرسش اعمال۔ جنت کیا ہے، عمل نیک کی جزا، اور دوزخ، اعمالِ بد کی سزا۔

گراموفون آواز کا ریکارڈ ہے۔ سنیما، حرکات و سکنات کا فلم، اسی طرح ایک غیبی مشین ہے جو آپ کے باطن کی حرکات و سکنات کا فلم بنائے چلی جارہی ہے۔ ایک دن یہ دونوں فلم آپ کو دکھائے جائیں گے۔ اور اسی کے مطابق آپ کے لیے جزا ہوگی یا سزا۔

آپ گورے ہیں تصویر میں کالے دکھا دیئے گئے، آپ کا اعتراض درست ہے، آپ چل رہے تھے، یہی فلم آپ کو دکھا دیا گیا، آپ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت آپ چل نہیں رہے تھے، کھڑے تھے۔ اب آپ کے باطن کی فلم آپ کے سامنے آتی ہے۔ آپ کہتے ہیں اس کا ثبوت کہ میں نے یہ چوری کی؟ اس وقت آپ کے ہاتھوں کو زبان دیدی جاتی ہے اور وہ آپ کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔ کیا ایسا ہونا بعید از عقل ہے؟ کیا دور حاضر کی محیر العقول ایجادات ماضی بعید میں کسی کے خواب و خیال میں بھی تھیں۔ اگر یہ کہئے کہ تھیں، تو آج تو وہ واقعی ہیں۔ اسی طرح جو کچھ بروز حشر ہوگا، وہ بھی واقعہ ہوگا۔ قرآن حکیم کے اشارات بلیغ، اللہ اکبر، آج سے تیرہ سو برس پہلے جو کچھ کہا، وہ اسی وقت سے آہستہ آہستہ حقائق میں تبدیل ہوتا جارہا ہے، اور قیامت تک ہوتا رہیگا۔

خدا خالق اشیا بھی ہے اور خالق افعال بھی۔ ایک شخص شراب پیتا ہے، تو اس کا یہ فعل خدا ہی سے منسوب ہوا۔ یہ فعل معصیت ہے۔ تو کیا خدا انسان سے گناہ کراتا ہے؟ اس کا جواب ایک مثال میں مولانا تھانوی نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں قریب قریب اس طرح دیا ہے۔

گناہ ایک بھاری پتھر ہے۔ خدا انسان سے کہتا ہے کہ اسے نہ اٹھانا، مگر ہمارا قانون یہ ہے کہ گر اسے کوئی اٹھانا چاہے گا تو ہم اٹھوا بھی دیں گے۔ انسان نے ممانعت کے باوجود اس پتھر کی طرف ہاتھ بڑھایا، خدا نے اٹھوا دیا۔ الزام اب انسان پر ہے خدا پر نہیں۔ اگر خدا پہلے سے منع نہ کر چکا ہوتا تو البتہ اعتراض ہو سکتا تھا، ہاں خدا اس بات پر قادر تھا کہ انسان کو یہ پتھر اٹھانے سے روک دیتا۔ لیکن یہ جبر ہوتا۔ اس اختیار میں مداخلت جو خدا نے خود انسان کو دیا تھا۔ بات یہ ہے کہ انسان کے سامنے ایک طرف منشاء و رضائے الٰہی ہے، دوسری طرف آزادیٔ عمل، اب اگر وہ منشائے الٰہی کو پورا کرتا ہے، تو جزا پائے گا، ورنہ سزا۔ یہی انصاف، وہی عدل۔ عمر خیام کو خدا بخشے، ہمیں تو نکی اس رباعی کے ٹکڑے میں کہ

من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

بے بصری ہی نظر آتی ہے۔ یعنی وہ حضرت حق کو ان کے مقام عدالت سے نیچے اتار لانا چاہتے ہیں، او ان سے تو یہ کہہ رہے ہیں کہ چور کو سزا نہ دیجئے، بلکہ اس پر اور احسان و کرم کیجئے۔ ایک حاکم چور کو اس کا واجب سزا دیتا ہے، کیا اس میں حاکم کی کوئی توہین ہے۔ مگر عمر خیام اسے توہین سمجھ رہے ہیں، اور خدا کو از راہ ادب یہ مشورہ دیتے ہیں، کہ اس توہین سے بچئے۔ یہ فکر، فکر صالح نہیں۔ فکر ضرور ہے۔ مگر فلط اند اگر فکر صالح ہوتی تو شاعر کو یہ وقوف بھی ہوتا کہ چور کو سزا دینا، رحم و کرم، احسان و عطا کے منافی نہیں بلکہ سزا نہ دینا مظلوم پر ظلم ہے اور سزا کی جگہ احسان کرنا۔ انصاف و عدالت کا خون۔ ہر محل موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔ یورپ فکر صالح سے عاری تھا۔ اس جرم میں عمر خیام کی پذیرائی ہوئی۔ حضرت سعدیؒ کے یہاں فکر صالح کی فراوانی تھی، ان کے ساتھ بے اعتنائی برتی گئی۔

مخفی

# اُردو، ہماری قومی زبان

چھوٹے ملکوں میں یہ ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر تو ایک ہی زبان وہاں کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس کے قواعد اور لب و لہجہ میں فرق ہوتا ہے۔ کسی حصہ میں زبان زیادہ صحیح اور فصیح بولی جاتی ہے۔ اور کسی حصّے میں کم۔ لیکن بڑے ملکوں کی حالت چھوٹے ملکوں سے مختلف ہے۔ خاص کر اُن ملکوں میں جہاں کے رہنے والوں کا مذہب اور نسل وغیرہ ایک نہ ہو۔ جزیرہ نمائے ہند ایک ایسا ہی ملک ہے۔ اس ملک میں آپ جانتے ہیں۔ بہت سے نئے پرانے مذہب اور مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ ان کی گھریلو زبانیں بھی مختلف ہیں۔ اس برِ اعظم کے ایک حصّے پاکستان کو لیں تو آپ مغربی پنجابی۔ پوٹھوہاری۔ لہندا۔ سندھی۔ پشتو۔ اور بلوچی زبانوں کا رواج زیادہ پائیں گے۔ لیکن ان سب کی لکھاوٹ یعنی رسم الخط ایک ہی ہے۔ یعنی اردو۔ ہندوستان کی حالت اس امر میں مختلف ہے۔ زبان اور رسم خط کا اختلاف ہمسایہ یونین میں زیادہ متنوع اور گہرا ہے۔ صرف ایک زبان مرہٹی ہے جو دیوناگری خط میں لکھی جاتی ہے۔ باقی سب زبانوں کا رسم خط جُدا جُدا ہے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں قریباً دو سو زبانیں اور بولیاں مروّج ہیں۔ بولی سے مراد ہے وہ بولی جس کا لٹریچر نہ ہو۔ صرف بولنے میں آتی ہو۔ جب اس کا لٹریچر بن گیا۔ یعنی اس میں کتابیں تصنیف و تالیف ہونے لگیں۔ تو وہ زبان کہلاتی ہے (اسی کو انگریزی میں ڈایلکٹ اور لنگویج کہتے ہیں)، آپ نے دیکھا کہ دونوں مستمروں میں کئی کئی زبانیں اور بولیاں مروّج ہیں۔ اختلاف کی کمی بیشی کے علاوہ ایک اہم فرق یہ ہے کہ پاکستان میں لسانی رنگا رنگی کی تہ زمین ایک ہی ہے۔ یعنی یہ سب زبان شورسینی پراکرت کی اپ بھرنش کی شاخیں ہیں۔ اس لئے ان میں ایک قسم کی خاندانی ہمرنگی اور یگانگی پائی جاتی ہے جبکہ

انڈین یونین کی زبانوں میں اساسی اختلاف موجود ہیں۔ انڈو آرین کے اور دراوڑا ور تبتی وغیرہ کا ٹسراوسلے آپس میں ہم آہنگی سے محروم ہے۔ یہ بحث تفصیل چاہتی ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا کوئی ایسی سبیل بھی موجود ہے جس کے ذریعہ یہ مختلف زبانیں استعمال کرنے والے آپس میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ سرحد کے ہزاروں پٹھان بمبئی میں مختلف پیشوں کے کام کرتے ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ سینکڑوں پنجابی کلکتہ میں ٹیکسی چلاتے ہیں۔ نہ پٹھان گجراتی جانتا ہے اور نہ بمبئی والا پشتو سے واقف ہے۔ اسی طرح نہ پنجابی بنگالی سے واقف ہے اور نہ بنگالی بابو پنجابی جانتا ہے۔ پھر آخر کس طرح کام چلتا ہے۔ کیونکہ آپس میں معاملے طے ہوتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی طرز کلام ایسا ہوگا۔ جو آپس میں اظہار خیال کی ترجمانی کرتا ہوگا۔ کوئی زبان یا بولی ہوگی۔ جس کے ذریعے ایک کی بات دوسرا سمجھتا ہوگا۔ اور اسے اپنی بات سمجھاتا ہوگا۔ یہ ذریعہ اُردو ہے اور اسی کی اصلیت کے بارے میں آج کچھ بتانا ہے۔

جو کچھ ابھی کہا گیا وہ میرا یا اردو والوں کا دعویٰ نہیں۔ بلکہ ان لوگوں کے مشاہدے اور تحقیق کا ماحصل ہے جن کا اردو سے کچھ بھی واسطہ نہیں۔ اور جن کی رائے کو تعصب سے بری سمجھنا چاہیئے۔

انگریزی نوکرشاہی حکومت بدنام ہے کہ اس نے ہندوستان کے ملک کی آبادی میں نفاق کا بیج بویا۔ تاکہ حکومت کو آسانی اور استحکام نصیب ہو۔ مگر دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں انگریز لکھنے والا کیا لکھتا ہے۔ اس کی رائے ہے:۔

> "اکثر کہا گیا ہے۔ کہ ہندوستانی ایک بے قاعدہ کھچڑی بولی ہے جو ان بہت سی زبانوں کے مستعار الفاظ سے بنی جو دہلی کے بازار میں بولی جاتی تھیں۔ لیکن یہ نظریہ رد ہو چکا ہے۔ جب یہ دریافت ہوا کہ ہندوستانی ایک زندہ اور سلامت زبان ہے اور اپنے مولد و منشا میں صدیوں سے مروج ہے اور یہ کہ یہ زبان شورسینی پراکرت کی بیٹی ہے۔ یہ کہنا کہ یہ ایک بے میل زبان ہے۔ جس نے بازار یا لشکر میں ترکیب پائی

واقعات کو اُلٹا بیان کرتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ دہلی کے آس پاس کے لوگوں کی اصلی اور فطری زبان تھی۔ اور وہ اسے بازار تک لائے۔ اس وجہ سے وہ بازار کی زبان مشہور ہو گئی...... دلیسی آدمی اس کو ہمیشہ اردو زبان کے نام سے پکارتے ہیں۔ اردو میں فارسی الفاظ اور رنگ بھرنے کے ذمہ دار مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ تر ہندو ہیں؛

اوپر کے اقتباس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اردو اور ہندوستانی ایک ہی زبان کے دو نام ہیں۔ وہ بازار یا لشکر میں نہیں پیدا ہوئی۔ بلکہ اپنے مولد و منشا سے وہاں لائی گئی اور یہ کہ اس کے بنانے اور سنوارنے میں ہندو مسلمان دونوں کی شرکت کار فرما تھی۔

یہ بحث بہت طوالت چاہتی ہے کہ جس وقت مسلمان فاتحانہ ہندوستان میں آئے اور یہیں رس بس گئے۔ تو کس طرح فاتح اور مفتوح کی تہذیبیں آپس میں سمو گئیں۔ آپس میں لسانی امتزاج ہوا اور باہم رواداری اور موالات کا رشتہ قائم ہوا۔ یہ تاریخی اور لسانیاتی بحث میری کتاب کیفیہ میں ضروری تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اگرچہ اسلامی فتح سے پہلے ہندوستان کی زبانوں میں فارسی الفاظ کی آمیزش ثابت ہے۔ اور یہ گراں ذیل ثبوت پرتھی راج کے دربار کے ملک الشعرا چند بردائی کی تصنیف پرتھی راج راسو ہے، جس میں بے شمار عربی و فارسی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی زبان کو شورسینی پراکرت کی اپ بھرنش کہا جاتا ہے۔ لیکن وقت کی تنگی ان امور کی بحث کی اجازت نہیں دیتی۔ اس لئے اردو کی ہندگیری کا مجمل تذکرہ ہوگا اور بس۔

ایک صاحب ہیں روی شنکر شکلا۔ آپ ہندی کے زبردست حامی اور اردو کے جانی دشمن ہیں۔ جو بھی کہہ سکتے ہیں یا کہیئے کہ معقولیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ باتیں آپ اردو کے خلاف کہا کرتے ہیں۔ تین چار برس ہوئے۔ انہوں نے ایک کتاب انگریزی میں لکھی جس کو الہ آباد کے ہندی ساہتیہ سمیلن نے شائع کیا۔ قیاس ہو سکتا ہے کہ اردو کے خلاف انہوں نے کیا کچھ زہر اُگلا ہوگا۔

لیکن جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ وہ ایک سچی بات کہے بغیر نہ رہ سکے۔ لکھتے ہیں :۔

تہندوستانی مغربی ہندی کی ایک بولی ہے اور وہ آجکل کی ہندی کی بنیاد ہے" یعنی جسے عہد حاضر میں ہندی کہتے ہیں۔ وہ ہندوستانی سے نکلی ....... اور فرمایا ہے :۔

"...... شمالی دوآبہ گنجم میں ہندو مسلمان دونوں ہندوستانی بولتے ہیں اور بعض خطوں میں یا زیادہ تر یو۔پی میں۔ ہندوستانی مہذب بول چال کی زبان ہے۔ ہندوستانی سارے ہندوستان میں کم وبیش سمجھی جاتی ہے"

اب کسی رائے، تحقیق یا شہادت کی ضرورت نہ رہی اس بات کے قطعی اثبات میں کہ اردو سارے جزیرہ نمائے ہند میں سمجھی جاتی ہے۔ جو زبان سارے ملک میں سمجھی اور بولی جائے وہی قومی زبان کہی جاسکتی ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ اُردو جزیرہ نمائے ہند کی قومی زبان ہے۔ اس لئے اور بھی وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے۔ جہاں تک میں معلوم کرسکا ہوں ارباب پاکستان کا بھی یہی ایمان ہے اور یہ امر مسلم الثبوت ہے۔ جبھی تو قائد اعظم نے یہ اعلان فرمادیا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہے۔ اور اُردو رہے گی۔ یہ اعلان نہایت دانشمندی کا اور مدبرانہ تھا۔ کیونکہ پانچویں کالم والے کھٹ لبے بیٹے۔ اور مشرقی پاکستان میں ان کی ہنگامہ آرائی رنگ لانے کو تھی۔ مگر اس وقت کے اعلان نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور شرارت کا شرار شعلہ بننے سے پہلے ٹھنڈا پڑ گیا۔

مغربی پاکستان میں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ مغربی پنجاب میں تو اردو کی دفتری حیثیت ایک صدی سے بھی کچھ آگے جاتی ہے یہی حال صوبہ سرحد کا ہے، جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک پنجاب میں شامل رہا۔ بلوچستان کی کیفیت کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہوگا۔ کہ اس وقت ایک درجن سے زیادہ اردو کے اخبار وہاں سے نکل رہے ہیں۔ رہا مرکزی صوبہ یعنی سندھ۔ کئی برس سے انجمن ترقی اردو کا قائم کیا ہوا اُردو مرکز جس کا مستقر حیدر آباد ہے۔ بہت کامیابی سے

مصروفِ کار رہے۔ پچھلے برسوں میں اردو کانفرنسوں کے اجلاس جس کامیابی اور ادب گستری کے
ساتھ سندھ میں ہوتے رہے، اس کا فخر شاید اور کسی صوبے کے حصے میں نہیں آیا۔ قدسی دہلوی
اور آغا شاعر دہلوی کی آوازیں ابھی تک بہاولپور اور خیرپور میں گونج رہی ہیں۔ حال کے حادثوں
کی بدولت دلی کی ادبی مصروفیت تو کہنا چاہیئے، بالکل ہی سندھ میں منتقل ہو گئی ہے۔ لاہور
اردو کی خدمت و اشاعت اور ادبی اشغال کے لحاظ سے سارے ملک ہند میں امتیازی حیثیت
رکھتا ہے۔ جسے تمام اردو دنیا تسلیم کرتی ہے۔ ان حالات کے زیرِ نظر پاکستان میں اردو کی عام
قومی اور سرکاری حیثیت اور اس کی پاک گیری کی صلاحیت بداہت کے ساتھ ثابت ہے۔

یہی نہیں کہ اردو چونکہ پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیدی گئی اس لیئے پاکستان نے
اسے قبول کر لیا۔ بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان اول سے اردو کو قومی زبان سمجھتا تھا۔ اس نے
کبھی اردو کی خدمت سے پہلوتہی نہیں کی۔

آج کے مقررہ موضوع پر جو کہنا تھا وہ کہا جا چکا۔ لیکن میں ایک اوپر کی بات کہنے کے لئے
اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ آپ نے مان لیا کہ اردو قومی زبان ہے۔ قائدِ اعظم نے بالاعلان
فرما دیا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہے۔ اور اردو رہے گی۔ دہلی۔ اور یوپی سے سینکڑوں
اردو کے شاعر اور مصنف اور ادیب اور بہت سے نامی ادارے وہاں سے اٹھ کر پاکستان میں
آ گئے اور اب وہ یہیں کے ہو گئے۔ یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حکومت کے کاروبار کا روزانہ
کا رویہ کیا ہے۔ محکموں کے بڑے چھوٹے افسر اور ان کے نیچے کام کرنے والے کس زبان میں عرضداشتیں
لکھتے ہیں۔ کس خط میں نوٹ پیش ہوتے اور احکام جاری ہوتے ہیں؟ کیا سرکاری خبریں اور اعلان
اخباروں کو اردو میں بھیجے جاتے ہیں یا انگریزی میں۔ سرکاری اور نیم سرکاری موقعوں پر وزیروں
اور اعلیٰ افسروں کی تقریریں اردو میں ہوتی ہیں یا انگریزی میں؟ افسوس ہے کہ ان اور ایسے سوالوں
کا جواب مایوس کرنے والا اور دل شکن ہے۔ گمان ایسا ہوتا ہے کہ مرکزی دفتروں میں کام کرنے
والوں کی تعلیم ایٹن اور ہیرو میں شروع ہوئی تھی۔ اور وہ ابھی آکسفورڈ اور کیمبرج سے فارغ التحصیل

ہو کر آرہے ہیں۔ کیا گلہ ہے کہ اگر کوئی کہے کہ واہ یہ خوب وطن پرستی ہے۔ اچھی آزادی اور قومی غیرت ہے۔ خوب قائدِ اعظم کے ارشاد کی تعمیل ہے۔ یہ غلامانہ احساس دلوں سے دور ہونا چاہیئے۔ انگریزی کی تعلیم کی مخالفت کسی کا مقصد نہیں۔ لیکن شکایت ہے اور بجا شکایت کہ روزانہ دفتری کاروبار میں قومی زبان سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ انگریزی کے آگے ہاتھ پھیلایا جاتا ہے۔

(بہ اجازت وشکریہ، ریڈیو، پاکستان۔ کراچی)

کیفی

---

# نقوشِ جمیل

(زیرِ طبع مجموعہ "ترکش" کی ایک غزل)

بالغ نظر کے سامنے جلوے کہاں نہیں　آنکھوں میں وہ نہیں ہیں کہ دل میں عیاں نہیں
روئے زمیں نہیں کہ سرِ آسماں نہیں　میری جبینِ شوق کے سجدے کہاں نہیں
بیکار تیری کوشش پرواز ہے یہاں　اے مرغِ دل قفس ہے ترا آشیاں نہیں
اب سر جھکا دیا تو اٹھانا محال ہے　میری جبین ہی نہیں یا آستاں نہیں
پھر کس لئے نقاب ترے رخ سے اٹھ گیا　منظور اگر نظر کا مری امتحاں نہیں
میں اور تم سے شکوۂ جور و جفا کروں　ہے ہے خدانخواستہ تم آسماں نہیں
دشواریوں سے خوف نہ کھاؤں گا میں کبھی　ہوں راہبر غبارِ رہِ کارواں نہیں
دیکھا ہے تجھ کو میری نگاہوں نے چار سو　ایسی جگہ بھی ہے کہ ترا آستاں نہیں
اللہ یہ کرشمۂ لطفِ نگاہِ دوست　اب کوئی میرے حال پہ نا مہرباں نہیں
تاراجیٔ چمن سے ہے محشر بپا مگر　خاموش اس طرح سے ہوں گویا زباں نہیں
گو حد سے بڑھ گئی ہیں تری بے نیازیاں　کیا بات ہے کہ پھر بھی یہ دل بدگماں نہیں

نیّر ہمیں اسیریٔ زنداں ہی خوب ہے
بجلی کا ڈر نہیں ہے غمِ آشیاں نہیں

نیّر جبلی۔ از کراچی

# حضرت اکبرؔ کے کلام کا مطالعہ

## کچھ ادھر سے کچھ اُدھر سے

حضرت اکبر الہ آبادی کو نافہم اور ظاہر بین پڑھے لکھے لوگ (اور افسوس کہ انہیں کی اس دور میں کثرت ہے) محض ایک بذلہ سنج ظریف شاعر کی حیثیت دیتے ہیں اور ان کے کلام کے حقایق و معارف کو محض ہنسی، دل لگی کی پھلجھڑیاں، اور گھڑی بھر کا دل بہلاوا سمجھتے ہیں۔ ممکن تھا یہ ظرافت جو کلام اکبر کی اتنی بڑی نقیب ثابت ہوئی تھی، ان کے کلام کی اصل روح کے لئے سب سے گہری نقاب ثابت ہوتی، اور اس سے لطف اٹھانے والے محض اس کی ظرافت کے شیریں اور دل پسند ذائقہ پر بس کر لیتے، اور اس کی تہ میں اصلاح کی جو تلخ اور مفید کونین مستور تھی، اس سے مطلق بہرہ اندوز نہ ہوتے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ حضرت اکبر کی وفات کے چند ہی ماہ بعد رسالہ اردو میں، جو اس زمانہ میں اورنگ آباد دکن سے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ادارت میں نکلتا تھا، ملک کے نامور ادیب اور حضرت اکبر کے خاص معتقد اور ان کے کلام کی اصل رُوح سے خوب واقف ہو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی (مدیر سچ و صدق لکھنؤ) نے ان کے کلام پر ایک مبسوط مقالہ دو نمبروں میں تحریر فرما کر "لسان العصر" کی صحیح ترجمانی کا فرض کفایہ، اپنے انداز خاص پر ادا کر دیا۔ اس مقالہ نے کلام اکبر کا مطالعہ کرنے والوں اور اس پر قلم اٹھانے والے اہل قلم کے لئے راہ کے حجابات دور کر کے ایک نئی راہ کھول دی، اور اکبر کی ذات اور ان کا کلام ناقدر شناسوں کی نافہمی کا شکار بننے سے بچ گیا۔

حضرت اکبر، شاعری میں پختہ کار اور استادانہ حیثیت رکھتے تھے۔ نہایت ذہین، طباع پُرگو، ہر صنف سخن پر یکساں قدرت رکھنے والے، اور بڑے زود گو تھے۔ معتبر دیکھنے والوں کا بیان

ہے کہ حضرت اکبر دوران گفتگو میں برابر اس بے تکلفی سے اشعار کہتے جاتے تھے کہ جیسے انہیں طبیعت پر کچھ زور ہی نہیں ڈالنا پڑتا ہے۔ مشکل سے مشکل قوافی کو اس آسانی سے نظم کرتے اور ادق سے ادق مضامین کو اس طرح روزمرہ کے چند مانوس لفظوں میں ادا کر دیتے کہ دیکھنے والے حیران و ششدر رہ جاتے۔

کلام کا اصل جوہر عبرت انگیزی تھا، خود ہی ایک جگہ فرمایا ہے۔

میں اشک آنکھوں میں بھر لایا بلاغت اس کو کہتے ہیں

ان کا یہ قول محض شاعری نہیں حقیقت، کا ترجمان اور ان کے کلام کے صحیح تعارف پر مبنی ہے۔ یوں تو ان کا یہ جوہر، کلیات اکبر کی جلد اول اور دوم دونوں میں نمایاں ہے، لیکن اس میں جو پختگی کلیات کی جلد سوم میں، پیدا ہوئی ہے اس کا اندازہ ہر سخن فہم مطالعہ کے بعد بآسانی کر سکتا ہے۔ کوئی بھی صفحہ کھولئے، عبرت کا کوئی نہ کوئی مضمون ضرور نظر کے سامنے آجائے گا۔ کہیں بے ثباتی عالم اور عالمگیر فنا کا ذکر ہوگا، کہیں آخرت کی یاد، اور خوف خدا کو تازہ کیا گیا ہوگا۔ کہیں افراد اور ملت کی بدعقیدگی بداعمالی، غیروں کی تقلید، مذہب سے بُعد اور بیگانگی اور اخلاق کی پامالی کا ماتم ہوگا۔ اور ان سب کی تہ میں یہ تبلیغ مشترک ملے گی کہ سیدھا راستہ، نجات کا راستہ، وہی ہے جو اسلام نے بتایا ہے۔ جس پر چلنے کی توفیق توحید اور رسالت پر کامل ایمان رکھنے کی صورت ہی میں ہو سکتی ہے، کسی غیر مذہب اور تمدن والے کی تقلید، ترقی کے بجائے مسلمان قوم اور اس کے افراد کو روز بروز تنزل میں گرائے گی، ابھارنے کے بجائے اور پست اور نگونسار کرے گی۔

ان کے کلام کی صداقت کا کرشمہ کچھ تو ان کے ہم عصروں ہی نے دیکھ لیا تھا، اور اب جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں، یہ صداقت اور زیادہ آشکار اور مبرہن ہوتی جاتی ہے۔

آیئے ذرا کلیات حصہ سوم کی ورق گردانی کرلیں۔ اور ظریف کے آنسوؤں سے اپنے دل میں بھی گداز بھر لیں۔ اور اپنی بدعملی اور اس کی وجہ سے اپنی بگڑی ہوئی حالت کا احساس پیدا کرلیں، شاید کہ اسی کی بدولت کچھ اصلاح حال اور تلافی مافات کی توفیق ہو جائے اور حضرت اکبر

کا اصل منشاء شعر گوئی رکہ وہ تبلیغ حق کے سوا اور کچھ نہ تھا کس درجہ میں پورا ہو کر ان کی روح کے لئے باعث انبساط ہو۔

حضرت اکبر کے نوجوان اور نہایت چہیتے صاحبزادے سید محمد ہاشم نے چودہ برس کے سن میں باپ کو داغ مفارقت دیا، اس صدمہ کے موقع پر فرماتے ہیں، ذرا دیکھئے تو سیدھے سادے لفظوں میں کتنا درد بھر کے رکھ دیا ہے ؎

زندگانی کا مزا دل کا سہارا نہ رہا
ہم کسی کے نہ رہے، کوئی ہمارا نہ رہا

ہاشم مرحوم کی وفات پر ایک اور شعر غمزدہ مگر عارف باللہ اور راضی برضائے مولیٰ شاعر کا ملاحظہ ہو۔ ؎

یہ شان بے نیازی اور یہ ہنگامۂ فطرت
گلہ کیا مرگ ہاشم کا، وہی کیا تھا، ہمیں کیا ہیں

لیکن اس درد کی چوٹ کے باوجود خدا اور اس کی رحمت پر بھروسہ میں تزلزل اور شک ایک لمحہ کیلئے بھی نہیں آنے پایا، ارشاد ہوتا ہے ؎

اگرچہ ہے دردِ غم سے مضطر، یہی ہے وردِ زبان اکبرؔ
یہ درد جس نے دیا ہے ہم کو وہی ہماری دوا کرے گا

دنیا کی حرص میں ہمہ وقت گرفتار رہنے والے شخص کی عالم نزع میں یاس اور بے بسی کی عکس کشی اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔ ؎

طالب دنیا کو وقت نزع کیوں ہوتی نہ یاس
تھا جو ظاہر ہو گیا وہ ختم، باطن کچھ نہ تھا!

ملت اور فرد کی تباہ حالی کی ذمہ داری، خود ان کے اعمال پر ہے، حضرت اکبر اس مضمون کو یوں ادا فرماتے ہیں۔

طرز عمل پہ ہم نے کبھی غور کیا کیا — جو نفس نے کہا وہ کیا اور کیا کیا

بہت گناہگار کی قوت جو چھین لی　　بے شک خدا نے رحم کیا، جور کیا کیا

فنا کا مضمون، غزل کی لے میں سنئے ؎

منتشر ذروں کو بکجائی کا جوش آیا تو کیا　　چار دن کے واسطے مٹی کو ہوش آیا تو کیا

عارضی میں موسم گل کی یہ ساری مستیاں　　لالہ گلشن میں اگر ساغر بدوش آیا تو کیا

حد حیرت ہی میں رکھا ضعف نے ادراک کو　　پیکر خاکی کو اس عالم میں ہوش آیا تو کیا

اکبر کا ایک موحدانہ رجز پڑھیئے، اور اپنے سارے مسلمان بھائیوں کو بآواز بلند سنائیے ؎

(۱) اکبر خدا کو مان، زمان و مکاں کو چھوڑ

عرفاں کا ذوق اگر ہے تو کب اور کہاں کو چھوڑ

(۲) پابند کرنہ ساعت و ساحت کا ذہن کو

دار فنا میں حسرت نام و نشاں کو چھوڑ

(۳) رنگ زمانہ رائے کی کثرت سے ڈر نہ جا

سارا جہاں ہو شرک تو سارے جہاں کو چھوڑ

ذیل کے شعر میں قافیہ کی ندرت ہی کا لطف نہ لیجئے۔ بلکہ اس کی معنویت پر نگاہ ڈالیئے، جس شخص کی جتنی زیادہ عمر ہوگی، اتنا ہی اس کے مضمون کو اپنے حسب حال پاکر مصرعہ ثانی کی تکرار بار بار حسرت کے لہجہ میں کرے گا ؎

اب جسم میں باقی ہے مسرت کا لہو کم
احباب میں مرحوم بہت سلمہٗ کم

عبرت اور فنا کا مضمون ایک اور جگہ ملاحظہ ہو ؎

اس دار فنا کی بحثوں میں کیا صرف زباں کیا صرف قلم
دنیا کی بقا کیا اے اکبر کے دن کی خوشی کے دن کا الم
دم بھر میں نشاط طبع فنا، اک آن میں نار حباب ہوا

کیا بزمِ طرب، کیا شانِ شہی، کیا ربط و دف کیا طبل و علم

اکبر کے کلام کو اتنا حسنِ قبول کیوں نصیب ہوا مبالغہ اور تصنع سے خالی۔ دوسطری جواب خود شاعر کی زبان سے سنئے: ؎

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

لیکن دل پہ گذری ہوئی باتوں کے ساتھ بہت سی باتیں آیندہ کی بھی کہہ گئے ہیں، جو ان کے زمانہ میں اگرچہ نہ تھیں، لیکن اُن کے آثار نمایاں تھے۔ اس قسم کی باتوں کو جو انہوں نے زبانِ شعر سے ادا کیں ہم لوگ بجز کشف و کرامات کے اور کس چیز سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ مثلاً ؎

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے دُلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

اور یہ شعر ؎

لکچر ہے اس طرف تو اُدھر بے حسّی بھی ہے
اس سمت ناچ ہے تو اُدھر خودکشی بھی ہے

اور اسی قسم کا تیسرا شعر جس کے مضمون کی پوری تکمیل اب جاکر ہوئی ہے ؎

تعلیم کی خرابی سے ہوگئی بالآخر		شوہر پرست بی بی، پبلک پسند لیڈی

اکبر عورتوں کو جاہل رکھنے کے حق میں نہ تھے، لیکن چاہتے تھے کہ اُن کو صحیح تعلیم دی جائے۔ فرماتے ہیں ؎

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں
ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کی
دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے، تعلیم نہ دو عورت کو

ایک دوسری جگہ ؎

تعلیم یافتہ ہوں اور نیک بخت بھی ہوں　　تم سے رہیں ملائم، شیطاں پہ سخت بھی ہوں

قرآن ہی کرے گا اُن بی بیوں کو پیدا　　پاکیزہ تخم جب ہوں، عمدہ درخت بھی ہوں

ہر بچے مسلمان کی طرح توحید، اس مسلمان شاعر کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ ہر کلیات میں ہر دوسرے تیسرے صفحہ پر توحید کی تاکید کا کوئی نہ کوئی شعر ضرور مل جائے گا ؎

جغرافیہ سے حال گورنمنٹ پوچھئے
ہم تو یہ جانتے ہیں خدائی خدا کی ہے

ایک اور شعر ؎

سب سے بدتر بتوں سے ہے امید　　سب سے بہتر خدا سے ڈرنا ہے

مذکورہ بالا شعر، اس زمانہ میں ہندی مسلمان کے لئے پڑھنا دشوار ہے، لیکن حضرت اکبر کے وقت میں جبکہ حامیٔ دین مسیح انگریزوں کی حکومت قائم تھی، اور ہر چہار طرف تثلیث کی تلبیس قائم تھی، اس وقت اسی موحد نے آئیہ قرآنی مَا اتَّخَذَ اللّٰہُ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحَانَہٗ کو زبان شعر میں کمال ہمت یوں ادا کیا تھا ؎

ہم حضرت عیسیٰ کا ادب کرتے ہیں بیحد
لیکن انہیں اللہ کا بیٹا نہیں کہتے

منکروں اور ملحدوں سے حضرت اکبر کھل کر کبھی مناظرہ نہیں کرتے، لیکن سیدھے سادے شعروں میں ایسے پتہ کی بات کہہ جاتے ہیں اور ایسی دلیل لے آتے ہیں کہ منکر کو بجز تسلیم کے یا اگر اس میں ضد بڑھی ہوئی ہے، اور وہ سمع قبول سے محروم ہے۔ تو بجز سکوت کے اور کوئی چارہ اس کے سامنے نہیں رہتا۔ کہتے ہیں ؎

مجبور عاجزی پہ ہے منکر کی طبع بھی
خواہش کو کیا سمجھتے ہو، صورت دعا کی ہے

ایک اور جگہ یہی بات ؎

آنکھ محروم سہی، لب پہ ترا نام تو ہے　　تیری ہستی کا یقیں قاطع اوہام تو ہے

اور ایک تیسرے مقام پر ؎

خدا کہاں ہے جواب اسکا ہر مقام میں ہے　　نہ سمجھے کوئی تو کہدو کہ اپنے نام میں ہے

بغیر موت و مصیبت کے چل نہیں سکتا　　عجیب راز یہ دنیا کے انتظام میں ہے

دنیا جس حالت پر چل رہی ہے، اور ہم آپ سب کے اٹھ جانے کے بعد بھی اسی طرح آباد رہے گی. اکبر کی زبان نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے. ؎

دنیا یونہی ناشاد یوں میں شاد رہے گی
برباد کئے جائے گی آباد رہے گی

ہمارے شعرائے کرام، بھلا اپنے کلام میں نماز روزہ کی تاکید اشارۃً بھی کیوں کرنے لگے شاعری کو فقہ کا رسالہ بنانا اکبر ہی کا حصہ تھا، ملاحظہ ہو ؎

منہ اپنا غفلت سے موڑ اکبر نماز ہرگز نہ چھوڑ اکبر
بہت فوائد ہیں اس کے اندر، اور اس کی تاکید بھی بڑی ہے

ایک اور جگہ یہی بات ایک دوسرے انداز میں ؎

صف مسجد میں جو آئے نظر عزت کرو اُس کی
یہ سمجھو تم اسے اللہ کے دربار میں دیکھا

دنیا میں پڑ کر اور دنیاداروں کا ساتھ دے کر جو لوگ سکونِ خاطر کے متلاشی ہیں اُن کی ہدایت کے لئے اکبر نے یہ شعر کہا ہے ؎

جو اہل دنیا کا رُخ کروگے، سکونِ خاطر کبھی نہ ہوگا
شریک غفلت بہت ملیں گے، شریک عبرت کوئی نہ ہوگا

ارتکاب گناہ کے بعد انسان کے دل پر جو ندامت اور پشیمانی کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اور نیک عمل کے بعد دل کو جو راحت ہوتی ہے، اس کی عکاسی اکبر کے آئینۂ شعر میں ملاحظہ ہو ؎

شگفتہ پایا طبیعت کو بعد کار ثواب　　دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد

اس وقت ملک میں گیہوں اور غلہ کی جو نایابی ہے اور کنٹرول کی دکانوں پر جو ہجوم لگا رہتا ہے اسے دیکھ کر حضرت اکبر کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔

مجھ کو تو اکبر کا یہ مصرع رہا کرتا ہے درد
جمع ہیں اولاد آدم ہند میں گیہوں کے گرد

علم و حکمت کی ترقی کے باوجود انسان کی لاعلمی کا جو عالم آخر تک رہتا ہے۔ حضرت اکبر اس کو یوں ادا فرماتے ہیں ؎

نہ پوچھو کیا اثر اس مصرعۂ اکبر کا ہے ہم پر
ہر اک کے علم کا ہے خاتمہ واللہ اعلم پر

اور اس وقت جو ہندوستان کی حالت ہے، اس کے پیش نظر یہ پُرحسرت اشعار، کون کہہ سکتا ہے ؎

دلِ شکستہ میں ایمان رہ سکے تو رہے
اُجاڑ گھر میں یہ مہمان رہ سکے تو رہے
دل ضعیف کو چارہ نہیں ہے کفر سے اب
اگر زبان مسلمان رہ سکے تو رہے

اور یہ مضمون بھی کچھ اسی سے ملتا جلتا ہے ؎

ہے منع ملاقات مری ہم نفسوں سے　　فریاد کا موقع نہیں فریادرسوں سے
ہے حکم کہ جس پالسیوں کے ہو مطابق　　احکام بدن کو نہ رگوں سے نہ نسوں سے

لیکن یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے، اکبر کی زبان سے جواب سن کر اس مضمون کو ختم کیجیے ؎

اللہ تو بے شبہ وہیں ہے کہ جہاں تھا
مسلم سے تو پوچھو وہ وہیں تھا کہ جہاں ہے

عبدالقوی دریاآبادی

# اُردو کا پہلا صوفی شاعر

## حضرت خواجہ میر دردؒ

اردو شاعری فارسی زبان کی شاعری کی متبع اور مقلد ہے۔ لیکن فارسی شاعری کے عروج و ترقی کی تاریخ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ایک اہم صنف، صوفیانہ شاعری کی بنیاد اس وقت پڑی جب تاتاریوں کے حملے ختم ہو چکے تھے۔ اس کے برخلاف یہ دیکھنا بہت تعجب خیز ہے کہ اردو شاعری میں صوفیانہ طرز کلام کا آغاز بالکل ابتدائی زمانہ سے ہو گیا تھا۔ حضرت خواجہ میر دردؒ، حضرت مظہر جان جاناںؒ وغیرہما وہ پاک نفس بزرگ تھے۔ جن کے مقدس ہاتھوں اردو شاعری کے شجر میں تصوف کا گل سرسبد لگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دونوں حضرات ایک طرح سے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو صحیح معنوں میں اردو شاعری کی اصلاح و ترقی کا دور اولیں قرار پا سکتا ہے جو سلسلہ ان حضرات نے قائم کیا تھا اگر درمیان ہی وہ شکست نہ ہو جاتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ اردو نظم میں معرفت، خدا شناسی اور اخلاق کے گرانمایہ مضامین کا کیا کچھ اضافہ نہ ہوا ہوتا۔ اور آج اردو فن سخن ترقی و عروج کے لحاظ سے کہاں سے کہاں نہ پہنچا ہوتا۔

اس امر کے تسلیم کرنے سے شاید ہی کسی کو مجال انکار ہو کہ صوفیانہ شاعری "شاعری" کا فی نفسہٖ ایک جزو اعظم ہے۔ اس اعتبار سے حضرت میر درد ایسے بزرگواروں کی مساعی جمیلہ خصوصیت سے قابل تحسین ولائق شکر گزاری ہیں کہ آپ کے رشحات فکر نے اردو ایسی کم مایہ زبان کے خزانۂ ادب میں ان بیش قیمت جواہرات کا اضافہ کیا۔ انصافاً کہنا پڑتا ہے کہ اس صنف خاص میں حضرت دردؒ نے جو کچھ کر دکھایا ہے وہ سب سے زیادہ قابل عظمت ہے۔ آپ کے معاصرین کے علاوہ بعض شعراء مابعد نے بھی اس شاخ شاعری میں گل بوٹے کھلانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن نہ صرف الفضل للمتقدم کے مصداق حضرت دردؒ کو ان سب

فضیلت حاصل ہے بلکہ نوعیت مضامین و صداقت جذبات میں بھی آپ کا پایہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور یہ بات کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔

آپ کا نام نامی خواجہ میر تھا اور درد تخلص کرتے تھے۔ اردو شعرا کی فہرست بہت طویل ہے اور ایسے کئی شاعر آپ کو نظر آئیں گے جو ایک ہی تخلص رکھتے ہوں گے۔ اسی بھرمار کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج کسی کو موزوں تخلص ملنا دشوار ہو گیا ہے اور اب سے بہت پہلے اسی شکایت کا معنی خیز اظہار حضرت اسیر لکھنوی ان الفاظ میں کر چکے ہیں ؎

ڈھونڈتے ہیں پر تخلص بھی نیا ملتا نہیں

لیکن ہزاروں اور لاکھوں تخلصوں میں چند ہی ایسے ملیں گے جو اثر اور مقبولیت کے اعتبار سے اپنے اندر ایک خاص تاثیر رکھتے ہیں اور جن کے سننے سے قلب خاص طور پر متاثر ہوتا ہے اور سامعہ نامعلوم طریقہ پر اس میں مخصوص کشش محسوس کرتا ہے۔ درد بھی بلاشبہ ان میں سے ایک اور غالباً نمبر اول پر ہے۔ اس قسم کے پرکیف و پرتاثیر تخلص بہت کم خوش نصیبوں کے حصہ میں آئے ہیں۔

حضرت درد نسبی سلسلہ میں ماں کی طرف سے حضرت خواجہ بہاءُ الدین نقشبندی کی اولاد میں ہیں۔ داد صیال میں بھی پیری مریدی کا سلسلہ ایک عرصے سے قائم تھا اور دہلی میں جو آپ کا مولد ہونے کا فخر رکھتا ہے۔ آپ کا گھرانا نہایت معزز و مفتخر تھا۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت خواجہ محمد ناصر صاحب نہ صرف ایک خدا رسیدہ اور معرفت شناس بزرگ تھے، بلکہ قدسی صفات ہونے کے ساتھ ہی ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر اور ریختہ کار سخنگو تھے اور عندلیب تخلص کرتے تھے۔

حضرت درد کے بھائی سید محمد میر، اثر تخلص، ایک خوش فکر شاعر تھے۔ آپ کی یادگار ایک دیوان اور مثنوی "خواب و خیال" ہے۔ موخر الذکر کی علمی عظمت کی کفالت غالباً شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم کے یہ الفاظ کر سکتے ہیں کہ "بہت اچھی لکھی ہے"۔

باپ اور بھائی کی مثال سامنے تھی۔ اور غالباً اسی نے حضرت درد کو بھی شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ یہ تو خارجی اثر کہنا چاہیئے۔ ورنہ طبعاً آپ شاعر تھے اور مبدو فطرت سے ایک پختہ مغز شاعر ہونے کی صلاحیت

آپ کے خمیر میں ودیعت کی گئی تھی۔ شاعری کے ساتھ آپکی خاندانی خصوصیت بھی ہاتھ سے نہیں جانے پائی۔ یعنی طریق سلوک و فقر کے پابند بھی آپ پورے طور پر تھے۔ ذاتی خصائل وعادات کے لحاظ سے آپ اخلاق حمیدہ اور اسوۂ حسنہ کی مکمل اور دل کش تصویر تھے۔ صبر وتحمل، قناعت، استقلال، عالی ہمتی۔ آپ کی معمولی صفات ہو سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس پر آپ کو اس قدر بھروسہ تھا کہ ہمیشہ صبر اور شکر کے ساتھ زندگی کے دن گزارنے کی کوشش کی۔ اور کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ دہلی میں شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ ملک میں چاروں طرف بدامنی اور شورش پھیلی ہوئی تھی۔ خاص شہر دہلی میں یہ افسوسناک حالت تھی کہ شرفا کو اپنی عزت وعظمت کی حفاظت دشوار ہو رہی تھی۔ بالآخر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کو ہجرت وطن کی ناگوار مصیبت برداشت کرنا پڑی اور جس کو جدھر کا آسرا ملا چلا گیا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ قدر دانی علم وفن کے اعتبار سے دوسرا دہلی بنا ہوا تھا۔ اہل کمال وصاحب ہنر اشخاص نے جب دیکھا کہ دہلی میں رہ کر کھائیں گے کہاں سے! تو انہوں نے بھی لکھنؤ کا راستہ اختیار کیا۔ اس طریقے سے بہت سے خاندان دہلی سے نقل بود وباش کر کے لکھنؤ آکر آباد ہو گئے۔ لیکن حضرت ذوقؔ دہلی سے نہ نکلے پر نہ نکلے۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ؎

کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

آپ کی نظر میں عالم قدس کے دل فریب مناظر کی سیر میں جب مصروف رہتی تھیں تو انہیں دلی کی ویران گلیوں میں دل بستگی کا سامان کیا خاک ملتا۔ اصلی سبب یہ تھا کہ آپ نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا، کہ جو مالک حقیقی یہاں ہے وہی دوسری جگہ ہوگا۔ اور نقل وطن کا نام نہ لیا۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد اسی واقعہ کے متعلق اپنے انداز خاص میں یوں رقمطراز ہیں:۔

> ملک کی بربادی، سلطنت کی تباہی، آئے دن کی غارت وتاراج کے سبب سے اکثر امرا و شرفا کے گھرانے گھر اور شہر چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے۔ ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ آئی۔ اپنے اللہ پر توکل رکھا اور جو سجادہ بزرگوں نے بچھایا تھا، اس پر بیٹھے رہے۔

* تذکرہ گلشن ہند میں بھی، جو مرزا علی لطف کی تصنیف سے ہے اس واقعہ کا ذکر نہایت شرح وبسط سے کیا گیا ہے

اور اس جگہ اُس کا اقتباس غالباً خالی از لطف نہ ہوگا۔

جبکہ متواتر نزول آفات کے باعث اور مکرر ورود بلیات کے سبب (شاہجہان آباد) خراب ہوا اور مصدر عقوبت عذاب ہوا تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے، اور ہر ایک صابر زاویہ گزین نے اور ہر تونگر مالدار نے، اور ہر امیر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا۔ مگر وہ سید والاتبار کہ نام نامی اس کا خواجہ میر تھا۔ اس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوئے۔ اور شاہجہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم اپنے کنج عزلت سے نہ گئے۔

سطور مندرجہ بالا سے جہاں حضرت دردؔ کے عزم و استقلال کا قابل عظمت اندازہ ہوتا ہے۔ وہاں یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ آپ کی مقدس شخصیت کا کیسا کچھ خوشگوار اثر اور رعب خواص عام پر تھا۔ مصنف تذکرۂ گلشن ہند کے متعلق عام شکایت ہے کہ خواہ کسی وجہ سے ہو اکثر بزرگوں کا ذکر اس نے اپنے تذکرہ میں معاندانہ طریق پر کیا ہے۔ لیکن اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی حضرت دردؔ کے علوئے مرتبت کا دل سے قائل تھا اور آپ کی بزرگی اور جلالت کا سلسلہ اس کے قلب پر بیٹھا ہوا تھا۔ ورنہ جب حضرت مولانا شاہ ولی اللہ ایسے قابل تعظیم اور بابرکت نفوس اس کی درپردہ گستاخیوں سے محفوظ نہ رہ سکے تو حضرت دردؔ کس طرح محفوظ رہ سکتے تھے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت درد نہ صرف شاعر تھے بلکہ صوفی بھی تھے اور صوفی بھی ایسے کہ سرگروہ متصوفین۔ آپ کی یہ خصوصیت آپ کی تصانیف سے بھی نمایاں ہوتی ہے جن کی تفصیل یہ ہے۔

دیوان اردو۔ دیوان فارسی۔ رسالہ اسرار الصلوٰۃ۔ واردات درد۔ علم الکتاب۔ واقعات دردؔ۔ ایک رسالہ حرمت غنا میں۔

رسالہ اسرار الصلوٰۃ اس وقت لکھا گیا تھا۔ جب آپ کی عمر شریف ۱۵ برس کی تھی اور واردات درد کے سال تصنیف میں آپ ۲۹ برس کے تھے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مشاغل علمی کا سلسلہ بالکل ا[illegible]

سے قائم ہو گیا تھا۔ علم الکتاب ایک سو گیارہ رسالوں کے مجموعہ کا نام ہے جس میں نالۂ درد، آہ سرد، درد دل وغیرہ شامل ہیں۔ یہ مجموعہ، جو واردات درد کی شرح کا کام دیتا ہے۔ طبقۂ صوفیائے کرام میں خاص مقبولیت رکھتا ہے اور بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ کے دیوان اردو فارسی بھی اس حیثیت سے کہ اس کی سطر سطر اور صفحہ صفحہ صوفیانہ مضامین سے لبریز ہے۔ متصوفانہ لٹریچر کے لئے مایۂ ناز ہیں۔

آپ صوفی تھے۔ پیری مریدی کا سلسلہ آپ کے خاندان میں قدیم سے چلا آتا تھا۔ آپ کے دولت کدہ میں اوقات مقررہ میں صوفیانہ مجلسیں ہوا کرتی تھیں جس میں اہل دل اور اہل درد شریک ہو کر داخل حسنات ہوتے تھے۔ قوالوں اور ماہرین فن موسیقی کے لئے اس مجلس کی شمولیت بے اندازہ فخر و مباہات کا ذریعہ تھی۔ خود حضرت درد کو فن موسیقی میں دستگاہ کامل تھی کہ بڑے نامی گویّے اور قوال آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی مجلسوں میں شریک ہونے کا شوق شاہ عالم بادشاہ کو بھی تھا اور اُس کے اظہار خواہش کے باوجود حضرت درد نے اجازت شرکت نہ دی کہ فقیروں کی مجلس میں بادشاہوں کا کیا کام۔ اس سے ایک دلچسپ واقعہ متعلق ہے کہ جب ظاہری طور پر شرکت سے بادشاہ مایوس ہو گیا تو ایک دن بلاحصول اجازت چلا آیا۔ شاہ صاحب قبلہ اب کیا فرماتے خاموش ہو رہے۔ اتفاق سے بادشاہ کے پیر میں درد تھا جس کی وجہ سے جب وہ مجلس میں بیٹھا تو پاؤں پھیلا دیئے۔ حضرت درد نے فرمایا کہ یہ فقیر کے آداب محفل کے خلاف ہے۔ بادشاہ نے عرض کی کہ پاؤں درد کر رہا ہے۔ فرمایا کہ تشریف لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اللہ اللہ کیا شان استغنا تھی کہ بادشاہ بھی گھر پر آویں تو پروانہ کی جائے۔ سچ ہے جو نیک بندے خدا کے ہو جاتے ہیں وہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے اور دنیاوی جاہ و جلال ان کے قلب کو متاثر نہیں کر سکتا اور یہی شان بے نیازی تھی کہ عمر بھر گوشۂ عافیت سے قدم باہر نہ نکالا۔ نہ کسی کی نوکری کی اور نہ کسی کے پاس حاجت لیکر گئے۔ شاہی جاگیریں جو بزرگوں سے میراث میں چلی آرہی تھیں، ذریعہ معاش تھیں اور انہیں پر گزران تھا۔

ذاتی حالات و خصائل پر اس سے زیادہ روشنی ڈالنا محال ہے۔ اس وجہ سے کہ اس سے زیادہ حالات کا کسی کتاب یا تذکرے سے پتہ نہیں چلتا۔ اب ہم شاعری کے محاسن پر نظر ڈالیں گے جو بیت

بڑی حد تک اس مضمون کی حقیقی غرض وغایت ہے اور بالفعل اردو شاعری سے بحث کریں گے۔ آپ کا اردو دیوان عام طور پر متداول ہے۔ یہی آپ کا سرمایۂ عمر ہے۔ اور اسی سے آپ کی اُردو شاعری کا حُسن و قبح معلوم ہوسکتا ہے۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ اس دیوان کی ضخامت بہت مختصر اور معدودے چند غزلیات وغیرہ پر محدود ہے۔ لیکن علمی حیثیت سے اردو علم ادب میں یہ ایک گرانمایہ جواہر ہے۔ جس کی آب و تاب دن دونی اور رات چوگنی اور جس کی عظمت و وقعت بے اندازہ ہے۔ غزلیں تعداد اشعار کے لحاظ سے چھوٹی ہیں۔ لیکن ان کا ایک ایک شعر بے مثل و بے نظیر ہے۔ آپ کے کلام میں متانت و وقار اور سنجیدگی کا جزو لاینفک کچھ اس طرح شامل ہے کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کی غزلیات کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ زیادہ تر چھوٹی بحروں میں ہیں اور وہ اپنی جگہ لاجواب دلچسپ اور عدیم المثال لذت سخن سے مالا مال ہیں۔ مثلاً ؎

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی — جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ، فریاد، آہ اور زاری — آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

---

ہم کس رات نالہ سر نہ کیا — پر اُسے آہ کچھ اثر نہ کیا
سب کے یاں تم ہوئے کرم فرما — اس طرف کو کبھی گذر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا — کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
کونسا دل ہے جس میں خانہ خراب — خانۂ آباد تو نے گھر نہ کیا

جو کچھ کہا ہے صاف صاف کہ مطالب کے ذہن نشین ہونے میں کوئی الجھن نہیں پیدا ہوئی۔ پھر معنوی لطافت بھی ہاتھ سے نہیں جانے پائی۔ چونکہ شعر کی بلاغت اصحاب ذوق سلیم سے پوشیدہ نہیں ہے لہٰذا شعر کی طرز تخاطب خاص طور سے قابل داد ہے۔ پہلا شعر صوفیانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، جو حضرت درد

کا خاص رنگ کہا جا سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے بھی یہ رنگ خصوصیت سے نمایاں ہے ؎

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں — کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا
حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم — کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا
شب و روز اے درد درپے ہوں اس کے — کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

---

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

---

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے — تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے

---

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے — شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے
ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے — وہ ہی آڑے آگیا جیدھر چلے

اس مطلع کی شان ملاحظہ ہو۔

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا — ہم سبھی مہمان تھے واں اور تو ہی صاحب خانہ تھا

اسی غزل کے یہ دو شعر نہایت پر کیف ہیں۔

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
ہو گیا مہماں سرائے کثرت موہوم آہ — وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

غزل سر دیوان کے یہ چند اشعار قابل دید ہیں۔

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا — حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
اس مسندِ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے — کیا تاب گذر ہوئے تعقل کے قدم کا
بستے ہیں ترے کوچے میں سب شیخ و برہمن — آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگرچہ جی میں تو ہے تیری غضب کا — اور دل میں بھروسا ہے تو ہے تیرے کرم کا

مانند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی

کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

حمد و معرفت و خدا شناسی خاص مضامین تھے۔ جن کو حضرت درد نے اپنے انداز خاص میں کثرت سے نظم کیا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی زندگی، فنا و بقا، جزا و سزا کے اہم مسائل بھی اکثر و بیشتر نظم ہوئے ہیں اور اس خوبی کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض نہایت دقیق باتیں صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کر گئے ہیں مثلاً ؎

تہمت چند اپنے ذمہ دھر چلے — کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

معانی و مطالب کی جو وسعت ان شعروں میں پوشیدہ ہے اس کی تشریح کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا۔ اس دقت نظر کے باوجود دیکھئے کتنی خوبی کی بات ہے کہ طرز بیان نہایت دل کش، الفاظ منتخب، ترکیبیں درست و دل نشین، اور بندشیں چست و دل پسند ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے۔ ؎

باہر نہ آسکی تو قید خودی سے اپنی — اے عقل بے حقیقت دیکھا شعور تیرا

جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی طرف یاں — جی میں سما رہا ہے از بس غرور تیرا

---

گلیم بخت سیہ سایہ دار رکھتے ہیں — یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں

بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ — سب اہل قبر اسی کا خمار رکھتے ہیں

ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر — مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

---

اکسیر پر ہوس اتنا نہ ناز کرنا — بہتر ہے کیمیا سے دل کا گداز کرنا

---

پرورش غم کی ترے یاں تئیں تو کی دیکھا — کوئی بھی داغ تھا سینے پہ کہ ناسور نہ تھا

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدمؑ کے　　وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

حضرت دردؔ کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت درد و تاثیر ہے۔ کسی شاعر کے لئے یہ دونوں چیزیں اس وجہ سے موجب فخر و مباہات ہوسکتی ہیں کہ ان کا حاصل کرنا اکتساب و سعی سے ممکن نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ عطیہ خداوندی ہیں جو خوش نصیب لوگوں کے حصہ میں آتا ہے۔ ان شعروں کو آپ پڑھیں۔ اور سوز و گداز اور حسرت و درد کی صحیح اور سچی کیفیات سے لذت اندوز ہوں۔ ؎

مژگانِ تر ہوں یا رگِ تاکِ بریدہ ہوں　　جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

ہر شام مثل شام ہوں میں تیرہ روزگار　　ہر صبح مثل صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط　　پر آہ میں تو موجِ نسیم وزیدہ ہوں

اے دردؔ جا چکا ہے مرا کام ضبط سے

میں غم زدہ تو قطرۂ اشک چکیدہ ہوں

---

ہم کس ہوس کی تجھ سے فلک جستجو کریں　　دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار　　کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

---

صیاد اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو　　ہے کس کو زندگی کی توقع بہار تک

---

مدت تلک جہان میں ہنستے پھرا کئے　　جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھ کر کہیں

---

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

آرزو کریں اور جستجو کریں۔ اس غزل میں یہ شعر بیت الغزل ہونے کا حق رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی　　دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اسی طرح مندرجہ ذیل اشعار اپنی اپنی جگہ پر کسی نہ کسی خاص خوبی کے سبب سے دیکھنے کے لائق ہیں۔

جان پہ کھیلا ہوں میں میرا جگر دیکھنا　　جی نہ رہے یا رہے مجھ کو ادھر دیکھنا

ذکر وفا کیجئے اس سے جو واقف نہ ہو کہتے یہ کس سے ہو تم ٹک تو ادھر دیکھنا
اے آنسو نہ آوے کچھ دل کی بات منہ پر لڑکے ہو تم کہیں مت افشائے راز کرنا

---

چھاتی پہ گر پہاڑ بھی ہووے تو ٹل سکے مشکل ہے جی میں بیٹھے سوچ سے نکل سکے

---

فرسودگی ہے رشتۂ تسبیح کا حصول دل میں کسو کے آہ کوئی راہ کیا کرے

کلام دردؔ کے مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ادبی حیثیت سے اس کا پایہ کس قدر بلند ہے۔ خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی، تخیل کی نزاکت و نفاست، زبان کی لطافت معنی آفرینی غرض ہر پہلو سے وہ مکمل ہے اور کوئی کمی یا کوئی ...... نقص اس میں غائر نظر سے دیکھنے پر بھی نہیں معلوم ہوتا۔ پھر مضامین کی نوعیت پر غور کیجئے۔ تصوف، اخلاق، موعظت و پند کے ساتھ ہی ساتھ عشقیہ باتیں اس سنجیدگی اور تہذیب کے ساتھ نظم ہوئی ہیں کہ مخالف سے مخالف کو بھی خوردہ گیری کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ عاشقانہ رمز و کنائے کچھ اوپر کے اشعار میں موجود ہیں۔ اور چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

---

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
کیا مجھ کو داغوں نے سرو چراغاں کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

---

اس نے قصداً بھی میرے نالے کو نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا
یک بہ یک نام لے اٹھا میرا جی میں اس کے کیا آگیا ہوگا

---

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

دیکھنے کو رہے ترستے ہم　　　　نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا

---

بتوں کے جور اٹھائے ہزار ہا ہم نے　　　　جو اس پہ بھی نہ ملیں اختیار رکھتے ہیں

مختصر یہ ہے کہ حضرت درد علیہ الرحمۃ کی شاعری اردو زبان کے لئے سرمایہ افتخار و اعزاز ہے اور جس طرح اردو شاعری کے محسنوں کی فہرست میں میر و سودا کا نام ہمیشہ جلی قلم سے لکھا جائے گا وہاں درد بھی اس فہرست میں ان کے پہلو بہ پہلو جگہ پانے کا جائز حق رکھیں گے۔ یہ بھی حسن اتفاق کی بات ہے کہ ان تینوں بزرگوں نے ایک ہی زمانہ پایا ایک ہی استاد (سراج الدین علی خاں آرزو) کے آگے زانوئے تلمذ طے کیا اور ایک ہی طریقے پر اپنے دل و دماغ کو اردو شاعری کی خدمت کے لئے وقف کر کے اس میں اصلاح و ترقی کی شاہراہیں نکالیں۔ میر صاحب نے حضرت خواجہ درد کو آدھا شاعر تسلیم کیا ہے۔ لیکن انصاف پسند طبائع حضرت درد کے کارناموں کو خود میر کے کارناموں سے کسی طرح کم نہیں پاتے۔ اس لئے جہاں تک اردو زبان اور اردو شاعری کی خدمت کا تعلق ہے میر، سودا، اور درد یکساں طور پر اپنی مساعی جمیلہ کے لئے شکر گذاری کے مستحق ہیں۔

حضرت درد علیہ الرحمۃ کا وصال بمقام دہلی ۹۰ برس کی عمر میں ۲۴ صفر المظفر ۱۱۹۹ھ یوم جمعۃ المبارک کو ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کے معاصر شعراء میں میر و سودا کے علاوہ حضرت مظہر جان جاناںؒ بھی تھے۔ شاگردوں میں کئی مشہور ہوئے۔ جن میں سے قائم چاندپوری کا نام خصوصیت سے لینا چاہیئے۔ جنہوں نے آپ کے علاوہ سودا سے بھی استفادہ کیا ہے۔

صوفی

---

عمل جب اپنے نہیں ہیں اچھے تو ذکر عصیان غیر کیسا
مدد کی قسمت بگڑ بھی جائے تو اپنی قسمت رہی رہیگی

اکبر الٰہ آبادیؒ

# آئینہ حیرت

غم تو یہ ہے کہ کچھ گھٹا بھی نہیں
درد، حد سے، اگر بڑھا بھی نہیں

دوسرا، قدرداں نہیں، نہ سہی
اس قدر دشمن وفا بھی نہیں

غیر تو غیر، سوز الفت سے
آشنا، آج آشنا بھی نہیں

عیش سامانیوں پہ ناز تو ہے
اور شرمندگی ذرا بھی نہیں

زندگی کس طرح بسر ہو گی
درد دل کی کوئی دوا بھی نہیں

جرم، مانا کہ سخت ہے، لیکن
اس قدر قابل سزا بھی نہیں

گردنیں جن کے سامنے خم تھیں
اب انہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں

بات اس دل کی پوچھنے والا
آپ کے بعد دوسرا بھی نہیں

جان سے جا رہا ہے پروانہ
شمع کے لب پہ مرحبا بھی نہیں

اور پھر کون پارسا ہو گا
پاک دامن اگر صبا بھی نہیں

اُن کا منشا نہیں تو اب لب پر
شکوۂ بخت نارسا بھی نہیں

چھوڑیئے اِن فضول باتوں کو
ایسی باتوں میں کچھ مزا بھی نہیں

یہ گنہگار و دل حزیں حیرت
میرؔ و مومنؔ کی خاک پا بھی نہیں

حیرت شملوی

# ہماری افسانہ نگاری

## افسانہ کسے کہتے ہیں

دنیا کی ساری رونق جذبات کی بدولت ہے۔ یہ جذبات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ داخلی اور خارجی۔ داخلی اُن جذبات کو کہتے ہیں جو ہمارے دل و دماغ پر یکساں اثر کریں۔ اور قوت ناطقہ کے ذریعے دوسروں پر وہی اثر ہو جو کہنے والے کے دل پر ہوا ہے۔ خارجی جذبات وہ ہیں جو وقتی طور پہ انسان کو مسرور کرتے ہیں۔ اور ان کا اثر سطحی ہوتا ہے۔ داخلی جذبات کا سب سے تحسن اور موثر پیرایہ شاعری ہے۔ لیکن نثر بھی اس سے کم نہیں۔ نثر میں سب سے زیادہ موثر پیرایہ افسانہ گوئی ہے۔ حکمت اور فلسفہ کی خشک گتھیاں انسان پہ گراں گزرتی ہیں لیکن ان ہی حکمت آمیز باتوں کو قصہ یا کہانی کا لباس پہنا کر ادا کیا جائے تو انھیں زیادہ لطف لے کر پڑھا جاتا ہے۔ بلکہ اس قسم کی کہانیوں سے ہمارا دل سیراب نہیں ہوتا۔

افسانہ کا سنگ بنیاد اسی قسم کے قصے یا کہانی پر ہے۔ ایک غیر ملکی ادیب نے افسانہ کی تعریف یوں کی ہے۔ کہ افسانہ ایک نثری داستان ہے جس کے پڑھنے میں آدھے گھنٹے سے دو گھنٹے تک کا وقت لگے۔

ہر قوم کے اندر کچھ رسومات اور روایات مخصوص ہوا کرتی ہیں، اور یہ روایات اس کی تاریخ کی ابتدائی منزل ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہاں کی تہذیب میں بھی داستان گوئی بہت قدیم ہے۔ رامائن اور مہابھارت اس عہد کی داستانیں۔ بہادری کے قصے اور سماج کے حالات پیش کرتی ہیں جبکہ آفتاب تہذیب افق عالم پر نمودار نہ ہوا تھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ افسانہ کی ابتدا ابتدائے عالم سے ہے۔ جوں جوں کوئی قوم ترقی کرتی جاتی ہے یہ قصے اور کہانیاں زیادہ شائستہ ہوتی جاتی ہیں۔

## افسانہ اور ناول

ناول کا اساس بھی داستان گوئی پر قائم ہے۔ گو بادی النظر میں دونوں ایک ہی معلوم ہوتے ہیں تاہم دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ دونوں کی ابتدا جدا ہے۔ مانا کہ ذرا طویل افسانہ کا نام ناول ہے لیکن فنی اعتبار سے دونوں میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ افسانہ نے ناول سے آرٹ لیا جو وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ دونوں کا فن۔ دونوں کی اچھائیاں برائیاں بالکل الگ ہیں۔ افسانہ نگار کے لئے میدان بہت تنگ ہوتا ہے۔ اس کو مشاہدہ کے زیادہ عمق تک جانا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد بہت وسیع ہوتا ہے۔ اس کو دریا کوزہ میں بند کرنا پڑتا ہے۔

پھر بھی دونوں کے لئے پلاٹ ضروری ہے۔ لیکن افسانہ کے پلاٹ کو مختصر ہونا چاہیئے۔ ناول نگار اپنے پلاٹ کو اپنے مطلب کے مطابق بڑھا سکتا ہے۔ لیکن افسانہ نگار کے لئے یہ منزل بہت دشوار گزار ہے۔

کردار نگاری کا جہاں تک تعلق ہے۔ ناول نگار اپنے دل کی بھڑاس خوب نکال سکتا ہے۔ قسم قسم کے کردار پیدا کر سکتا ہے لیکن افسانہ نگار کے لئے اس کا میدان بہت تنگ ہے۔ اسکو نفسیات کا ماہر ہونا ضروری ہے۔

افسانہ میں اختصار کی وجہ سے جذبات نگاری کا بھی موقع کم ملتا ہے۔ ناول میں ہر جذبہ کو بہ آسانی جگہ ملتی ہے۔ افسانہ نگار کو زیادہ تجربہ کار ہونا چاہیئے۔ اس کے مشاہدات میں وسعت لازمی ہے۔

ناول نگار اپنے مقصد کے اظہار میں آزاد ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے افسانہ نگار کے قدم قدم پر رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ اس کے پیروں میں طرح طرح کی بندشوں کی بیڑیاں ہوتی ہیں۔ دراصل وہ اظہار مدعا میں مقید انسان کی طرح ہوتا ہے۔ افسانہ میں ہر لمحہ پلاٹ پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی تحریک یا نکتہ بے ربط ہوگیا ہو تو افسانوی پہلو میں خامیاں ہونے لگتی ہیں۔ ناول میں پلاٹ پس پشت ڈال کر منظر نگاری، واقعہ نگاری وغیرہ کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔

اثر کے لحاظ سے بھی صنف افسانہ بہت ہی ترقی یافتہ صنف نثر ہے۔

## ضروریات افسانہ

ہر افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تین چیزیں لازمی ہیں۔ اوّل پلاٹ۔ دوم کردار اور سوم اثر۔

افسانہ کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز پلاٹ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک پلاٹ نہ ہو اس وقت تک افسانہ ہو ہی نہیں سکتا۔ انسانی زندگی خود ایک افسانہ ہے۔ اس کا ہر ورق ایک نئی روشنی۔ ہر باب نئی دلچسپی اور ہر فصل عجیب کشمکش کی متحمل ہے۔ انسان کی زندگی کا ہر واقعہ پلاٹ ہے۔ ایک عمدہ افسانہ ایک عمدہ پلاٹ رکھتا ہے اور عمدہ پلاٹ وہی ہو سکتا ہے جس میں سچے جذبات کی عکاسی کی گئی ہو۔ جو افسانہ نگار کے ذاتی ہوں۔ اسکے اپنے مشاہدات اور تجربات زندگی سے متعلق ہوں۔ اس کی اپنی تلخ کامیوں اور زندگی کے نشیب و فراز کا نقشہ ہوں۔ پلاٹ کی خوبی پر افسانہ کا دار و مدار ہے۔ بعض لوگ پلاٹ کے مقابلہ میں حقیقت پر زیادہ زور دیتے ہیں" لیکن بقول ایک صاحب "افسانہ نگاری حقیقی واقعات کی ایک ترتیب شدہ فنی شکل کا نام ہے افسانہ ایک مستقل فن ہے۔ جو آسانی کے ساتھ ہر شخص حاصل نہیں کر سکتا۔ پلاٹ حاصل کرنا بھی جوئے شیر از کوہ برآوردن کا مصداق ہے پلاٹ پر افسانہ کی ترتیب کا دارمدار ہے۔ اتحاد زبان۔ اتحاد مکان اور اتحاد اثر بغیر پلاٹ کے ناممکن ہے۔ اثر پلاٹ پر ہی منحصر ہے۔ پلاٹ کی تدریجی ترقی اور اس کو منتہا تک پہنچانے اور منتہا کے نبھانے میں افسانہ نگار کی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ افسانہ میں سب سے زیادہ اہم اس کا منتہا ہوتا ہے۔ ہر ایک کی نظریں افسانہ نگار کے دماغ کے اس پہلو پر لگی رہتی ہیں جس کو وہ اپنی دانی سے اب تک چھپائے تھا۔ اس میں افسانہ کا نچوڑ ہوتا ہے۔ افسانہ کے پلاٹ میں مقامی رنگ ہونا ضروری ہے۔ اس میں ملکی خصوصیات کا اظہار بھی ضروری ہے۔ اس لحاظ سے پریم چند، کرشن چندر اور سلطان حیدر جوش اچھے افسانہ نگار ہیں۔ زندگی کے تنوع پہلوؤں پر روشنی ڈالنے میں مجنوں گورکھپوری سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ فنّی

اعتبار سے افسانہ کا خاتمہ بھی پُراثر ہونا چاہیئے۔ اس کا خاتمہ بیانیہ ہونا چاہیئے۔

**کردار** پلاٹ اور ترتیب کے ساتھ کردار بھی بہت اہم جزو افسانہ ہے۔ کردار کے پیدا کرنے کے لئے بھی ہم کو تجربہ اور مشاہدہ کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ کردار کا قیام بغیر کسی حقیقت کے ناممکن ہے۔ بلکہ کردار کو افسانہ کی تحریک کہا جائے تو صحیح ہے۔ کردار کو افسانہ میں اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ وہ فطرت انسانی کی کوئی نہ کوئی تصویر ہے۔

کردار کا انتخاب بہت مشکل ہے۔ ناول میں اگر کردار نگاری کے ذریعہ اپنے دل کے ہر پہلو کو اُجاگر کیا جا سکتا ہے تو افسانے میں کردار کی مقبولیت اس کے اعلیٰ پہناؤ پر ہے۔ افسانہ میں ایسے کردار کی کوشش کرنی چاہیئے، جس کے نقش پڑھنے والے کے دل پر مرتسم ہو جائیں۔ ایک انگریزی افسانہ نگار ایک موقع پر رقمطراز ہے "افسانہ کسی ایک کردار کی زندگی کے سب سے اہم موقع کو ڈرامائی صورت میں مختصر طور پر پیش کرنے کا نام ہے"۔ اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کردار اور افسانہ لازم و ملزوم ہیں۔ کردار تخیلی ہونا چاہیئے جس کے حسن سیرت و صورت کی سب تعریف کریں۔ وقار عظیم لکھتے ہیں: "کسی کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت کے اس کو مختلف حالتوں میں بیان کرنا افسانہ نگاری کا زیادہ ہنر اور دلیلہ کا طریقہ ہے۔" کردار کی حالتیں واقعات کی ترقی کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ کردار کی بھی تدریجی ترقی کا مقصد اثر اور نتیجہ تیار کرنا ہے۔ کردار کی ارتقا کے لئے ضروری واقعات تو ضروری ہیں لیکن افسانہ نگار کا فرض ہے کہ غیر ضروری باتوں کو بھی اہم ظاہر کرنے کی کوشش کرے۔ مثلاً پریم چند اور سدرشن کے افسانوں میں کردار کے ساتھ اس امر کا خیال رکھا گیا ہے۔ سدرشن کے یہاں عمدہ کرداری مثالیں "اپنی طرف دیکھ کر آو" "زمانہ داری کا سبق" وغیرہ میں ملتی ہیں۔ کردار میں سب سے اہم چیز اضطراب کو بہت دخل ہے۔ احمد شجاع نے اس حالت کے علاوہ کردار میں ہر انقلاب کا سبب یا وجہ ظاہر کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ گویا دوسرے افسانہ نگاروں سے ذرا ہٹ کر کردار نگاری میں جدت کی ہے۔

## اثر

کردار نگاری اور پلاٹ کی کامیابی اثر ہی ہے۔ اگر افسانہ کا اثر افسانہ نگار کے حسب خواہش ہو تو افسانہ بے معنی پہیلی سے زیادہ نہیں۔ اثر کا تعلق حقیقت سے ہے۔ جس کے متعلق ادیبوں کا خیال ہے۔ کہ اثر اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ افسانہ حقیقت پر مبنی ہو لیکن فنی اعتبار سے افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد بہت سے ایسے مواقع ملتے ہیں جبکہ افسانہ کو حقیقت سے برطرف کر کے تخئیل کو بھی دخل دینا پڑتا ہے۔ اس میں شاعرانہ نظریہ کی چاشنی بھی ضروری ہے۔ افسانہ کا اثر اس کے پلاٹ پر منحصر ہے۔ اگر پلاٹ کو رومانی ترتیب دی گئی ہے تو جذباتی دنیا میں ہیجان ضروری ہے۔ افسانہ دراصل قوم کے خشک سوتوں کو تر اور مردہ خیالات کو زندہ جاوید بنا سکتا ہے۔ بشرطیکہ افسانہ میں نادل کو کافی دخل ہو۔

آرٹ اور فنون لطیفہ کے اثر میں کافی یکسانیت ہے۔ شاعری، مصوری، موسیقی اگر انسان کے دل سے غبار کو دور کر سکتی ہیں تو افسانہ بھی اس کو جلا کر سکتا ہے۔ قوم کے اندر مردہ جذبات، ترقی کے خیالات، آزادی کے محرکات پیدا کر سکتا ہے۔ اثر کے اعتبار سے مجنوں، سدرشن، حیا اکبرآبادی، پریم چند، علی عباس حسینی، کرشن چندر، سجاد حیدر، سلطان حیدر جوش، ابوظفر صہبا، عارفہ بیگم، انجم صدیقی، غرض کس کس کو کم کہا جائے۔

## افسانے کی ترقی کے اسباب

(۱) اس کے اندر جذبات کی سچی عکاسی ہوتی ہے۔

(۲) ڈرامہ، ناول، دیگر فنون لطیفہ کا لطف بیک وقت حاصل ہو جاتا ہے۔

(۳) تھکے ہوئے دماغ کے لئے بہترین آلۂ تفریح ہے۔ اس میں ہر تفریح کا سامان مہیا ہوتا ہے۔

(۴) ہر طبیعت کا ذوق افسانہ میں مل سکتا ہے۔

(۵) رومانی تخئیل، حقیقی، نفسیاتی اور تاریخی مواد ہوتا ہے۔

(۶) جاسوسی، مادی، اور روحانی کیفیتوں کی عکاسی ہوتی ہے۔

## تاریخی ریویو

افسانہ فنون لطیفہ کی مانند ہر عہد و زمانہ میں مقبول رہا۔ ہر شخص کو زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے ضرور غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے۔ افسانہ اس قسم کی دلچسپی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس کی ابتدا ابتدائے آفرینش حیات عالم سے مربوط ہے۔ بلکہ تاریخی صفحات پکار پکار کر کہتے ہیں کہ تاریخ کی ابتدائی منزل میں اس قسم کے افسانہ نہیں قصے تھے۔ جنھوں نے ہمارے اندر عقیدہ بن کر جڑ مضبوط کرلی ہے۔ ان ہی دہمی اور خیالی قصص پر افسانے کی پوری عمارت قائم ہے۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ افسانہ بھی اپنا رنگ بدلتا رہا ـــــ لوگ پرانے قصے اور کہانیوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں ـــــ کیوں ۔۔۔۔۔؟ اس لئے کہ اس میں [illegible] کے علاوہ روحانی غذا بھی ہوتی ہے۔

[illegible] نظر آتی ہے۔ چنانچہ رامائن میں مہابھارت کی روحانی قوت اور [illegible] بھیم اور ارجن کی بہادری ہمارے دلوں میں اثر کرتی ہے۔ بہرحال ہمارے ملک میں فن داستان گوئی بہت قدیم ہے۔ مذہب نے افسانہ گوئی میں بہت مدد کی ہے۔ اردو میں قصہ گوئی کی ابتدا اس زبان کی پیدائش ہی سے وابستہ ہے۔ اردو میں بھی نظم نے پہلے فروغ حاصل کیا۔ چنانچہ پرانے قصے بھی نظم میں پیش کئے گئے۔ پہلے یہ قصے اخلاق پر زور دیتے تھے۔ دکن کی دولت نے رنگ دکھایا اور روحانی قصے بھی اردو میں نظر آنے لگے۔

وقار عظیم کہتے ہیں۔

"انیسویں صدی کے شروع میں بعض ناول نگاروں نے مختصر افسانہ کی بنیاد ڈالی لیکن ان مختصر افسانوں میں عموماً اخلاقی جذبہ بے حد نمایاں رہتا ہے۔"

## انیسویں صدی

سلطنت مغلیہ کی بنیادیں کھوکھلی ہوگئیں اور شاہی شان و شوکت پر نکبت اور بدبختی کی تیرہ و تار گھٹائیں چھانے لگیں۔ دہلی کے در و دیوار ماتمی لباس پہنکر اپنی لٹی ہوئی دولت پر مرثیہ خوانی کرنے لگے۔ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا مگر لکھنؤ ابھی شباب کے نشے میں اینٹھتا رہا حتیٰ کہ بنگال نے نئی حکومت کا خیر مقدم کیا۔ اور ہندوستانیوں کو

بادلِ ناخواستہ خوش آمدید کہنا پڑا اور نسبتاً توجہ کا رخ بدلا گیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نئی تعلیم پہلی نئی صبح نئی روشنی کے ساتھ نمودار ہوئی۔ کلکتے میں فورٹ ولیم تعمیر کیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ یورپ ہر ملک و قوم کے سامنے بہترین افسانہ پیش کر چکا تھا اور اس کی مقبولیت نے حکام کے دل موہ لئے تھے جب طفل اُردو کی پرورش کی ٹھانی تو طویل افسانوں ہی سے شروع کیا۔ چنانچہ اُردو کی سب سے پہلی کتاب "باغ و بہار" سب سے بڑا اور ممتاز افسانہ ہے۔ کہا جاتا ہے کسی زمانے کا ادب اپنے ماحول سے بیگانہ نہیں رہ سکتا اور اس زمانے کی زندگی کی تصویر ہوتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف اضطراب اور بے چینی کی حالت تھی۔ —— ذہنی حکومت کی جڑیں اتنی مضبوط ہو گئی تھیں اور اقتصادی بدنظمی نے اس درجہ حالات کو تبدیل کر دیا تھا کہ تھوڑے سے سکوں میں راست بازی، پاک دامنی اور خودداری خریدی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس زمانہ کی جملہ داستانیں اسی رنگ کی آئینہ دار ہیں۔ غدر کے بعد نئی حکومت قائم ہوئی۔ پرانی تہذیب نے ورق پلٹا تو ادب کیسے پیچھے رہ جاتا؟ اس نے بھی قدم بڑھائے اور اصلاحات کی تحریک شروع ہوئی۔ کس مپرسی کے عالم میں افسانوی دنیا کے لئے بہت سے مضامین موجود تھے۔ مثلاً غلامی کی ذہنیت کا پردہ اٹھانا۔ لٹی ہوئی شان کی مرثیہ خوانی کرنا۔ انسانیت کی بے چارگی کا احساس کرانا۔ اخلاق کی پستی کا دھیان میں لانا، سوسائٹی کی برائیاں وغیرہ۔ چنانچہ حالیؔ نے مسدس کے ذریعہ، سرسید نے اپنے مضامین اور خطبات کے ذریعے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے گھریلو قصوں کے ذریعے ہندوستان کی اصلاح کی کوشش کی۔ یہیں سے اُردو ناول نگاری کی بنیادیں بھی مضبوط ہوتی ہیں۔ حالی نے مرض تشخیص تو کر لیا، مگر اس کی دوا نہ بتا سکے۔ سرسید نے نئی روشنی کا علم اٹھایا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے خاندانی اور سوسائٹی کے نقائص پر نکتہ چینی کی۔ راشد الخیری کے دردناک افسانے اور حسن نظامی کی قلعہ معلی کی داستانیں اب بھی بے اختیار رقت طاری کرتی ہیں۔

غدر کے بعد انیسویں صدی میں عام طور سے طویل افسانے لکھے گئے۔ افسانہ انسانی فطرت سے بالاتر، مختصر افسانوں کی بنیاد کب اور کیسے پڑی اس کا پتہ نہیں ۔۔۔۔۔ زیادہ چھان بین کرنے سے پتہ چلا ہے۔ کہ اس کا سہرا آزاد کے سر ہے۔ آزاد کی نیرنگ خیال جب منظر عام پر آئی تو تمثیل نگاری کا رنگ بھی نکھرا۔ آزاد کے اس رنگ کی پیروی ناصر علی نے بھی کی، مگر انہیں کامیابی نہ حاصل ہوئی۔ ان کے بعد اردو میں افسانہ نگاری نے باقاعدہ ایک فن کی حیثیت حاصل کر لی۔

## بیسویں صدی

اس صدی میں جدید تعلیم نے اپنا سکہ جمایا۔ لوگوں میں احساس خودداری پیدا ہو گیا۔ اور انقلاب کی رفتار بھی بہت سرعت کے ساتھ بڑھ گئی۔ ادب کی ہر صنف نے ترقی کی۔ چنانچہ اُردو افسانہ نگاری بھی اس رنگ سے بے بہرہ نہ رہی۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ ہندوستان میں اخبار اور رسائل عام ہو چکے تھے۔

رسالوں میں ہر قسم کا لٹریچر جگہ پاتا تھا۔ ان رسالوں کی ترقی سے افسانوں کی ضرورت میں اضافہ ہو گیا۔ ملک کے سامنے غیر ملکی حالات کو رکھ کر ان کو پرانی عظمت کی داستانیں سنائی جانے لگیں۔ چنانچہ اس دوران میں ترجمہ نے فروغ حاصل کیا۔ اس صنف میں سجاد حیدر کے ترکی افسانوں کے ترجمے اور نیاز فتحپوری کے مختلف ترجمے پیش پیش ہیں۔ مختصر افسانوں میں مغربی تہذیب کی برائیاں سلطان حیدر جوش نے پیش کیں۔

## پہلی جنگ عظیم اور اس کا اثر

جنگ ہر ادب اور ہر قوم کی زندگی پر نمایاں اثر کرتی ہے چنانچہ پہلی جنگ عظیم نے اردو افسانہ نگاری کے اندر گویا دم عیسیٰ پھونک دیا۔ اس کی رفتار میں برق کی سی سرعت پیدا کر دی۔ اس جنگ کے بعد اردو افسانہ نگاری نے جتنی خوش اسلوبی سے زندگی کی قدروں کو تسلیم کر کے اس کے ملانے کی کوشش کی، دنیا کا کوئی ادب پیش نہیں کر سکتا۔ ہمارے ادیبوں کے دماغ میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ افسانے سماجی زندگی کی پیچیدگی کے احساس کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتے اور یہ کہ ہمارے افسانوں کو اجتماعی اور معاشرتی محرکات کا آئینہ ہونا چاہئے۔ گزشتہ بیس سال

میں افسانے نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ کوئی رسالہ کوئی جریدہ یا مجلہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں اعلیٰ افسانوں کی چاشنی موجود نہ ہو۔ رسائل کی زیادتی کے ساتھ افسانہ نویسوں کی تعداد میں بھی زیادتی ہوتی گئی، چنانچہ اس مختصر مضمون میں سب کا تذکرہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ان تمام افسانوں کی اہم خصوصیات زندگی فطری، سیاسی، سماجی، تاریخی، قومی، اقتصادی اور معاشرتی خصوصیات اور انقلابات ہیں۔ پریم چند، سدرشن، علی عباس حسینی، فضل حق قریشی، احمد ندیم قاسمی کے افسانے قابل قدر ہیں۔

ابتدا میں ہر چیز میں کوئی نہ کوئی نمایاں کمی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اردو افسانہ نگاری میں بہت سی خرابیاں تھیں۔ مثلاً نفسیات اور منظر کی نمایاں کمی ہے۔ کردار نگاری بھی بہت پیچھے تھی اب یہ صنف تیزی سے ترقی پذیر ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے بہت سے نقائص دور کر دیے ہیں بلکہ اس میں روز بہ روز دلکشی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

**مقامی رنگ** موجودہ افسانوں میں سب سے نمایاں خوبی مقامی رنگ ہے۔ اس خوبی میں پریم چند کے افسانے بہت پیش پیش نظر آتے ہیں۔ انھوں نے پہلی مرتبہ ملک کے نئے تاریک یا دھندلے معاشرتی رنگ کو قوم کے سامنے پیش کیا۔ سدرشن نے بھی اس کی پیروی کی۔ یہاں کے لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقے، ان کے عادات و اطوار کا چربہ اتارا۔ ڈاکٹر اعظم کریوی اس صنف میں نمایاں ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہندو مسلم اتحاد کی بو پائی جاتی ہے۔ جو موجودہ ملکی فضا میں بہت مفید اور کارآمد ہے۔

ہندوستان کی قدیم تاریخ یہاں کے لوگوں میں بیداری کی روح پھونکنے کے لئے بہت کافی ہے۔ راجپوتوں کی بہادری کی داستان یہاں کے موجودہ بزدل نوجوانوں کے دل میں نیا خون دوڑا سکتی ہیں۔ پریم چند کے علاوہ حسینی صاحب نے بھی اس مواد سے فائدہ اٹھایا ہے۔

دنیا کی زندگی کا نقشہ مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری اور سدرشن نے بہت خوش اسلوبی سے

کھینچا ہے۔ لیکن نیاز صاحب کا جادو نگار قلم دنیا در ملاؤں کی گہرائیوں کو ٹٹولتا ہے مجنوں کے افسانے میں اس کا محرک قنوطیت خیز جذبہ ہوتا ہے جس کو وہ غیرت کہتے ہیں۔ بقول رشید احمد صدیقی یوں سمجھئے کہ مجنوں نے اپنی شخصیت کی تہذیب و تکمیل زندوں سے نہیں، بلکہ مردوں سے کی ہے۔ ان کے یہاں قنوطیت کی تند گھٹائیں چھائی رہتی ہیں۔ افسر میرٹھی اور ایم اسلم بھی اس رنگ میں فرد ہیں۔

بیسویں صدی میں افسانوں کا سب سے بڑا مقصد اصلاح قوم تھا۔ چنانچہ ہمارے ادب میں سلطان حیدر جوش نے مغرب کی دھجیاں اڑائیں۔ راشد الخیری نے نسوانی دنیا میں اصلاح کی کوشش کی۔ پریم چند نے ہماری مردہ ذہنیتوں کی اصلاح، راجپوتوں کے قصے سنا کر کی۔ سدرشن نے ہندوستان کے گھر گھر کا چکر لگایا اور ان کی گھریلو زندگی میں کرید کرید کر برائیاں نکالیں۔ افسر نے ایک واعظ کا درجہ حاصل کیا، جو پکار پکار کر کہتا ہے کہ اے ہندوستان کے باشندو! تم میں پستیٔ احساس اب اس حد تک پہنچ گیا ہے، تم چونکو اور اپنے مرض کا علاج کرو۔ عظیم بیگ چغتائی انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ وہ ان برائیوں پر مزاحیہ اور طنزیہ طور پر حملہ کرتے تھے۔ سجاد حیدر، نیاز، اور مجنوں کے متعلق وقار عظیم لکھتے ہیں۔

"ان کے افسانوں میں اصلاح مقصد نہیں تو نہ ہو لیکن وہ ہمارے دلوں کو دنیا کے تمام لطیف اور کیف آور عناصر سے تو آشنا کرتے ہیں۔"

سادگی زبان کے لحاظ سے حسن نظامی کے افسانے دل و جگر میں نشتر کی طرح چبھتے ہیں۔ وہ سلطنت مغلیہ کی بربادی پر بلک بلک کر رو دیتے ہیں۔ ان کی آسان نگاری نے تخیل نگاری کے ساتھ ایک لاثانی حسن کی شکل اختیار کر لی ہے۔

رومانی دنیا میں اور ترجمہ کی حیثیت سے ایم اسلم کے افسانے بھی ادب میں ایک غیر معمولی جگہ حاصل کر چکے ہیں مگر ان کی زبان میں ستھراؤ نہیں۔ ان کا قلم رکا نہیں جا سکتا۔ بیک وقت وہ تین افسانے لکھ بیٹھتے ہیں۔ گویا ان کا دماغ بیسویں صدی کی بجلی کی مشین ہے۔ مکالمہ

لکھنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور اکثر گم ہو جاتے ہیں۔

## جدید افسانہ نگاری

گذشتہ چند برسوں میں ادب کی زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں ہو گئی ہیں، جس کا ایک پہلو نیا ادب یا ترقی پسند ادب کے نام سے زیادہ یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔ مگر افسانوی دنیا میں جو انقلاب اس ادب نے پیدا کیا ہے۔ اس کا تذکرہ مختصر طور پر کرتا ہوں۔

پریم چند بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ آخری زمانے کے افسانوں کو اسی نئے رنگ میں رنگ دیا۔ گویا اس رنگ نے ان کی سیاہ ڈاڑھی پر خضاب کا کام کیا۔ قاضی عبدالغفار نے "لیلیٰ کے خطوط" کے ذریعے افسانہ نگاری کو نئے راستے سے آشنا کیا اور رومانی دنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ دہلی کی رجعت پسند زندگی اور دلچسپ مشغلوں کا تذکرہ اس دور کے لکھنے والوں میں انگارے کے مصنف احمد علی صاحب نے خوب کھینچا ہے۔ ان کے کرداروں میں سے استاد "شمو" بہت نمایاں اور کبوتر بازی میں فرد ہیں۔ یہ اصل میں نئی تحریک کے ابتدائی افسانہ نویسوں میں سے ہیں۔ اسی لئے ترتیب یا ٹیکنک کی خامیاں قابل قبول ہیں۔ سجاد ظہیر صاحب نے بھی "لندن کی ایک رات" کے ذریعے ناول اور افسانہ کی دنیا میں ایک عجیب کیف آور صور پھونکا ہے۔ اس میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے سیاسی، معاشرتی تعلقات پر بحث کی ہے نعیم کا کردار اس کتاب کی بہترین پیشکش ہے۔

فن کے لحاظ سے افسانہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے اوپندر ناتھ اشک اور کرشن چندر کا نام چھوڑنا بڑی غلطی ہو گی۔ وہ افسانہ کی ابتدا، اٹھان اور اس کے خاتمے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اشک کے افسانوں میں بڑی داخلیت ہے۔ افسانہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہے ہیں۔ کرشن چندر کے متعلق عزیز احمد صاحب لکھتے ہیں۔

"تمام ترقی پسند ادیبوں میں کسی کا نام اس قدر توصیف اور عزت کا مستحق نہیں

جتنا کرشن چندر کا ہے۔ اس کی وجہ اُن کی بے لوث اور باخلوص انسانیت ہے، جو ان کی تحریر سے مترشح ہوتی ہے۔ اس پر اُن کے تخیلی فن کی بنیاد ہے"۔

کرشن چندر مظلوموں سے سچی ہمدردی اور مزدوروں سے دلی انس رکھتے ہیں۔ وہ مزدور مرد سے زیادہ عورت کے افسانہ نگار ہیں "شکست" میں ہندوستانی عورت کا سچا نقشہ کھینچا ہے۔ آپ کی انقلابی رومانیت نے عورت کو نیا رنگ بخشا ہے۔ منظرکشی کے اعتبار سے کرشن چندر کا کوئی مقابل نہیں۔ آرٹ اور ترتیب کے لحاظ سے ان کے افسانے سب نادر ہیں۔ کردار نگاری میں بڑی انفرادیت ہے۔

افسانے کے اثر کو لفاظی کم کردیتی ہے۔ انسان کی داخلی ضرورت اور فطرت کے خارجی اظہارات کی ہم آہنگی افسانہ کی جان ہے۔ جو کرشن چندر کے یہاں بدرجہ اتم ہے۔ انکے اسلوب میں ایک انقلابی رمزیت ہے۔ نئی تشبیہات سے ان کے افسانے مالا مال ہیں۔ طنز کے پیرائے میں اثر خوب پیدا کردیتے ہیں۔

راجندر ناتھ بیدی کے افسانے بے لوث رومانیت اور نتیجہ خیز تخیلی امتزاج ہیں۔ بیدی کے افسانوں کا مجموعہ "دانہ و دام" نئے ادب میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے افسانوں کا ماحول، دیہاتی ہے۔ اس کے مسائل۔ اس کی گندی معاشرت۔ اس کے مصائب اُن کے خاص پہلو ہیں۔ صاحب ترقی پسند ادب کا قول ہے کہ "بیدی کے افسانوں میں زندگی کی تلخی اور اس کی مصیبتوں کے ساتھ تھوڑا سا وہ لطف بھی ہے جو ان مصائب میں ہلکی سی روشنی پیدا کرتا ہے۔ یہ لطف محبت اور ہمدردی کا ہے"۔

طنز کا حربہ بھی اکثر استعمال کرتے ہیں۔

حسینی کا افسانہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے "ایک ماں کے دو بچے" افسانوی دنیا میں بہت کامیاب رہا۔

سعادت حسن منٹو نے بھی افسانوی دنیا میں کافی دلچسپی کا سامان مہیا کرلیا ہے۔ ان کا

انجام قطعی غیر متوقع ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات میں غضب کا تنوع ہوتا ہے۔ تمام خوبیوں کے باوجود ان کے یہاں انسانیت کا راسخ عقیدہ کہیں نہیں ملتا۔

ترقی پسند ادب کی محض سرپرستی اور خاتون پرستی مقصود ہو تو عصمت چغتائی کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان کا رجحان منٹو سے زیادہ رجعت پسند اور سرپیشانہ ہے۔ ان کے طرز تحریر میں نسائیت تو بہت ہے مگر تحریر کی باگ ڈور اکثر ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔

افسانہ نگاری کے مختصر تنقیدی اور تاریخی تبصرے کے بعد میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہندوستان یا اب پاکستان میں باوجود اس کثرت کے بھی اچھے افسانہ نگاروں کی کمی ہے۔ ہمارا ادب خواہ نیا ہو یا پرانا۔ اخلاقی اور سماجی، معاشرتی اور اصلاحی افسانوں کی نمایاں کمی رکھتا ہے۔ سردست ایسے افسانوں کی ضرورت ہے جو حسن و عشق کی داستانوں کو ایک طرف رکھ کر قومی ہمدردی اور باہمی مروت کی جڑیں مضبوط کریں۔ قومیت کے دبے ہوئے جذبے کو بیدار کریں۔ مردہ روحوں میں صور قومی پھونک کر نئی صبح و شام دکھا دیں۔

تقسیم ہند کے بعد تا دم تحریر افسانہ نگاروں کی طرز نگارش میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ البتہ پلیٹ فارموں میں ضرور مذہبیت کا ملا جلا جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے افسانہ نگار اپنے ماحول سے کیا اثر لیتے ہیں۔ اور افسانہ نگاری کے لئے کونسی نئی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تقسیم ہند کے ہنگامے کے بعد ہر دو ڈومینینوں کے افسانہ نگاروں کو اصولی طور سے اپنے لئے نئے جادہ کی تلاش کرنا ہوگی۔ اب افسانہ کو کیا اور کیسا ہونا چاہئے، یہ بحث وقت اور تفصیل چاہتی ہے۔ اس لئے بشرط فرصت فردوس کے کسی نہ کسی شمارہ میں اس عنوان پر بھی کچھ لکھوں گا۔

**اختر انصاری اکبر آبادی**

# اگست ۱۹۴۷ء سے قبل کی دِلّی

## دِلّی ۱۹۱۱ء تک

تاریخ دہلی کے گزشتہ سو سال میں ستمبر کا مہینہ واقعی ستمگر نکلا اور نہایت منحوس ثابت ہوا۔ غدر ۱۸۵۷ء کی بربادی ستمبر میں ہوئی اور اسی مہینے میں ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے سر اٹھایا۔ نتیجہ بھی دونوں کا ایک نکلا یعنی دلّی سے اُن دلّی والوں کی ہستی کا خاتمہ جن کے آبا و اجداد نے دلّی فتح کی اور دلّی شاہجہان آباد کو بسایا۔ دونوں دفعہ بے قصور دلّی والوں پر جو ناشدنی ظلم ٹوٹے ہیں اور ان کی مستورات کی جو بے آبروئی اور رسوائی ہوئی ہے، اس کے جگر خراش اور درد انگیز ذکر کو دہرانا زخم کو تازہ کرنا ہے بقول شخصے ؎

میں مر ہی جاؤں گا جو لگے گی ذرا بھی ٹھیس
اے چارہ گر خدا کے لئے زخم چھو نہیں

ہر ملک کی راجدھانی کی بربادی اور آبادی کا سوال ایک حکومت کی تباہی اور دوسری حکومت کے قیام کے ساتھ وابستہ ہے۔ اِدھر ایک بادشاہ کو تخت سے اُتارا اور اُدھر دوسرا بادشاہ اس کی جگہ تخت پر بیٹھ گیا۔ اور راجدھانی کی جو بربادی ہوئی تھی وہ مبدّل بہ شادابی ہو گئی۔ لیکن غدر ۱۸۵۷ء کے بعد دشمن نے دلّی کی تباہی کو پورا کرنے کے لئے اس شاہی گھرانے سے پایۂ تخت ہونے کا حق چھین لیا۔ کلکتہ کو دارالسلطنت ہونے کا فخر بخشا اور اس شہر کی راجدھانی کو پنجاب کے صوبے کا ایک معمولی حصہ جیسے "بدقسمت" کہتے تھے بنا دیا۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ دلّی کو اپنی بربادی کی کسر پوری کرنے کا کوئی موقعہ نہ رہا۔ پچاس برس تک دلّی اسی کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہی۔ لیکن پچاس برس کے سیاسی بن باس میں دلّی نے ایک سبق سیکھا اگر یہ سچ ہے کہ ؎

بدریا در منافع بے شمار است
وگر خواہی سلامت برکنار است

اور اس سبق سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

بیس برس تک وہی قعرِ گمنامی کی پستی میں آرام کرتی رہی لیکن اس کی تاریخی شہرت و عظمت پر ہمیشہ کے لئے پانی نہیں پھر سکتا تھا۔ جب انگریزوں کی ملکہ نے قیصرِ ہند کا لقب اختیار کیا تو اس کا اعلان کرنے کے لئے ۱۸۷۶ء میں جو دربار کیا جسے دربار قیصری کہا جاتا ہے وہ کلکتہ میں نہ کیا۔ لاہور میں نہ کیا۔ بلکہ آخرکار دلی ہی میں کیا۔ اور اس طرح دلی نے اپنی تاریخی اہمیت منوا کر چھوڑی۔ اس کے بعد بھی انگریزوں کے دلی میں کئی دربار ہوئے مگر اس شان و شوکت کا کوئی دربار نہ ہوا۔ ہندوستان بھر کے راجے مہاراجے اور نواب جمع تو ہر دربار میں ہوئے مگر اس وقت کے والیان ملک اپنی شان و مرتبے کا احترام کرنا جانتے تھے اور ابھی تک انگریزوں کی غلامی کا نامعلوم اثر ان میں جاگزیں نہ ہوا تھا۔ اس لئے وہ اپنے شاہی جلوس میں تمام وہ ساز و سامان اور افواج و امراء و دربار والے جو ان کے شایانِ شان تھے۔ اس دربار سے دلی کو پھر چار چاند لگ گئے۔ اس شہر کی مردہ زندگی میں کچھ جان پڑی۔ بنج بیوپار کا بڑی بڑی ریاستوں سے مستقل سلسلہ جاری ہوا اور دلی نے سیاسی راجدھانی کی جگہ تجارتی راجدھانی حاصل کرنے کا راستہ تلاش کر لیا جس کی منزل مقصود فارغ البالی تھی۔ مگر ایسی فارغ البالی جو اوسط درجے کی سہی مگر پُرامن پُرسکون ہو اور ہنگامی مدوجزر اور سیاسی شہر آشوبی سے مصئون و محفوظ۔ ان حالات کے باوجود دلی والوں کا دل اس دربار سے کچھ خوش نہ تھا۔ بیس برس کی قلیل مدت پرانی یاد کو مٹانے کے لئے کافی نہ تھی۔ ابھی ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے دلی کے مغل بادشاہ کے دربار دیکھے تھے۔ وہ بادشاہ جس کے اجداد صدہا برس سے اس شہر میں، اس لال قلعہ میں، ہر تہوار کے موقعے پر خواہ عید ہو یا ہولی عام دربار کر کے اہل شہر کو نذر و جواہر بانٹتے تھے۔ مغل بادشاہوں کے درباروں کی یاد دل سے کس طرح مٹ سکتی تھی۔ اور یہ لوگ کس طرح

اس قیصریہ دربار کو دیکھ کر جس میں ان کا کوئی حصّہ نہ تھا خوش ہو سکتے تھے۔ وہ دربار اپنے ہوتے تھے۔ اپنے بادشاہ اپنے وزیر اپنے لوگ۔ اور یہ دربار ——— ؟

دن گزرتے گئے۔ آسیائے دوراں پیستی رہی ماضی کی یادگاروں کو ماضی کی یاد کو ثابت قدمی کو۔ وفاشعاری کو۔ وقت کی ندی بہتی رہی۔ پرانے نقوش مٹاتی اور نئے راگ گاتی۔ تیس برس اور گزر گئے۔ نئے دور کے تیس برس سے نئے ماحول میں نئی نسل پیدا ہوئی۔ جو بجائے خانقاہ کی بجائے سرسید کے مدرسۃ العلوم میں تربیت پانے کے لئے۔ قال اللہ و قال الرسول کی جگہ قال شیکسپیر و قال بیکن دوا لینے کے لئے۔ مولانائے روم کی بجائے مولانائے پانی پتی کے آگے زانوئے ادب تہ کرنے اور "قرآن در زبان پہلوی" کو چھوڑ کر مسدس حالی کو ازبر کرنے کے لئے۔ ذہنیت میں فرق آ گیا۔ زمانہ بدل گیا۔ دلّی بدل گئی فارسی کی جگہ لوگ انگریزی لکھنے اور بولنے لگے۔ کافر گری پر سے کفر کا فتویٰ ہٹ گیا۔ اور دلّی میں اکا دکا مسلمان کوٹ پتلون میں نظر آنے لگا۔ میدان صاف تھا۔ بھوکے بنگالی اور سیواجی کے پجاری مرہٹے سیاسی شورش کا خالی ڈھول پیٹتے ہیں۔ دلّی میں ایک اور دربار ہونا چاہئے۔ ہندوستانیوں کی مجموعی وفاداری پر مہر لگ جانی چاہئے۔ ۱۹۰۳ء میں لارڈ کرزن نے لارڈ لٹن کے دربار سے بھی زیادہ بھڑکیلا اور دیدہ زیب دربار کیا۔ حسب معمول جلوس نکلا اور ہاتھیوں کا جلوس نکلا۔ آگے آگے لارڈ اور لیڈی کرزن کا ہاتھی تھا۔ مغرور سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان کے راجکمار مرصّع زرّیں بنے نائب شاہ کے جلو میں تھے سب سے پیچھے سب سے اول بادشاہ کے مددگار وفاشعار نظام الملک آصف جاہ بہادر زعفرانی ریشمی لباس میں ملبوس قدیم مغلئی ٹوپی پر طرّہ لگائے سادگی اور متانت کی تصویر بنے اپنے ہاتھی کے ہودے میں تشریف فرما تھے۔ ان کے پیچھے بڑے بڑے راجے مہاراجے زرق برق قومی لباس زیب تن کئے قیمتی اور نایاب جواہرات کے زیور سے آراستہ حسب مراتب اپنے اپنے ہاتھیوں پر سونے چاندی کے ہودوں میں سوار چلے آ رہے تھے باقی انگریزی افسران ذی مرتبت اور فوجی رسالے اور پیدل تھے۔ غرضکہ جلوس بڑی تزک و شان سے شہر بھر میں پھرا اور

آخر میں جامع مسجد کا طواف کر کے لال قلعے کی طرف سے نکل گیا۔ اس وقت اگر شاہجہاں کی روح جامع مسجد کے برج پر سے اس نظارے کو دیکھ رہی ہوگی تو ممکن ہے کہ اس کے منہ سے تو تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو نکل رہا ہو۔ رات کو لال قلعے میں شاہی دعوت ہوئی اور مرمریں دربار خاص میں انگریزی ناچ ہوا، جس میں حسن دجال کا مجسمہ لیڈی کرزن مورنی کی طرح اٹھلاتی ہوئی اپنے خاص اختراع کردہ مور کے پروں کا لباس زیب تن کر کے ناچ میں شریک ہوئیں اور ایک شاعر نے شعر کہہ دیا ؎

بال میں ناچیں لیڈی کرزن۔ چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن

دربار ختم ہوا۔ لارڈ کرزن کا مدعا پورا ہوا۔ لاکھوں پر پانی پھر گیا مگر شہر والے بھوکے کے بھوکے ہی رہے۔

دلی کے حالات میں درباروں کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ یہ رفتار زمانہ میں سنگ راہ کا کام دیتے ہیں۔ مثلاً غدر سے قیصری دربار تک دلی کی تاریخ کی ایک حد پوری ہوتی ہے قیصری دربار سے کرزن دربار تک یعنی ۱۸۷۷ء سے ۱۹۰۲ء تک دوسری اور کرزن دربار سے بادشاہ کے دربار تک یعنی ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۱ء تک تیسری۔ مطلب یہ کہ غدر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۱ء تک کا وہ زمانہ ہے جس میں دلی راجدھانی نہ رہی اور اس زمانے میں جو تغیرات اور تبدیلیاں دلی میں ہوئیں وہ بتدریج ہوئیں یعنی ایک دربار سے دوسرے دربار کے زمانے میں ایک خاص حد تک تغیر ہوا۔

غدر کے بعد دس برس تو دلی کی آبادی کو دوبارہ بسنے میں لگ گئے۔ نیز شہر کی ہیئت میں جو تبدیلیاں ہوئیں انکے مکمل ہونے میں اتنا ہی عرصہ لگا۔ دس برس بعد جو لوگ دبکے سہمے بیٹھے تو کم کم دس برس اور اٹھ کر جاگنے کے لئے لگے اور جب ہر طرح کا اطمینان قلبی ہو گیا تو لارڈ لٹن نے مناسب سمجھا کہ اس دربار سے اہل ملک کی مزید تشفی کر دی جائے کہ انگلستان کی رانی کوئی غیر نہیں ہے بلکہ وہ قیصرِ ہند بھی ہے۔

غدر میں گو شہر بہت لٹا اور تمام دولت مند و شریف آبادی شہر چھوڑ کر بھاگ گئی۔ لیکن امن ہونے کے بعد شہر پھر انھیں دلی والوں سے آباد ہوا جو اس ہنگامہ میں بچ گئے تھے۔ گورے اور دوسرے فوجی جنھوں نے شہر لوٹا اور مظالم ڈھائے اُن کی پلٹنیں اٹھالی گئیں اور وہ چلے گئے۔ شہر میں جو باہر والے اس کے بعد آتے رہے وہ سرکاری حکام تھے جن کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لئے دلی کی پرانی تہذیب میں بہت کم ردوبدل ہوا۔ اور جو تغیر بھی ہوا بتدریج اور آہستہ آہستہ ہوا۔

قیصری دربار تک دلی کا تمدن اور معاشرت تقریباً وہی تھی جو غدر سے پہلے تھی۔ فرق اتنا تھا کہ پہلے دولت وحشمت تھی اب عسرت وکس مپرسی۔ مگر اب بھی شرفا اجڑے ہوئے بھی پر نواب صاحب کہلاتے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو محلسرا اور دیوانخانہ کہتے تھے۔ ہاتھی نہ رہے تھے مگر اب بھی حویلی نے پھاٹک بلند ہوتے تھے جس میں سے ہاتھی معہ عماری کے گزر سکے۔ اب بھی دروازوں پر ماہی مراتب کے نشان کے گگر مچھ بنے ہوئے تھے۔ اب بھی بعض حویلیوں کی محراب پر دعائیہ اشعار خوشخط لکھے جاتے تھے۔ جیسے ؎

الٰہی بخت تو بیدار بادا ترا دولت ہمیشہ یار بادا

اس عسرت کی حالت میں بھی شادی بیاہ اور دیگر چھوٹی چھوٹی رسوم اور تہواروں کے موقع پر کروفر وشان وشوکت اور رواداری میں کمی نہ کی جاتی تھی۔ لاکھ کا گھر خاک ہو جائے مگر آن میں فرق نہ آئے۔ باپ دادا کا نام قائم رہے۔ اچھے سمے تھے۔ اچھے پہرے تھے۔ اشیا خورد ونوش ارزاں تھیں تھوڑی سی آمدنی میں بھی کھانے پینے کا بسہولت انتظام ہو جاتا تھا۔ امراء عظام کے سوا، باقی شرفا کا معیار زندگی معمولی تھا اور ضروریات مخصوص اور محدود۔ ولایت سے مال کلکتے میں ضرور آتا تھا مگر دلی والے اپنی ملکی صنعت وحرفت ہی سے کام نکالتے تھے۔ امرا کے دیوانخانے تھے۔ غربا اور متوسط درجے کے لوگ بھی بیاہ شادی پر ناگ بلتے تھے لیکن شرفا کا عام طور پر ڈیوڑھی ہی میں تخت بچھا رہتا تھا۔ اسی پر مردانہ نشست ہوتی تھی۔ ڈیوڑھی نہ ہوئی

تو گلی میں چارپائی ڈال لی یا مونڈھے بچھا لئے۔ ہر شخص اپنی حیثیت اور درجہ جانتا تھا۔ اور اس سے باہر قدم نکالنا معیوب تصور کرتا تھا۔ غریب دلی والے سلیقہ مندی اور سفید پوشی میں مشہور تھے۔ گھر میں دن بھر فقط تہمد باندھے رہیں گے مگر ایک جوڑا قیمتی صاف ستھرا کھونٹی پر لٹکائے رکھیں گے کہ جب باہر جانا ہو تو اُجلے کپڑے پہن کر نکلیں۔ اس لئے دلی کے بازار میں کوئی شخص میلے کپڑوں میں نظر نہ آتا تھا۔ اور باہر والے حیرت کرتے تھے۔ ملازمت کو بڑی بے عزتی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر زمینوں پر سے یا سکنی جائداد سے بیس روپے مہینے کی بھی آمدنی ہے تو نواب بنے گھر بیٹھے ہیں۔ یہ شرفا کا حال تھا۔ غربا سب صنعت و حرفت کے ماہر تھے۔ دن بھر کام کیا۔ دھیلا پاؤلی کما یا اور نچنت ہو گئے۔ جب ضرورت پڑی استاد یعنی کارخانہ دار سے پیشگی لے لی اور نتھے کو گھوڑی چڑھا دیا یا پھول والوں کی سیر میں مزے کر آئے۔ دلی کی بادشاہت چھنی۔ دلی کی سیاسی سیادت ختم ہوئی لیکن دلی والے بھوکے نہ مرے۔ کیونکہ امرا کی تو وہی مثل تھی کہ ہاتھی مرا ہوا بھی لاکھ ٹکے کا ہوتا ہے۔ مگر غربا، کیا مرد اور کیا عورت ایسے تھے کہ ان کی دس انگلیاں جیسے دس چراغ۔ مشینیں تو اس زمانہ میں نکلی نہ تھیں۔ اس لئے تمام روزانہ ضروریات کی اشیاء ہاتھ سے ہی بنائی جاتی تھیں اور دلی والے ہر قسم کی دستکاری میں کمال رکھتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ گو ان سے ہاتھ سے حکومت چھن گئی تھی لیکن اس کے بدلے ان کو آزادی مل گئی۔ یہ رزولیوشن پاس کرنے کی آزادی نہیں تھی بلکہ حقیقی آزادی تھی جس کا مبنا اقتصادی آزادی پر ہے۔ خود کمانا اور خود کھانا اور اپنی نیند سونا اپنی نیند اٹھنا۔ جو چاہے کرنا۔ کسی کے نوکر نہ کسی کے پابند۔ اس لئے گو غدر کے حالات نے ایک افسردگی پیدا کر دی تھی لیکن وہ افسردگی "یاد ایام عشرت فانی" تک ہی محدود تھی۔ اس کے بعد ہر شخص آنند کے تار بجاتا تھا۔ اور اپنی محدود دنیا اور اپنے طبقاتی دائرے میں خوش تھا اور اپنے آپ کو اپنے گھر کا بادشاہ سمجھتا تھا۔

اس وقت کے دلی والے جہاں خوش پوشی میں مشہور تھے وہاں خوش وقتی میں بھی مشہور تھے۔ اس کی وجہ خواہ یہ سمجھو کہ مشکلیں اتنی پڑیں ہم پر کہ آساں ہو گئیں۔ یا یہ سمجھو کہ کلیہ قاعدہ ہے

کہ وا مدھانی کی آبادی خوشحال ہونے کی وجہ سے عیش پسند ہوتی ہے۔ بہرحال دلّی کی ایک مثل ہے
جس کا مطلب یہ ہے کہ مہینے میں تیس دن تو چالیس میلے۔ اسی لئے دلّی والے میلانی چھوڑے کہلاتے
تھے۔ بعض میلے تو سلسلے وار ہر جمعرات کو مدتوں چلتے تھے۔ جیسے بسنت۔ اس جمعرات کو اگر بھولو شاہ
کے مزار پر بسنت چڑھے گی تو اگلے ہفتے سید سرمد بھرے کے مزار پر جامع مسجد کے نیچے پھر شہر میں
جتنے مزار ہیں سب پر ہی تو بسنت چڑھتی تھی اور ہفتوں یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بڑا پاکیزہ میلا
ہوتا تھا۔ ہندو مسلمان سب شریک ہوتے تھے۔ سن رسیدہ اور خدا پرست لوگ مزاروں کی زیارت
کا شرف حاصل کرتے تھے اور فاتحہ پڑھ کر چلے آتے تھے۔ نوجوان آنکھیں سینکتے تھے کیونکہ طوائفیں
(جو ہر مٹ کے جو ہر مٹ) اپنے حسن و جمال اور ناز و ادا کا مظاہرہ کرتی پھرتی تھیں۔ گو بہت سی اعتقاداً
بھی حاضری دیتی تھیں اور نذریں چڑھا کر ہم خرما و ہم ثواب کی مستحق ہوتی تھیں۔ بچے کھلونوں
اور چاٹ کے لئے جاتے تھے اور چاٹ میں تو بڑے بھی شریک ہوتے تھے۔ اسی لئے دلّی والے
بڑے چٹورے کہلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھڑیوں کا میلہ۔ سلطان جیؒ کی (ستہرویں) حضرت
امیر خسروؒ کا عرس۔ حضرت قطب صاحب کا عرس۔ حضرت چراغ دہلی کا عرس۔ دلّی بائیس خواجہ
کی چوکھٹ مشہور ہے۔ پھر محرم۔ دسہرہ۔ عید۔ بقرعید۔ پھول والوں کی سیر۔ تیراکی کا میلہ۔ نہان کا
میلہ۔ ہولی۔ دوالی اور ہندوؤں کے اور اور میلے ٹھیلے۔ غرضیکہ پیسہ جیب میں ہو تو اسے کسی نہ کسی طرح
تو صرف کیا ہی جاتا ہے۔ ہندوؤں کے میلے میں مسلمان اور مسلمانوں کے میلے میں ہندو برابر کے شریک
ہوتے تھے اور ہر طرف خوشی ہی خوشی نظر آتی تھی۔ گرمی کے موسم میں جہاں چھینٹا پڑا اور دلّی والے
بلبلا کر گھروں سے نکلے۔ کوئی قطب صاحب جا رہا ہے تو کوئی ہمایوں کے مقبرے۔ جنگل میں منگل
ہو جاتا تھا۔ کچوریاں۔ پھلکے۔ کباب۔ مٹھائیاں۔ موسم کی ترکاریاں اور پھل۔ اتنے میں گھٹا اُمڈ کر
چڑھ رہی ہے۔ پکوان تلے جا رہے ہیں۔ جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ پینگیں بڑھ رہی ہیں۔ برساتی گیت
"جھولا کن نے ڈالو رے امریاں" اور "بدھیاں برکھا میں لپٹے کو آئے" کی سریلی تانوں سے جنگل گونج
رہا ہے جھرنے میں کودائی ہو رہی ہے پھسلن پر سے پھسل رہے ہیں۔ نوجوان مرد عورتیں اماں

نکالنے کی صلاحیں کر رہے ہیں۔ قہقہے۔ چہچہے۔ بے فکری اور حقیقی خوشی۔

یہ تھی اس وقت کے دلی والوں کی زندگی۔ اس میں غریب امیر کا سوال نہ تھا۔ اس وقت نہ زندہ باد کی صدائیں تھیں۔ نہ مردہ باد کے آوازے تھے۔ "قوم" کا سبق ابھی پڑھا نہ تھا۔ "حقوق" کی رٹ لگانے کی نعمت سے محروم تھے۔ نہ لیڈر تھے۔ نہ بزرگانِ قوم۔ نہ حقانی نہ اخبار۔ نہ پانچویں سوار۔ اُن کا گھر، اُن کا محلہ اور اُن کا شہر اُن کی دنیا تھی۔ وہ کبوتر اڑاتے تھے مگر "شاہین" "عقاب" کی بلند پروازی سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ وہ فلسفۂ خودی سے ناواقف تھے۔ صرف زندہ دلی ان کا شعار تھا۔ سیدھے سادے۔ بھولے بھالے لوگ تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر خوش ہو جاتے تھے۔ ہنستے تھے ہنساتے تھے اور مصائب و ہجر کو آفاتِ سماوی سمجھ کر تسلیم و رضائے الیقین کے ماتحت صبر و شکر کی حکمتِ عملی سے طاقِ نسیاں کے حوالے کر دیتے تھے۔ اور جس طرح بھی ہو سکتا تھا خوشی کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ غریب لوگ دن بھر محنت مزدوری کرتے رہے۔ رات ہوئی تو سوکھی روکھی سے پیٹ بھرا اور گلی میں جمع ہو گئے۔ گرمی ہوئی تو مسجد کی کوٹھیاں میں سے دس پانچ ڈول نکالے اور جہاں میدان ملا وہاں خوب چھڑکاؤ کر دیا۔ ایک ٹولی یہاں بیٹھی ہے ایک وہاں بیٹھی ہے۔ کہیں عمرو عیار کی عیاری پر واہ واہ ہو رہی ہے اور کہیں رستم و اسفندیار کی شہ زوری کی داد دی جا رہی ہے۔ کوئی مناجاتیں سنا رہا ہے تو کوئی مٹکا بجا رہا ہے۔ لونڈے لاڑے کبڈی کھیل رہے ہیں۔ کوڑی ذرا ادھر چھینی تنی بیاہڑ دا سے دل خوش کر رہے ہیں۔ آنکھ مچولی والے "کھول دو" "کھول لے" کا شور مچا رہے ہیں۔ بات بات پر قہقہہ ہے۔ ایک دوسرے پر پھبتی کہتا ہے۔ سب ہنستے ہیں۔ کوئی پھسل کر گر جاتا ہے تو سب ہنستے ہیں حتیٰ کہ کسی کو چوٹ لگ جاتی ہے اور خون نکل آتا ہے تو بھی سب ہنستے ہیں۔ آدھی رات تک یونہی افلاس و نکبت کا غم غلط کرتے رہتے ہیں۔ نہ کسی سے شکوہ، نہ کسی کی شکایت۔ صبح ہوئی اور کام سے لگ گئے اور شام تک کولھو کے بیل بنے رہے۔ پھر وہی رات کو گلی میں غم غلط کرنے کا نسخہ۔ وہی گلی والے۔ وہی قہقہے۔ وہی چہچہے۔

دلی کی زندگی کی ایک اور جھلک قابلِ دید ہے۔ ذرا چاوڑی بازار کی سیر کیجئے۔ شام کا

وقت ہے۔ سورج غروب ہوئے تو ہے۔ دلّی کے سیلانی رنگ برنگ کے صاف ستھرے کپڑے پہنے سر پر بانکی ٹوپی رکھے۔ سینہ ابھارے۔ ڈنڑ تھپلائے اپنے کسرتی بدن کی نمائش کرتے ہوئے دزدیدہ نظر سے یا کھلم کھلا کوٹھے والیوں کو تاکتے چاوڑی میں سے چلے جا رہے ہیں۔ خلقت کا ہجوم اسقدر ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ تھالی اچھالو تو کسی کی چندیا پہ گرے گی۔ سودے والے لہک لہک کر سودے کی آوازیں لگاتے ہیں۔ سقے کٹورا بجاتے جاتے ہیں اور ہوسیں ہے پیاسوں کو کی صدا لگاتے جاتے ہیں "یہ ساقی" اپنے حقے کی نے دوسری تیسری منزل تک پہنچا کر کوٹھے والیوں کو نیچے ہی سے حقہ پلا رہے ہیں۔ کوٹھے والیوں میں سے کوئی ڈھر ادپر تیسری منزل پر کھڑی تکل اڑا کر عشاق کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ کوئی سامنے والوں سے اشاروں اشاروں میں ہنسی مذاق کر رہی ہے۔ کوئی پان بنا رہی ہے۔ کوئی خالی بیٹھی اپنے حسن کی نمائش کر رہی ہے۔ یہ طوائفیں چاوڑی بازار جامع مسجد والے نکڑ سے لے کر تہور خاں کی مسجد تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی لئے شام کے وقت تماشبین اس ساری سڑک کے کئی کئی چکر لگاتے ہیں اور جھٹپٹا ہوتے ہی ادھر ادھر دیکھ کر غپ سے کسی کوٹھے پر چڑھ جاتے۔ گانا بجانا اندھیرا ہوئے بعد شروع ہوتا ہے۔ امرا و شرفا کوٹھوں پر جانا معیوب سمجھتے ہیں اور عام طور پر کوٹھے والیوں سے تعلق بھی پیدا نہیں کرتے۔ وہ ڈیرے دار طوائف کو پابند کر لیتے ہیں۔ طوائف کو ملازم رکھنا اس زمانے کا فیشن ہے۔ ڈیرے دار طوائفیں تعلیم یافتہ اور آداب مجلسی میں ماہر ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں پشت در پشت سے یہی پیشہ ہوتا چلا آتا ہے اور ان کا واسطہ چونکہ امرا و شرفا سے پڑتا ہے اس لئے یہ بہت مہذب اور بذلہ سنج ہوتی ہیں۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد جب نواب صاحب محلسرا سے نکل کر دیوانخانے میں آتے ہیں تو ان کے احباب کی محفل جمتی ہے۔ اس میں امیر غریب سب قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک آدمی مسخرا ہوتا ہے۔ کوئی تو تلا ہے۔ تو کوئی پھبتی کی جان ہے۔ شعر و سخن کا عام رواج ہے۔ اکثر شعر خوانی بھی ہوتی ہے۔ بیت بازی۔ ضلع جگت۔ ندرزی۔ مزفری تو معمولی چیزیں ہیں۔ کھیلوں میں گنجفہ، چوسر زیادہ مقبول ہے۔ طوائف ان سب چیزوں میں طاق ہوتی ہے۔ اپنی

حاضر جوابی و بذلہ سنجی سے ساری محفل کو خوش کرتی رہتی ہے شعر کا جواب شعر سے دیتی ہے۔ حافظ، جامی، نظامی کی غزلیں کی غزلیں حفظ ہیں۔ گانے میں فارسی کی غزل زیادہ گائی جاتی ہے۔ گنجفہ، چوسر، اور تاش میں اکثر جیتتی ہے۔ جو لوگ ہار جاتے ہیں ان کی ٹنگڑی بنتی ہے۔ چندیا آدھا کر اور یہ ایں ریش وفش عورت بنا کر ان کے ہاتھ میں حقہ دیا جاتا ہے کہ وہ محفل میں اس ہیئت گذائی سے داخل ہوں اور یہ الفاظ منہ سے نکالیں یہ اے بوا میں آئی اور حقہ بھر کر لائی " اس پر وہ قہقہہ پڑتا ہے کہ محلہ گونج اٹھتا ہے اور نواب صاحب تو مسند پر لوٹے لوٹے پھرتے ہیں اور ہنستے جاتے ہیں۔ اور تقاضا کرتے جاتے ہیں کہ ہاں پھر کہ سکیا "حقہ بھر کے لائی" اور پھر قہقہہ لگاتے ہیں۔ کبھی کسی کا سر منڈوا کر اس کی آنکھیں بند کر اس کے چانٹے لگا کر پوچھا جاتا ہے کہ کس نے لگایا اور جب وہ غلط نام لیتا ہے تو قہقہہ پڑتا ہے۔ کبھی توتلے صاحب کا نمبر آتا ہے اور جو الفاظ وہ زبان سے صحیح ادا نہیں کر سکتا وہ اس سے کہلوائے جاتے ہیں۔ اس کے تلفظ سے ان لفظوں کے معنی فحش ہو جاتے ہیں، اس پر ہنسی ہوتی ہے۔ غرضیکہ رات کے بارہ ایک بجے تک یہ محفل گرم رہتی ہے اور اس کے سوا نواب صاحب کو کسی اور کام میں دلچسپی نہیں سینکڑوں نوابوں نے اپنی ساری عمر اسی طرح گذاری۔ خود خوش رہے اور دوسروں کو خوش کیا اور جب گزر گئے تو سارے محلے والے نواب صاحب کو مدتوں یاد کرتے رہے۔ یہ تھی زندگی امراء کی سب بے ضرر کس مرنج وکس مرنجاں قسم کی۔ وقت خوشی سے گزار دینے کے سوا کوئی اور ان کا مقصد نہ ہوتا تھا۔

علماء و فقراء و مشائخ کی زندگی دوسری قسم کی تھی۔ علماء کا شغل خواہ وہ کتنے ہی امیر کیوں نہ ہوں درس و تدریس تھا۔ نواب مولوی صدر الدین بہادر صدر الصدور (جج ہائیکورٹ) ہمیشہ خالی وقت میں درس دیتے تھے۔ مولوی ضیاء الدین۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی الطاف حسین حالی پانی پتی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ یہ سب لوگ انہی کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے تھے۔ فقراء و مشائخ اسی طرح علم لدنی کی تعلیم سے اسرار حقیقی روشن کرتے تھے اور یہ دونوں گروہ نہایت سادہ

اور متشرع زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر غریب ہوں یا امیر زمانہ ہوں یا فقرا سب امن اور شانتی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنے ہی حلقے میں خوش رہتے تھے۔ دوسرے کے کام میں دخل نہ دیتے تھے۔ بقول شخصے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد — کسے را با کسے کارے نہ باشد

سب اپنے اپنے حال میں مست تھے۔ کوئی مال میں مست تھا تو کوئی کھال میں مست۔ غرضکہ جب تک جیتے خوش رہے۔ جب مرے تو دوسروں کو خوش چھوڑ گئے۔

آنچناں زی کہ بعد مردن تو — ہمہ گریاں بوند تو خنداں

دلّی والوں کو ورزش کا بھی بہت شوق تھا۔ خواہ امیر ہو یا غریب، مسلمان ہو یا ہندو۔ ورزش دو قسم کی تھی۔ کشتی اور پٹا۔ کشتی تو حقیقت میں بدن بنانے کے لئے تھی اور پٹا دشمن سے مقابلے کے لئے۔ اسے لکڑی کا کھیل بھی کہتے ہیں۔ دونوں کے اکھاڑے ہوتے تھے جن میں ہندو مسلمان ساتھ شریک ہوتے تھے۔ کشتی کے اکھاڑے میں ورزش۔ ڈنڑ بیٹھک۔ مگدر ہلانے اور بیٹھکیاں لگانے سے ہوتی ہے۔ ڈنڑ سے سینہ گردن اور ڈنڑ قبضوں میں قوت آتی ہے۔ مگدر گردن اور بازو کلائی اور سینے کے لئے ہے۔ بیٹھکیاں ران اور پنڈلی کے لئے۔ جب بدن اس طرح بن جاتا تھا تو سکت پیدا کرنے اور وقت پر دشمن کو زیر کرنے کے لئے کشتی سکھائی جاتی تھی۔ اس کے داؤں پیچ اس زمانے میں بچے بچے کی زبان پر تھے۔ امیر لوگ اپنے گھر کے اندر اکھاڑہ رکھتے تھے۔ جس میں گھر والے بھی شریک ہوتے تھے۔ باقی ہر محلے میں اکھاڑہ ہوتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ ورزش کا سب سامان نہایت معمولی اور سستا۔ کشتی کے لئے تین گز سے تین گز کی زمین چاہیئے۔ ایک پھاوڑا ہو جس سے اکھاڑہ کھودا جاتا۔ لکڑی کے مگدر خاصے سستے ہوتے تھے۔ ڈنڑ پیلنے کو یا تو دو اینٹوں پہ ہاتھ رکھ کر کام چلا لیا ورنہ بڑا تکلف کیا تو ایک بل ڈنڑ خرید لیا۔ اللہ اللہ اور خیر صلا۔ پٹا بھی پھری گدکے سے کام چل جاتا ہے۔ بنوٹ غضب کی چیز تھی کہ اکیلا آدمی سو آدمیوں میں پھنس جائے تو ایک کو پاس نہ آنے دے۔ عوام میں اس کا اب تک چرچا ہے۔ محرم میں

تعزیوں کے ساتھ اور رام لیلا میں سواری کے ساتھ پٹا ہوتی جاتی ہے۔ مگر جوں جوں نئی پود مدرسوں میں جانے لگی۔ ........................ ہندوستانی ورزشیں ختم ہونے لگیں۔ جو لوگ مدرسے نہ گئے وہ آخر دم تک ڈنڑ مگدر کی ورزش برابر گھر پہ کرتے رہے۔ اسس زمانے میں مردکی خوبی یہ تھی کہ اس کا سینہ چکلا ہو۔ کمر پتلی۔ گردن موٹی اور بازوؤں کی مچھلیاں ملتی ہوتی۔ مگر انگریزی کھیلوں کے رواج سے یہ سب باتیں جاتی رہیں۔ تقریباً ۱۸۹۰ء سے انگریزی کھیلوں کا زور ہوگیا اور ۱۹۱۰ء تک تو اکھاڑے صرف پیشہ ور پہلوان یا نیچ قوم کے لوگوں کے رہ گئے۔ تہذیب تعلیم یافتہ تو کرکٹ ٹینس اور فٹ بال ہی میں نام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس انگریزی ورزش سے بدن نہیں بنتا۔ نہ کبھی وقت پڑ جائے تو دشمن کا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ اور اس کا خرچ خدا کی پناہ۔ ایک ایک کرکٹ اور ٹینس کا بلا پچاس پچاس روپے کا۔ غرضیکہ دلّی والے اب بے ضرر ورزش کی طرف مائل ہونے لگے۔ مگر ورزش کی پچھلی روایات عرصے تک چلتی رہیں۔

دلّی والوں کی خوشدل زندگی کے جو مُرقع پیش کئے گئے۔ یہ بھی اس امیر اور غریب طبقے کے ہیں جو انگریزی تعلیم اور اس کے اثرات سے محفوظ تھے۔ جوں جوں انگریزی تعلیم پھیلتی گئی اہلِ ملک کی خوشدل زندگی مبدّل بہ بےچینی ہوتی گئی۔ جسے انگریزی نقطۂ نظر سے عین زندگی سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم شروع ہوگئی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی قائم ہو چکی تھی ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی بھی جاری ہوگئی تھی۔ دلّی میں دلّی کالج کے نام سے ان یونیورسٹیوں کے قیام سے قبل ہی انگریزی تعلیم کی درسگاہ کھل چکی تھی۔ دلّی کے مشہور مورخ خان بہادر شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم اسی کالج کے سند یافتہ تھے۔ ہندوؤں میں مسٹر رامچند جو بعد میں عیسائی ہوگئے۔ اور ریاضی کے بڑے استاد بنے وہ بھی اسی کالج کے شاگرد تھے۔ لیکن دلّی والے ہندو اور مسلمان دونوں انگریز کو ہتک آمیز طریق پر فرنگی کہتے تھے اور اس کی تہذیب اور تعلیم کو عیسوی تہذیب و تعلیم سمجھتے تھے۔ اُن کا یہ خیال تھا

کہ انگریزی پڑھ کر ہم عیسائی ہو جائیں گے۔ لالہ رامچندر کے عیسائی ہو جانے کا اثر دلّی کالج پر بہت برا پڑا۔ انگریز حکومت دیکھتی تھی کہ ملک بھی فتح کر لیا۔ بادشاہ کو بھی قید کر لیا۔ تمام مسلمان اور ہندو عمائدین کو بھی ختم کر دیا۔ مگر پایۂ تخت کے لوگوں کے دماغوں کو تسخیر نہ کر سکے۔ ان کی نفرت میں کمی نہیں آتی۔ اس کا علاج یہی تھا کہ موجودہ نسل کو چھوڑا جائے۔ اور آئندہ کی نسل پر تعلیم کے ذریعے اثر ڈالا جائے۔ چنانچہ پروپگنڈا شروع ہوا۔ مسلمانوں کی طرف سے سر سید احمد خاں صاحب نے یہ کام شروع کیا۔ یہ دلّی کے رہنے والے تھے۔ سر سید احمد خاں نے پروپگنڈا دو طریق سے کیا۔ اوّل یہ کہ دنیا میں سائنس کا زور ہے انگریزی پڑھے بغیر اس علم سے متمتع نہیں ہو سکتے۔ اس لئے علوم مشرقی کے سند یافتہ لوگوں کو بھی سائنس کی معلومات سے بہرہ اندوز ہونا چاہیئے۔ دوم یہ کہ ہماری حکومت ختم ہوئی۔ اب انگریز کی حکومت ہے ہمارے لئے عافیت اسی میں ہے کہ ہم انگریز سے نفرت کرنا چھوڑ دیں اور اس سے دوستی کا ہاتھ بڑھائیں جس کی صورت یہ ہے کہ ہم انگریزی سیکھیں۔ تاکہ انگریزوں سے بات چیت کر سکیں۔ انگریزی ادب تہذیب اور لباس اختیار کریں، تاکہ اُن کو ہم سے مغائرت نہ رہے اور اپنی وفاداری کے ثبوت میں انڈین نیشنل کانگرس میں شرکت سے احتراز کریں۔ چنانچہ سر سید احمد خاں اور دلّی کے ایک اور باشندے (جو علی گڑھ میں جج تھے) یعنی مولوی سمیع اللہ صاحب نے مل کر علی گڑھ میں ایک انگریزی تعلیم گاہ مسلمانوں کے لئے قائم کی جس کا نام مدرستہ العلوم علی گڑھ رکھا۔ علمائے دیوبند نے اس مدرسہ کی بہت مخالفت کی۔ دلّی والے عوام دلّی چھوڑ کر کب علی گڑھ جاتے۔ مولوی سمیع اللہ کے صاحبزادے حمید اللہ خاں۔ ڈپٹی الٰہی بخش کے بیٹے محمد رفیق اور محمد صدیق تو اس کالج میں جم کر ضرور پڑھے، باقی سر سید احمد خاں کے نواسے سید نصیر شاہ اور اسی قسم کے اور چند رؤسا کے بیٹے چند دن مدرستہ العلوم کی سیر کر آئے۔ یہ کالج سنہ ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا۔ پر دلّی والے بیس سال تک اس سے بھاگتے ہی رہے۔ پنجاب کے لوگوں نے جن کو سر سید احمد خاں زندہ دلان پنجاب کہا کرتے تھے اس مدرسہ کا

سب سے زیادہ نوازا۔ مگر ذکر دلّی اور دلّی والوں کا ہے کہ غدر کے بعد سے تیس برس تک دونوں ہندو مسلمان انگریزی سے بچنے کا مقابلہ کرتے رہے۔ مگر ہندوستان کی دنیا بھی بدل رہی تھی۔ تیس برس میں سب وہ لوگ جن کے دل میں انگریزوں کے خلاف گھاؤ تھے مر کھپ گئے۔ نئی پود انگریزوں کی حکومت اور نئے ماحول میں پیدا ہوئی۔ جو لوگ انگریزی سے بے بہرہ تھے انھوں نے خود جو نقصان اٹھائے تو اپنی اولاد کو وہ انگریزی نہ جاننے سے بچانا چاہنے لگے۔ مذہبی تعصب بھی کم ہونے لگا۔ مسلمانوں کے لئے دلی میں اینگلو عربک سکول اور ہندوؤں کیلئے اینگلو سنسکرت سکول کھولے گئے۔ عربی و سنسکرت کو سکول کے نام میں شامل کرنے کا مطلب ظاہر ہے۔ عیسائیوں نے ایک مشن سکول کھولا جو سب سے بہتر تھا۔ سرکار نے گورنمنٹ سکول جاری کیا غرضیکہ پچاس برس کے عرصے میں انگریزی طریق تعلیم زور پکڑ گیا اور مشرقی علوم کے لئے چند مسجدوں اور خانقاہوں میں باقی رہ گئے۔ انگریزی تعلیم تو دلی والوں نے حاصل کرنی شروع کر دی لیکن ابھی تک ایشیائی اور دلّی کی تہذیب کا بھی اثر ان پر باقی تھا۔ تاہم ان دلّی والوں سے یہ مختلف تھے جو انگریزی تعلیم سے محروم رہے تھے۔ یہ ابھی آدھا تیتر آدھا بٹیر تھے۔

اس انگریزی تعلیم سے اخلاقی معاشرتی، تمدّنی اور ادبی اثرات جو ہوئے اس کا نتیجہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ گورنمنٹ تعلیم کا مدعا اوّل یہ تھا کہ بچوں کی ذہنیت بدل جائے۔ وہ اپنے آپ کو، اپنے اسلاف کو، اپنی تہذیب و تمدّن ہر چیز کو انگریزوں سے کمتر سمجھیں۔ اور انگریزوں میں اور ان کی ہر چیز میں ان کو خوبی نظر آئے جس سے وہ انگریزوں کی دل سے عظمت مان لیں اور ایشیائی ہر چیز سے حقارت کرنے لگیں اور اپنے ذہن کو انگریزوں کی مٹھی میں دیدیں۔ نیز درسگاہوں سے مذہبی تعلیم اڑا کر انگریزوں سے مذہبی تعصب و حقارت کی جڑ کاٹ دیں۔ دوسرا مدّعا انگریز حکومت کا یہ تھا کہ جو انگریز حاکم مقرر ہوں ان کو اپنے ماتحتوں سے کام لینے کے لئے ملک کی زبان سیکھنی پڑے بلکہ ہندوستانی اتنی انگریزی سیکھ جائیں کہ وہ انگریز افسروں کے دفتر کا کام انگریزی میں چلا لیں۔ ابتدا میں انگریزوں نے اپنے افسروں کے

ہندوستانی سیکھنے کے لئے کلکتے میں فورٹ ولیم مدرسہ کھولا تھا تاکہ ہر انگریز اس میں ہندوستانی لکھنے پڑھنے اور بولنے میں ماہر ہو۔ لیکن جب ہندوستانیوں ہی نے انگریزی سیکھ لی تو پھر انگریز افسروں کو صرف اتنا کام کرنا ہوتا تھا کہ بول چال کی ہندوستانی سیکھ لیں۔

انگریزی تعلیم کا اخلاقی اثر یہ ہوا کہ لوگ مذہب سے بے بہرہ ہو گئے۔ ایشیائی علوم چھوڑنے سے ایشیائی اخلاق بھی رخصت ہوا۔ معاشرتی اور تمدنی اثر یہ ہوا کہ ہر انگریزی طریق اختیار کر لیا گیا۔ ادبی اثر یہ ہوا کہ اُردو میں نہ صرف انگریزی محاوروں اور امثال کے بے معنی ترجمے داخل ہو گئے اور لوگ "سفید جھوٹ" اور "سفید ہاتھی" کو اُردو میں استعمال کرنے لگے۔ بلکہ انگریزی اور مغربی خیالات کا اظہار عریاں وفحش زبان میں تحریر ہونے لگا اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ اس ادب کا نام ادب لطیف رکھا گیا۔ مگر یہ سب کچھ ۱۹۱۱ء کے بہت بعد ہوا۔ اس کا ذکر ابھی قبل از وقت ہے۔

دلّی کی زندگی کے تغیرات میں دلّی والوں کے لباس کی تفصیل رہ گئی جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ غدر کے بعد تقریباً بیس برس تک تو پرانا لباس ہی چلتا رہا مگر تا بہ کے۔ دلّی والوں کا لباس مدتوں یہ رہا کہ انگرکھا۔ کرتہ پاجامہ اور کسی قسم کی ٹوپی۔ پاجامے کئی وضع کے ہوتے تھے۔ ڈھیلے یک برے یعنی موری لٹھے کے ایک برعرض کی۔ شرعی یعنی ٹخنوں سے اونچے۔ سیدھے تنگ موری کے اور آڑے اریب وال۔ جو بہت چست ہوتے تھے۔ اور زیادہ تر نوجوان اور بانکے پہنتے تھے۔ ہندو مسلمان کے لباس میں تھوڑا فرق تھا۔ ہندو انگرکھے کی گھنڈی دائیں طرف اور مسلمان بائیں طرف رکھتے تھے۔ باقی کرتہ پاجامہ یکساں۔ ہندو دھوتی بھی پہنتے تھے مگر زیادہ تر گھر پر۔ باہر نکلتے تو چست پاجامے ہی میں۔ ٹوپیاں طرح طرح کی ہوتی تھیں مثلاً چوگوشیہ۔ کمرکی اور مغلئی۔ پچگوشیا اور گول۔ سب سے زیادہ دو پلڑی یا دوپلی رائج تھی۔ جسے ہندو مسلمان سب استعمال کرتے ہیں۔ ابتدا میں قیتون۔ ٹھپہ گوکھرو۔ کرن۔ پیک اور سلمے ستارے کے کام کی ٹوپیاں بڑے چھوٹے سب استعمال کرتے تھے۔

عمر کے لحاظ سے گوسٹے میں فرق کر دیا جاتا تھا۔ بعد میں صوفیانہ پن کے خیال سے پتلی لیس استعمال ہوتی تھی۔ چپکلی لیس کا استعمال بھی عام تھا۔ خاص کر اس ٹوپی پر جو گنبد نما سخت پٹھے کی ہوتی تھی۔ جس پر ریشم یا مخمل یا مہین چھینٹ کے ساتھ چڑھی ہوتی تھی۔ اس گنبد کی بیٹھک پر لیس لگی تھی۔ غریب لوگ سادی ہی استعمال کرتے۔ اور سب قسم کی ٹوپیاں اب تک رائج ہیں مگر یہ گنبد دار ٹوپی جسے شاید ارکِ چین پہنتے تھے غائب ہو گئی۔ تقریباً ۱۹۰۵ء میں ولائتی مال میں ایک ٹوپی آئی جسے فلٹ کیپ کہتے تھے۔ پہلے اس میں دائیں بائیں بٹن ریشمی ڈوری سے لپٹے ہوئے ہوتے تھے۔ لیکن بعد میں سادی ٹوپیاں آنے لگیں۔ انگریزی خواندہ ہندو مسلمانوں نے فخریہ استعمال کیں مگر شہر والے اس پر نام رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم کے طلباء کی معرفت ترکی ٹوپی کا رواج ہوا۔ ابتدا میں یہ سخت اور اوپر سے چھوٹے چندوے اور نیچی یا آڑی ہوتی تھی۔ عام مسلمان نیچریوں کی ٹوپی کہہ کر اس سے نفرت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ نفرت کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی اور بیس سال میں یہ مسلمانوں کی امتیازی ٹوپی بن گئی اور ہندوؤں نے فلٹ کیپ اپنی مخصوص ٹوپی کر لی۔ سیاسی کشمکش کے زمانے میں یعنی ۱۹۱۱ء کے بعد ہندو گاندھی کیپ جو سفید کھدر کی کشتی نما ٹوپی تھی استعمال کرنے لگے۔ اور تقریباً ۱۹۴۶ء میں مسلمانوں نے جناح کیپ جاری کی۔

دربار ۱۹۰۳ء کے بعد دلی میں بجلی کی روشنی آئی اور ٹریموے جاری ہوئی۔ کشمیری دروازے کے باہر کا علاقہ آباد ہوا اور کچھ لوگ کوٹھیوں میں بھی رہنے لگے۔ ورنہ پہلے صرف انگریز کوٹھی میں رہتے تھے۔ ۱۹۱۱ء کے دربار کے بعد چاندنی چوک کی بیچ کی نہر جو پٹی ہوئی تھی پاٹ کر بھر دی گئی اور اس کے دونوں طرف کے سایہ دار درخت کاٹ دیے گئے جس سے سڑک بہت چوڑی ہو گئی۔ ابتدا میں سواری پالکی، تام جھام، ہوادار، ہاتھی گھوڑوں پر ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ فٹن۔ وگنٹ۔ لینڈو۔ سیج گاڑی۔ تانگہ۔ بائیسکل رائج ہو گئیں۔ موٹر کار ۱۹۰۵ء کے بعد نکلی۔ ہر دربار کے بعد ارزانی مبدل بہ گرانی ہوتی جاتی تھی۔ قیصری دربار کی ارزانی کا تو

ذکر ہی کیا ہے۔ مگر کرزن دربار تک پیسے کوڑیوں میں کام چل جاتا تھا۔ ایک پیسے کی ۳۲ کوڑیاں۔ ۱۶ کوڑی کا دھیلا یعنی چار گنڈے کا۔ اور دو گنڈے کی دمڑی۔ ایک گنڈے کی آدھی۔ گو کہ ایک پیسے کے پانچویں حصے تک کی قیمت پر چیز مل جاتی تھی۔ اور غریب غربا پیسوں میں گزر کر لیتے تھے۔ اسی طرح مزدوری سستی تھی۔ مکان کے کرائے سستے تھے۔ غرضیکہ زندگی سادگی کے ساتھ آرام سے گزرتی تھی۔ اشیار خوردنی پھل۔ ترکاری۔ دودھ گھی۔ ارزاں ہونے کی وجہ سے دلّی والوں کی خوراک صحت کی ہر ضروری چیز سے مشتمل ہوتی تھی۔ ایک پیسہ میں چار پھل لے لو۔ ایک کوڑی میں پودینہ یا ہرا دھنیہ یا ہری مرچ لے لو۔ ایک آنہ سیر دودھ دیہہ کا ڈیڑھ سیر گھی۔ ڈیڑھ آنے سے دو آنے سیر تک بکری کا گوشت۔ دال دیا ل کے لئے نو کوڑیاں کافی تھیں۔ تفصیل سے مضمون طویل ہوتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ارزانی تھی۔ بے فکری تھی۔ شانتی اور امن تھا۔ ہندو مسلم میں یگانگت و موانست تھی اور عام طور پر برادرانہ تعلقات۔ خوشی کے موقعے پر لین دین تھا۔ اور دلّی والے سیاسی جھمیلوں سے ناآشنا بسم اللہ کے گنبد میں رہتے تھے ۱۹۱۱ء میں دلّی کے دوبارہ پائے تخت ہونے کا اعلان ہوا اور پہلی دفعہ مغلوں کے دارالخلافے کو انگریزوں نے اپنی راجدھانی بنایا۔ اس وقت سے دلّی والوں کے لئے دلّی کی بدنصیبی کا دور شروع ہوا جس کا انجام قتل عام پر ہوا۔ انشاء اللہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کی دلّی کا حال اگلے مہینے لکھوں گا :

مشتاق احمد زاہدی

# عید کے دن کی دُعا

یہ دُعا حضرت اکبر الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے جذبات کی ایک یادگار ہے

عید کا دن ہے آج میرے خدا — میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا
مجھکو عید ی عطا ہو اے رحمٰن — قلب کو میرے بخش اطمینان
انتظام سکونت و صحت — کر دے ایسا کہ دل کو ہو راحت
سو طرف خلق کی ہے آج نگاہ — میرے لب پر ہے صرف "یا اللہ"
یاس سے ہر طرف کو تکتا ہوں — اور کس کو پکار سکتا ہوں

# مجھے درد دل دے

الٰہی دلِ مبتلا چاہتا ہوں — فنائے خودی اے خدا چاہتا ہوں
نگاہِ محبت فزا چاہتا ہوں — کہوں کیا میں تجھ سے میں کیا چاہتا ہوں

تپش دے، خلش دے، غمِ جانگسل دے

مرے دینے والے مجھے درد دل دے

نہیں چاہیئے مجھ کو آرام کا دل — نہیں چاہتا میں دد و دام کا دل
ہے پہلو میں میرے فقط نام کا دل — نہیں درد جب دل میں کس کام کا دل

تپش دے، خلش دے، غمِ جانگسل دے

مرے دینے والے مجھے درد دل دے

دلِ غمزدہ کو کبھی شاد کر دے — شب و روز مصروفِ فریاد کر دے
مری اجڑی بستی کو آباد کر دے — مری خاک اُلفت میں برباد کر دے

تپش دے، خلش دے، غمِ جانگسل دے

مرے دینے والے مجھے درد دل دے

مجھے جامِ صہبائے وحدت عطا کر — پھڑکتا رہے دل وہ لذت عطا کر
نہ دولت، نہ ثروت نہ حشمت عطا کر — مجھے صرف اپنی محبت عطا کر

تپش دے، خلش دے، غم جانگسل دے

مرے دینے والے مجھے درد دل دے

نہیں جسم لاغر کو خلعت کی خواہش نہیں جان محزوں کو راحت کی خواہش

فقیروں کو کیا ہو گی دولت کی خواہش نہیں خاکساروں کو رفعت کی خواہش

تپش دے، خلش دے، غم جانگسل دے

مرے دینے والے مجھے درد دل دے

میں اڑ جاؤں رنگ رخ زرد ہو کر نہ لوں چین یکجائے دل سرد ہو کر

تجسس میں تیری رہوں گرد ہو کر ہمیشہ تڑپتا رہوں درد ہو کر

تپش دے، خلش دے، غم جاں گسل دے

مرے دینے والے مجھے درد دل دے

الٰہی دل پاک احمدؐ کا صدقہ نبی مکرم کے مرقد کا صدقہ

ترے درد والوں کے مشہد کا صدقہ محبت عطا کر محمدؐ کا صدقہ

تپش دے، خلش دے، غم جاں گسل دے

مرے دینے والے مجھے درد دل دے

احمد حسین امجد

# چراغ کے نیچے

اُس کا وجود لوگوں کے لئے ایک عذاب تھا۔ جب سے اس نے اس محلہ میں سکونت اختیار کی تھی پاس پڑوس کے رہنے والے قہر الٰہی میں مبتلا تھے۔ ہر روز وہ ایک نرالا فتنہ اٹھاتی رہتی۔ اس کے ہاتھوں کسی کی بھی عزت محفوظ نہ تھی۔ شریفوں کی پگڑیاں اچھال کر اور معصوم لڑکیوں پر بہتان لگا کر اُسے ایک خاص سرور حاصل ہوتا۔ دن بھر اس کی زبان تیز مقراض کی مانند چلتی رہتی۔ ایسا معلوم ہوتا گویا اسکی تخلیق کا مقصد ہی بنی نوع انسان کی دل آزاری ہے۔

نوجوان طبقہ سے تو اسے بغض قلبی تھا۔ ان کو تو وہ ایک آنکھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ آئے دن ان میں سے کسی نہ کسی کے خلاف ایک نیا شگوفہ چھوڑ دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ جاہل عورت نہ تھی کہ اس کی بدعنوانیوں کو جہالت پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا جاتا۔ وہ تو اچھی خاصی تعلیم یافتہ تھی۔ لیکن تعلیم بھی فطری پستی کے عمیق غار سے اس کو بلندی کی طرف کھینچنے سے قاصر رہی۔ اس کی اوچھی باتیں۔ ذلیل حرکتیں۔ سفلہ پن اس کو محلہ میں ہر ایک کی نظروں سے گرا چکا تھا۔ اُس سے ملنا تو کجا کوئی اس کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا لیکن وہ تو دندناتی ہوئی ہر ہر دہلیز پر جاتی اور مختلف رشتے ناتے جو اس نے ہر گھر کے مکین سے از خود جوڑ لئے تھے ان کے واسطے سے صدا لگاتی۔ گھر میں بے روک ٹوک گھس جاتی۔ اور ان خود ساختہ بھابیوں، چچیوں اور ماسیوں کا لہو گھنٹوں اپنی ہرزہ سرائی سے جلایا کرتی۔ لیکن اتنی مجال کسی کی نہ تھی کہ اس کو اپنے یہاں آنے سے روک سکے یا اپنے طرز عمل سے ہی بیزاری کا اظہار کر سکے۔ اس کا ہولناک نتیجہ وہ بارہا دیکھ چکی تھیں اکرام کے ذرا سی زبان ہلا دینے پر اس نے وہ فیل مچائے کہ پاس پڑوس کے لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ جھاڑ کا کانٹا بن کر چمٹ گئی۔ کس کس مشکل سے اس سے پنڈ چھڑایا ہے کہ توبہ بھلی۔ اگر دوسرے لوگ معاملہ رفع دفع نہ کرتے تو شاید وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر اسی حویلی کی چوکھٹ پر جان دیدیتی۔

اکرام ایک نہایت ہی شریف سلیم الطبع انجینیر فیض الحسن کا لڑکا تھا۔ انجینیر صاحب کے اخلاق کے لوگ گرویدہ تھے اور اکرام بھی اپنی شرافت اور خوش طبعی کے باعث بہت ہر دلعزیز تھا۔ وہ سب بزرگوں کی انتہائی تعظیم و تکریم کرتا لیکن اس خبیث و بدباطن عورت سے اسے انتہائی نفرت تھی۔

"لوگ آخر اس کٹنی کو آسیہ ماسی کیوں کہتے ہیں؟" اس کا خون کھولنے لگتا۔ "بھلا یہ کمینہ خصلت عورت اس لائق ہے کہ اس سے ماسی کا ناطہ جوڑا جائے۔ اور پھر بھلا اس کو کیا حق ہے کہ ہر شریف عورت کو بھابی اور چچی کے ناموں سے پکارے۔ بلکہ اسے سرے سے یہ حق ہی کس نے دیا کہ ہر بھلے مانس کے گھر میں بے اجازت چلی آئے" وہ آئے دن اپنی ماں سے غصہ ہو ہو کر جھگڑتا رہتا۔

"آپ اسے گھر میں قدم کیوں رکھنے دیتی ہیں اماں جان...... پھر آپ نے اسے ماسی کیوں بنا رکھا ہے...... نیچ طبقہ کی عورت"..... وہ دانت پیستا..... "ہر وقت تیری میری برائیاں...... کیا یہ عورت اس لائق ہے کہ ماسی کے نام سے پکاری جائے۔ ماسی کے نام کو بھی لاج لگانے والی..... آخر آتی کیوں ہے یہ یہاں پر..... کون تڑپتا ہے اسے دیکھنے کے لئے... دھکے دے کر باہر نکال دوں گا کسی دن اس کٹنی کو..... آخر اسے منہ ہی کیوں لگاتی ہیں آپ..... منہ نہ لگائیں تو مجال نہیں کہ اس گھر میں قدم بھی رکھ سکے.... بس سر پر چڑھا رکھا ہے"

"ہاں ہاں میں تو خوشامدیں کرتی ہوں اس کی۔ سر پر چڑھاتی ہوں... ہاتھ جوڑ جوڑ کر بلاتی ہوں"

"ہاتھ نہیں جوڑتیں تو آپ منع بھی تو نہیں کرتیں"

"اب کیا منع کروں ایسی کو..... گھر آئی کو دھکے دیکر باہر کرنا میرے بس کا روگ نہیں۔"

"یہ بس کا روگ نہیں تو رشیدہ کا بھی ناس پیٹ بھر کرے گی۔ لڑکی کی تربیت کا زیادہ خیال ہے یا اس خبیث کا..... جب سے اس نے یہاں آنا جانا لیا ہے تب سے اس کی زبان زیادہ کھل گئی ہے"

"اور جب سے تم بھی تو ہر وقت لڑنے لگے ہو اپنے آپ کو تو دیکھا نہیں جاتا"

رشیدہ غصہ سے جھلائی۔

"دیکھا ۔ دیکھا اماں جان ؟" اکرام نے طنز سے رشیدہ کی طرف اشارہ کیا۔

ماں نے کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ دروازہ کھلا اور آسیہ ماسی اپنے مخصوص انداز میں نازل ہوتے ہوئے پکاریں۔

"بھابی جی میں آجاؤں !!!"

سارے گھر پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ بھابی جی تجاہل عارفانہ برتتے ہوئے سلائی کی مشین پر اور زیادہ جھک گئیں۔ گویا آمد سے قطعی بے خبر ہیں۔ رشیدہ نے رسالے سے اپنے چہرے کو بالکل ڈھانپ لیا، لیکن اکرام یونہی غصہ سے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے اکڑا کھڑا رہا۔ اس نے عزم مصمم کر لیا تھا کہ اس ذلیل عورت کا اپنے گھر سے پتہ کاٹ کر رہے گا اور یہ کام آج ہی ہوگا۔

آسیہ ماسی کی زود فہم اور دوررس آنکھوں نے فوراً تاڑ لیا کہ گھر کی مکدر فضا اور غیر معمولی خاموشی کا باعث خانہ جنگی کے سوا کچھ نہیں۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے سیاہ لبوں پر پھیل گئی اور عیارانہ بھابی جی کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

"کس سے لڑ بیٹھیں میری بھابی جی ...... اکرام بیاہ پر راضی نہیں ہوتا۔ میں جانوں ...."

بھابی جی زیادہ دیر تک تجاہل عارفانہ کو نہ نباہ سکیں اور بناوٹ سے چونک کر افسردہ لہجہ میں بولیں۔

"کون ؟ آسیہ ماسی !!! آؤ بیٹھو"

اکرام ماں کی آؤ بھگت سے تلملا اٹھا۔

"بس وہی، آؤ بیٹھو۔ آؤ بیٹھو" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

آسیہ ماسی روئے سخن اکرام کی طرف کرتے ہوئے پیار بھرے لہجہ میں کہنے لگیں۔

"اور تو کیسا چپ چاپ کھڑا ہے میرے چاند !!! کچھ ماں سے بگاڑ ہو گیا یا رشیدہ لڑ پڑی تجھ سے ...... میں تو کہتی ہوں بھابی ! ایسا سونا سا لعل ہے۔ پر تمہیں ذرہ برابر قدر نہیں اس کی ؟"

اکرام اور بھی چڑ گیا۔

"لعنت ہے اس گھر پر بس چلے تو......" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔

آسیہ ماسی کا پیار زبانی ہمدردی کی حدود توڑ کر عملی کارروائی کی طرف رجوع ہوگیا۔ اپنے بھاری بھرکم جسم سمیت اکرام کی طرف بڑھ کر اس کا ہاتھ لاڈ سے پکڑ کر تھپتھپاتے ہوئے بچوں کی طرح بہلانے لگیں۔

"کس بات پر روٹھا ہے؟ اپنی ماسی کی قسم اکرام بیٹا..... بول تو کیا ہوا تجھے..... بھابی تو ایسی بیٹھی ہیں کہ فکر ہی نہیں کچھ جیسے..... اپنے لال کی ایسی چاند جیسی دلہن لاؤں گی کہ گھر میں جاں ہو جائے گا"

اکرام کو اپنا عزم پانی ہوتا نظر آیا۔ الفاظ منہ کے منہ ہی میں گم ہونے لگے۔ وہ کچھ جھینپ کر مسکرانے لگا کہ اس کی آنکھیں ماں سے چار ہوئیں۔ گویا کہہ رہی ہوں۔

"مجھے تو نصیحتیں کرتا ہے کہ گھر میں نہ آنے دوں ۔ لے اب کہہ !!!"

وہ شاید خاموش ہی رہتا لیکن ماں کی زیر لب مسکراہٹ اس کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ ایک دم اکڑ گیا۔ ہمت جیسے دوبارہ عود کر آئی۔

آسیہ ماسی کے ہاتھوں کو پرے جھٹک کر بولا۔"

"مجھ سے باتیں نہ ملایا کرو زیادہ.... ان ہی پر کرم رکھو۔ جنہیں چاہت ہے تمہاری"

"افوہ کیسا زہریلا لڑکا ہے" آسیہ ماسی غصہ اور خفت سے بولیں۔

"بس دو حرف پڑھ کر ماں ماسی سے یہی سلوک کرنا سیکھا ہے۔ کالج میں پروفیسروں نے بڑوں کا یہی ادب سکھایا ہوگا"

"ہاں یہی سکھایا ہے"..... وہ بچوں کی طرح ہٹ کرنے لگا۔

"یہی سیکھا ہے ہم نے... پھر تم کیوں آتی ہو، یہاں۔ کون بلاتا ہے تمہیں۔ کس نے کی ہے تمہاری خوشامد کہ روز آکر نازل ہو..... صبح ہوئی نہیں اور شروع ہوگیا دورہ..... ہر گھر میں تاک جھانک

..... ہر گھر میں تاک جھانک۔ تیری میری برائی۔ ہر وقت رونا... ہم نہیں سنتے کسی کی برائیاں۔ چکنی چپڑی باتیں بنا کر ہر گھر کے بھید معلوم کر کے ساری دنیا میں نقارہ بجاتی پھرتی ہو۔ اندھے ہیں جو تم کو گھر میں گھسنے دیتے ہیں اپنے۔ لگائی بجھائی کر کے محلہ بھر کی فضا خراب کر رکھی ہے تم نے۔ ظاہر میں یوں بنتی ہو جیسے بڑی سگی ہو اور ڈیوڑھی سے نکلتے ہی دوسرے گھر میں برائیاں رونے لگتی ہو۔ کوئی ضرورت نہیں ہمارے گھر میں آئندہ آنے کی تمہیں۔"

جہاں دیدہ آسیہ ماسی کیا چار دن کے چھوکرے کی گیدڑ بھبکیوں میں آجانے والی تھیں۔ اطمینان سے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے سر ہلا ہلا کر بولیں۔

"ارے جا بھی۔ کیوں منہ لگتا ہے میرے...... بتا تو کس کے گھر روئی ہے میں نے تیرے گھر کی برائی ــــ کس کس کی برائی کے نقارے بجائے ہیں میں نے۔ تیری ماں کی محبت پڑ گئی ہے دل میں کہ چلی آتی ہوں۔ ورنہ کیا میرا کہیں ٹھکانہ نہیں ہے۔ وہ بچاری محبت کی ہے۔ دو بات کر لیتی ہے جی خوش ہو جاتا ہے۔ تجھے اپنا گھر مبارک رہے۔ بیٹا کچھ میں اس میں سے چھڑا کر تھوڑی لے جاؤں گی۔ دھن دولت تو ہرتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اس پر کیا اتنا پھولنا اور گھر کے بھید چھپانے کی بیہے بھیا کہ بھید تو اس سے چھپا جو بھید جانتا نہ ہو۔ جس کو گھر کا رتی رتی حال معلوم ہو وہ گھر میں نہ بھی آئے تو کیا چھپ رہے گا۔"

آسیہ ماسی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے آواز بھرا گئی۔

اکرام کچھ پشیمان سا ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اکرام کی ماں موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بولی۔

"جانے دو آسیہ ماسی...... دیوانہ ہوا ہے وہ تو۔ غصہ ناک پر رکھا رہتا ہے..... صبح سے رشیدہ سے لڑائی ہو رہی تھی۔ غصہ میں بھرا کھڑا تھا۔ تم نے بیاہ کا نام لے دیا بس چڑ گیا......

آسیہ سمجھ گئی کہ بس تیر نشانہ پر پڑا۔

اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"ہزار غصہ میں ہو۔ کہیں ایسے عقل سے گزر جاتے ہیں..... بیاہ کی بات مذاق میں کہدی تو بپھر

ایسا زہر کہ توبہ ..... ایسے رنگ ڈھنگ تو شریف گھرانے میں میں نے کہیں دیکھے نہیں"

اکرام کی ماں معذرت کرنے لگی۔

"چلو چھوڑو آسیہ ماسی تمہارا ہی تو بچہ ہے۔ کوئی غیر تو نہیں۔ غصہ میں بک گیا ہے سب کچھ۔ معافی منگوا کر رہوں گی۔ بھلا جاتا کہاں ہے۔ تم نے بھلا اس کی باتوں کا خیال کیا۔ تم میرے منہ آتی ہو۔ وہ روکنے والا آیا بڑا کہیں سے.........."

آسیہ ماسی خوشامد سے اور بھی بکھرنے لگیں۔

"انصاف کرو بھابی جی کیسا الزام لگایا ہے۔ بھلا مجھے کیا پڑی ہے جو تمہارے گھر کی باتیں کہتی پھروں۔ آئے دن ٹھیکیداروں کو پھل، مٹھائیاں ڈالیاں تمہارے گھر لاتے دیکھتی ہوں۔ قسم لے لو جو کبھی زبان پر بھی لائی ہوں یا کسی سے کہا ہو کہ یہ رشوت کی ہوتی ہیں۔ کبھی اُلٹ کر یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ آتی کہاں سے ہیں۔ بھیا کے دفتر کے چپراسی تمہارے گھر کا کام کرتے ہیں۔ بتاؤ تو آج تک میں نے کسی کو بتایا...... میں کہتی ہوں مجھے کیا..... میرا کیا نقصان جو کسی کو فائدہ ہو جائے۔ رشیدہ بیٹی کا دو جگہ سے رشتہ ٹوٹا پر میں نے منہ سے حرف نہ نکالا۔ دنیا بھر میرے سر ہوتی رہی۔ پر میں نے سدا یہی سوچا کہ میری تمہاری لڑکی ایک ہی ہے۔ میں تو تمہاری رشیدہ کو اپنی ناصرہ ہی کی طرح سمجھتی ہوں۔ اپنا گھٹنا کھولو اور آپ ہی لاجوں مرو..... اور اب اس اکرام کی بات تم سے کیا کہوں...... بتاؤں تو تیری میری برائیاں رونا ہے اور نہ بتاؤ تو لڑکا ہاتھ سے جاتا ہے..... پھر تم الاہنا دو گی کہ لڑکا بگڑ رہا تھا اور خبر نہ کی........"

اکرام کی ماں کا ماتھا ٹھنکا...... وہ عجب کھسیانی سی ہو کر بولی۔

"کیا اکرام کی بابت کچھ کہنے لگی ہو بہن؟"

"ہاں اور کس کی.......... میرا آنا یونہی تو اس کو کھلتا ہے۔ کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی ہے آج۔ بھابی جی اس کے تیور تو یونہی مدتوں سے دیکھتی چلی آرہی ہوں۔ اب تم اس کو کچھ کہنا سننا نہیں۔ یہ عمر ہی ایسی رنگیلی ہوتی ہے...... ذرا دو چار دفعہ سلمہ بیگم سے ہنستے بولتے پکڑ لیا...... بس تب ہی سے دشمن ہوا ہے یہ میرا......... میں نے کچھ کہا نہیں۔ سنا نہیں..... اور مجھے واسطہ بھی کیا بھابی جی۔

..... ہنسائی میری تو ہو گی نہیں..... ہاں تمہارا خیال ضرور آیا..... پر لحاظ کے مارے تم سے بھی نہ کہہ سکی۔ اور وہ ایسا نڈر کہ دیکھ کر بھی تو نہ لجایا۔ ہاں سلمہ مجھے دیکھتے ہی اندر بھاگ گئی"

اکرام کی ماں کو سکتہ سا ہو گیا۔ شریف لوگ دروغ گو کی تردید کرتے ہوئے بھی جھجکتے ہیں اور پھر ایسے نازک موضوع پر۔ اکرام کی کم سخن ماں نے خاموشی ہی کو مناسب سمجھا۔ اور وہ بے باک عورت نہ جانے کب تک اکرام اور سلمہ کے خود ساختہ بے بنیاد رومانس کے ہر ہر پہلو کو بانگ دہل بیان کرتی رہی۔

اس کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ زبان تیز مقراض کی مانند پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ اور زبان کے ساتھ ہی ساتھ آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے ہر ہر لفظ کی وضاحت کرتے جاتے تھے۔ اور وہ تو نہ جانے کب تک وہاں یہ فیل مچاتی رہتی۔ پر پاس پڑوس کی عورتوں نے سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔

لیکن آسیہ ماسی کی فتنہ پردازی ہنوز تشنہ کام تھی۔ وہاں سے اٹھ کر وہ سیدھی بدرالاسلام صاحب کے یہاں سدھاریں۔ جن کی اکرام کے گھر والوں سے خاندانی دشمنی تھی۔ فیض الحسن کی بے عزتی کی خبر تو ان کے لئے نوید عید سے بڑھ کر تھی۔ آسیہ ماسی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ آؤ بھگت کی کہ ماسی کا دل ہی تو خوش ہو گیا۔

"آپا جی بُرا نہ ماننا کہنے کو تمہارے ناطے کے ہیں۔ پر کوئی چلن ان کا تمہارے گھر سے نہیں ملتا..... دولت کا وہ غرور ہے وہ غرور ہے کہ دوسرے کی عزت اتارنا تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بیٹا، بیٹی وہ گھمنڈی کہ سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ خالی خولی ڈھونگ ہی ڈھونگ ہے۔ دھن ہوتا تو لڑکی کی منگنی دو دفعہ یونہی چھوٹ جاتی۔ لڑکے والے پندرہ ہزار کا جہیز مانگتے تھے اور ان سے پورے پانچ ہزار بھی نہ نکلے اور بتائیاں ہانکنا اتنی۔ راجاؤں کے بھی دماغ نہ ہوں گے اتنے۔ ایک تمہارا بیٹا بھی تو ہے آپا جی....... کیسا سیدھا بھولا بھالا۔ اور بھورانی اس سے بڑھ کر سلونے مزاج والی..... چاند سورج کی جوڑی۔ سلامت رہیں دونوں اور تم ان کی بہاریں دیکھو۔ آپا جی۔

آپا جی اس تعریف پر پھولی نہ سمائیں۔

آسیہ ماسی نے پھر رزمہ سرائی شروع کی۔

"آپا جی یہ باتیں تم ہی تک رہیں۔ کبھی آپس میں دل میں فرق آئے۔ رئیس لوگوں کی بات بڑی ہوتی ہے آج ہاتھ پکڑ کر نکالا۔ کل توپ کے منہ باندھ کر اڑا دیں تو کون غریبوں کو بچائے گا۔

آپا جی ہنس پڑیں۔

"ہے کسی کی مجال آسیہ! جو توپ کے منہ باندھنا کیسا، ہاتھ بھی لگا سکے۔ تم ہی تھیں جو چپ ہو گئیں۔ عزت ہتک کا آج عدالت میں دعویٰ کر دو تو چوکڑی بھول جائیں۔ سب ریاست دھری رہ جائے گی۔"

آسیہ ماسی بولی!

"جانے دو آپا جی۔ اب کیا عدالتیں کرتی پھروں گی۔ عدالت میں بھی امیری کی چلتی ہے۔ ہر ایک بات میں میں کہتی ہوں امیری کا تو ڈھونگ رچا ہوا ہے۔ لیکن گھر میں خاک اڑتی ہے۔ بھلا ایسی کمائی میں برکت تھوڑی ہوتی ہے ...... تھال پر تھال چلے آتے ہیں۔ ٹوکرے ں پھل۔ مٹھائی۔ اپنی آنکھوں کے سامنے آتے دیکھے۔ لیکن کبھی اُلٹ کر بھی نہ پوچھا کہ کون دے جاتا ہے۔ مفت کا مال کھا کھا کر دل بھی تو سیاہ ہو گیا ہے۔ برا نہ مان جانا آپا جی! تمہاری آپس کی بات ہے۔ میرے منہ سے اُلٹی سیدھی نکلے جاتی ہے۔

آپا جی زیر لب مسکرائیں۔

"اس میں بُرا کیا ماننا آسیہ سچ بات پر کہیں پردہ پڑ سکتا ہے۔ کوئی اپنے ناطے کا ہو یا غیر ہو ایک تمہارا منہ بند کر دیا تو سارے جگ کا منہ کیسے بند ہو سکتا ہے۔ سارے شہر کو اُن کے گن معلوم ہیں۔ ایک جلے گھر سے ہی ہر بات چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکی کی بات بھی تمہارا بھلا ہو کہ آج تم سے پتہ چل گیا ورنہ ہم سے تو یہی کہا کہ لڑکے کا گھرانہ اچھا نہ تھا اس لئے منگنی توڑ دی اور رشوت کی بات تو گلی کا بچہ بچہ جانتا ہو گا۔

آسیہ ماسی وہاں سے اٹھ کر شاداں فرحاں اپنے گھر چلیں ان کے گھر کے بالکل برابر ہی کرنل رحمان کا شاندار فلیٹ تھا۔ فلیٹ کے سامنے آتے ہی آسیہ ماسی کا کھلا ہوا چہرہ پھر سکڑ گیا کرنل صاحب

انہیں بغض للّہی تھا۔ محلہ بھر میں صرف یہی ایک گھر ایسا تھا جہاں آسیہ ماسی کی آمد و رفت نہیں تھی اور یہی وجہ تھی کہ باوجود کوشش بسیار اس گھر کے مکینوں کے حالات ہنوز تاریکی میں تھے۔ آسیہ ماسی کا جذبۂ تجسس پسندی ان کو کشاں کشاں فلیٹ تک لے کر گیا بھی لیکن ایک تو خوفناک کتے کی شکل دوسرے دربان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر انہیں زینے سے آگے بڑھنے کی ہمت کبھی نہ ہو سکی۔ تاہم ہر وقت کے مشاہدے سے جو باتیں معلوم کر سکیں وہ صرف یہ کہ کرنیل صاحب کی بیوی دن رات نماز اور وظیفہ و ظائف میں لگی رہتی ہیں۔ کرنیل صاحب حد درجے غصہ والے ہیں۔ زندگی کا سرمایہ وہ سمجھتے ہیں۔ لڑکا عثمان فوج میں کپتان ہے جس کو خود آسیہ ماسی نے اکثر موٹر میں آتے جاتے دیکھا اور وہ لڑکی اس کی بہن سلمیٰ ہے جو ہر صبح موٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوتی ہے۔

اور سلمیٰ تو سچ مچ ایک کھلا ہوا پھول تھی۔

چاند کی طرح اجاگر چہرہ۔ سیمیں تن۔ شمشاد قامت۔

کرنیل صاحب سے انتہائی نفرت کے باوجود آسیہ ماسی سلمیٰ کے حسن کے بارے میں قائل ہوئے بغیر نہ رہی۔

حسب معمول ایک صبح آسیہ ماسی اپنے مقررہ گشت پر روانہ ہو رہی تھیں کہ ان کی نظروں کو ایسا دھوکا ہوا جیسے کوئی ان کی نظر بچا کر کرنیل صاحب کے کوٹھے پر چڑھ رہا ہو۔

عقاب دیدہ آسیہ ماسی نے فوراً تاڑ لیا۔ لپک کر زینے میں دیکھا اور حیرت سے بولیں۔

آئیں ؟ ؟ ؟ شرفو ؟ ؟ ؟

اور وہ واقعی شریف الحسن ہی تھا جسے پیار سے سب شرفو، شرفو کہا کرتے تھے...... شرفو ایک بہت ہی خوبرو طرح دار بگڑا ہوا رئیس زادہ تھا۔ ماں باپ ایک کثیر جائیداد چھوڑ کر دنیا سے چل بسے تھے۔ ان کے مرتے ہی تعلیم کو خیرباد کہہ کر اس رنگیلے نے دو تین سال میں جائیداد شراب اور عیاشی کی نذر کر دی۔ بہادری کے باوجود بھی آوارہ گردی۔ رنگ رلیوں۔ گلی کوچوں میں سیر گشت اور سنیما بینی کے مشاغل میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ ہر وقت بنا ٹھنا اِدھر اُدھر چکر کاٹتا رہتا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ شرفو

کس درجہ بدمعاش لڑکا ہے۔ لیکن اس کے باوقار انداز۔ وجاہت و رعنائی۔ بڑی بڑی نشیلی آنکھیں دیکھ کر ہر شخص اپنے دل میں اس کے لئے کچھ نہ کچھ جگہ پاتا۔

آسیہ ماسی کو جھانکتے دیکھ کر شریف الحسن مسکرا پڑا اور تیزی سے نیچے اتر کر بولا۔

"آنکھ مچولی کھیلو گی آسیہ ماسی؟"

آسیہ ماسی نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "کیوں کیا جس کے ساتھ کھیلنے گئے تھے اُس نے منع کر دیا"

"کس کے ساتھ"؟ شرفو گھبرا کر بولا۔

"اوہو۔ اب ایسے بھولے بن گئے۔ پہیلیاں بجھوانے لگے"

"اونہہ نہ جانے کیسی باتیں کرتی ہو"

ہاں جی... ی.... ی — میں تو کیسی باتیں کرتی ہوں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ سلمہ بیگم پہ مہربانی ہے آج کل۔ جب ہی تو وہ دیر سے اوپر کٹہرے سے لگی کھڑی تھی۔

"ارے ارے آسیہ ماسی! کیا جوتے کھلواؤ گی۔ میرے فرشتوں کو بھی سلمہ کی خبر نہیں"

فرشتوں کو نہیں پر تمہیں تو ہے..... شرفو بیٹا میں کہتی ہوں کیوں اپنی زندگی برباد کر رہا ہے۔ کیوں ماں باپ کی روح کو تکلیف دیتا ہے۔ یہ من موہنی صورت اور حسن اور تیرے یہ گن"

"خواہ مخواہ سر ہوتی ہو آسیہ ماسی" وہ کچھ جھینپ کر بولا۔ "میں تو تمہیں دیکھ کر ہنسی ہنسی میں چھپا تھا..... کھڑی ہو گی وہ بھی اتفاق سے کٹہرے پر، تو میں کیا کروں....."

آسیہ ماسی ہنسی سے دوہری ہو گئیں۔ انتہائی شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔

"ارے میرے چاند! میں تجھے کچھ کہہ تھوڑی رہی ہوں۔ میں تو آج کل کی چھوکریوں کے رنگ ڈھنگ کو کہتی ہوں۔ جب وہ خود ہی رعب انوپ دکھانے سامنے کھڑی ہو جائیں تو کیا تم آنکھیں تھوڑی بند کر لو گے...... جب انہیں خود ہی گلی بازار کے لوگوں کی شرم نہیں تو پھر تم تو ٹھہرے مرد اور لڑکی کا کیا ہے یوں کہو ماں باپ ہی کو نام کی لاج نہیں تو دوسرے کو کیا خیال..... مجھے تو تیری فکر ہے بیٹا۔

میں تو کہتی ہوں اس چھلاوے کا رو‌گ نہ پال — تو کیا جانے اس کے باپ کا غصہ۔ دیکھ پایا تو جیتا نہ چھوڑے گا۔..... زری میں زری کا پیوند لگتا ہے۔ آسمان کی پریوں پر ڈورے ڈالنے سے بھلا کیا ملے گا شرفو!

شرفو اس تمام تقریر کے جواب میں صرف خفیف سی مسکراہٹ لبوں پر لا سکا۔ پھر بیزاری سے بولا۔

"اچھا اور کچھ پیوند ڈورے لگانے ہیں یا اب جاؤں"

"بڑا شیطان ہے" ماسی نے اسے شفقت آمیز انداز میں دھکیلتے ہوئے کہا.......

"میں نے کیا پکڑ رکھا تھا۔ بیٹا جا۔ میرے کہنے کا برا مت مانیو"

شرفو لا ابالی انداز سے سیٹی بجاتا گلی کے کونے پر مڑ گیا اور آسیہ ماسی کو اتنی اہم خبر سینے میں چھپا کر سامنے کے گھر تک جانا دشوار ہو گیا...... خوب نمک مرچ لگا کر اور حاشیہ چڑھا کر شرفو کا گلی کے چکر کاٹنا۔ ماسی کو دیکھ کر چھپ جانا۔ سلمہ کا کٹہرے پر ٹہلنا — مسکرانا — ہمت افزائی کرنا۔ شرفو کے مجرمانہ انداز — غرض ایک ایک واقعہ گھنٹوں مزے لے لے کر سنایا۔ کس طرح ماسی نے عین موقع پر اسے پکڑ کر شرمندہ کیا۔ تادیب و تنبیہ کی۔ سمجھایا بجھایا۔ محلہ کی عزت کے واسطے دیئے اور نہ جانے کیا کیا۔

اپنے گھر پہنچتے ہی ماسی پکاریں:

ناصرہ!" کہاں ہے ناصرہ بیٹی...... سنی تو نے شرفو کی بات"

ناصرہ کا رنگ فق پڑ گیا۔

جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے شرفو کی تصویر اپنے تکیہ کے غلاف میں چھپا دی اور چہرے پر چمک پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہوئی باہر آ کر بولی۔

"کونسی بات ماں"؟ !!

"اری اب وہ سلمہ پر ڈورے ڈال رہا ہے"

ناصرہ نے اطمینان کا سانس لیا اور بے تعلقی سے بیزار ہو کر بولی۔

"اونہہ ہمیں کیا کوئی کچھ بھی کرے"

لیکن ناصرہ کی بات ناصرہ کے ساتھ۔ آسیہ ماسی کی سرشت بھلا کیسے بے تعلقی اختیار کر سکتی تھی۔ خصوصاً اس حالت میں جبکہ ان کی معلومات میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اکثر شرفو کو کرنیل صاحب کے گھر کے سامنے آتے جاتے دیکھتی تھیں۔ گھر کے قریب ہونے کے باعث معلومات کا حاصل کرنا بھی سہل۔

آسیہ ماسی کو تو بس ذرا سا اشارہ کافی تھا۔ باقی قیاس آرائی تو وہ خود کر ہی لیتی تھیں اور اب شرفو کی آمد و رفت سے ان کا شبہ یقین کو پہنچ چکا تھا کہ کرنیل صاحب کی عزت پر بس اب کوئی دن میں بٹہ لگنے ہی والا ہے۔

اس کے تصور ہی سے ان کا دل مسرت سے کھل جاتا۔

شام تک وہ جعفری صاحب کے یہاں بیٹھی کرنیل صاحب کی بیٹی کی "کارستانیاں" مزے لے لے کر بیان کرتی رہیں۔ جس وقت وہ گھر کی جانب روانہ ہوئیں جھٹ پٹا سا ہو چلا تھا۔ عین موڑ پر کرنیل صاحب کے گھر کے قریب سے ایک تانگہ چلا آرہا تھا۔ تانگہ پر پردہ بندھا ہوا اور اگلی پچھلی نشستوں کے درمیان بھی اس طرح پردہ باندھا تھا کہ اندر بیٹھی سواری نظر نہ آسکے۔ اگلی نشست پہ بیٹھے ہوئے مرد کو ماسی نے غور سے دیکھا اور پہچان کر پکاریں۔

"ایں ؟ ؟ ؟ شرفو ؟ ؟ ؟"

شرفو کا خون رگوں میں منجمد ہو گیا۔ چہرہ سفید اور ہاتھ پیر سُن پڑ گئے۔

جھک کر اس نے تانگہ والے کے کان میں کچھ کہا اور گھوڑا سرپٹ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

نکتہ سنج ماسی وقت کی نزاکت اور معاملہ کی اہمیت کو تاڑ گئیں۔ کرنیل صاحب کی اونچی ناک آخر ان ہی کے قدموں پر کٹ کر گری نا ؟ ؟ ؟

مصنوعی اضطراب سے وہ دو چار گز تانگے کے پیچھے گلا پھاڑ کر چیختی دوڑیں۔

"شرفو...... ارے شرفو..... کیا غضب کرتا ہے سنبھلیئے"

لیکن تانگہ چشم زدن میں نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ پھر جیسے پست ہوکر لپکتی ہوئی پنواڑی کی دوکان پر آئیں اور لسورتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولیں۔

"غضب ہوگیا بھیا... خدا کے لئے دوڑو..... تانگے کے پیچھے.... اس تانگے کے پیچھے..... پردہ بندھ رہا ہے اس میں...... وہ چانگے کا شرفو کرنیل زادی کو لے اڑا۔ محلہ کی بیٹی کا معاملہ ہے......اپنی عزت ہے"

پنواڑی بے تحاشہ تانگہ کے پیچھے لپکا اور اس کے ساتھ ہی آس پاس کے دوکاندار اور ماسی ہانپتی کانپتی لرزتی کرنیل صاحب کے گھر جاکر پکاریں۔

"خدا کے لئے دوڑو.... تمہاری عزت پر ڈاکہ پڑ گیا بڑی بیگم..... کرنیل زادی.... بیٹیا کہاں ہے کچھ خبر بھی ہے"

بڑی بیگم نماز میں مشغول تھیں۔ ایکدم دہشت زدہ ہوکر اٹھیں اور ہکا بکا ہوکر ہکلاتی ہوئی بولیں۔

"کس کو..... سلمہ کو پوچھتی ہو.....؟"

"ہاں ہاں بٹیا کو پوچھتی ہوں۔ گھر پر ہیں کہ کہیں گئی ہیں"

"ابھی کچھ دیر ہوئی سہیلی، کے گھر کے لئے کہہ کر گئی ہے"

"بڑی بیگم.... معاف کرنا...... وہ.... وہ کمبخت شرفو تمہاری اس بھولی بھالی کو پھندے میں پھنسا کر لے بھاگا...... بھاگتی چلی آرہی ہوں"

ابھی ابھی میں نے تانگے میں دونوں کو جاتے دیکھا ہے دونوں کو"

ماں پر بجلی سی گر پڑی۔

اندر کمرے سے کپتان عثمان گرجا ــــ "کیا؟"

ماں تھرتھر کانپتے ہوئے چلائی "ارے عثمان! دوڑ۔ وہ کرموں پھوٹی کلنک کا ٹیکہ لگا گئی۔ دوڑو کوئی

کے بدمعاش شرفو کے ساتھ بھاگ گئی۔"
عثمان کی آنکھوں میں غصہ سے خون اتر آیا۔ جواب دینے سے پہلے وہ پولیس کو ٹیلیفون کرنے بھاگا۔
ماں نے ہاتھ سے رسیور چھین کر زمین پر پٹک دیا۔
"دیوانہ ہوا ہے..... پولیس کو معاملہ دے کر بالکل ہی ناک کٹوائے گا۔"
عثمان دیوانوں کی طرح ریوالور کی طرف بڑھا اور گرج کر بولا۔
"گولی سے اڑا دونگا دونوں کو"
ماں دوڑ کر اس کے بازو سے لپٹ گئی۔
"باؤلے مورکھ! کہیں دنیا میں منہ دکھانے کو جگہ رکھے گا بھی یا نہیں یا سڑک پر ہی باپ دادا کے نام کی توپ داغے گا۔ موٹر میں بیٹھ کر دوڑ جلدی۔"
"کتنا ہی کہا..... کتنا ہی کہا" وہ بھرائی ہوئی آواز میں سر پیٹ کر کہنے لگیں۔
"کہ اب بیاہ کر دو اس کا۔ پر کان پر جوں نہ رینگی۔ اب مل گیا نہ پھل اس کا"
شدت رنج والم سے ان کا سر گھومنے لگا اور وہ چکرا کر دھم سے زمین پر گریں۔

---

عثمان نیچے لپکا اور ساتھ ہی آسیہ ماسی۔
"ابھی گھاٹ والی سڑک تک مشکل سے پہنچے ہوں گے۔" آسیہ ماسی موٹر میں بیٹھے ہوئے بولیں۔
اور عثمان نے جواب دئیے بغیر پوری رفتار سے موٹر کو گھاٹ والی سڑک پر چھوڑ دیا۔
اس کے دماغ میں آگ سی لگ رہی تھی۔ آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں پر تشنج سا طاری تھا۔
زیریں لب کو دانتوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا کہ یکایک تانگہ سامنے نظر آیا۔
بنواڑی اور دو ایک دوکاندار بھی چیختے چلاتے پیچھے دوڑتے چلے جاتے تھے۔
عثمان فراٹے سے موٹر کو اُن کے برابر سے نکال کر لے گیا اور ڈپٹ کر کپتان کی شان سے پکارا۔
"تانگہ روکو"!!!

"روک لو تانگہ" !!!

اور ساتھ ہی ایک جھٹکے کے ساتھ موٹر بالکل تانگے کے پہیے سے ٹکراتی رک گئی۔ آسیہ ماسی لرزتی ہانپتی اتریں۔

عثمان وحشیوں کی طرح لپکا اور بد حواس شرفو کو بے دردی سے تانگہ سے گھسیٹ کر بے تحاشا ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔ پھر اسے دھکیل کر تانگہ کا پردہ پوری طاقت سے نوچ پھینکا۔

لیکن اس کے حواس مختل ہو گئے۔ کیونکہ وہاں تو ایک اور ڈری سہمی اجنبی لڑکی بیٹھی خوف سے تھر تھر ہانپ رہی تھی۔

تعاقب کرنے والی ٹولی نے ایک زور دار قہقہہ بلند کیا

عثمان مجنونانہ انداز سے پیچھے مڑا۔

"ناصرہ!!!" آسیہ ماسی کی چیخ فضا میں گونجی۔

اور وہ چکرا کر دھم سے عثمان کے قدموں میں آ رہی۔

اختر قریشی

---

# اپنا حافظہ تیز کیجئے

(۳)

کسی چیز کے حاصل کرنے کے دو راستے ہوتے ہیں: ایک سائنٹی فک اور آسان راستہ ہوتا ہے۔ اس میں خرچ کم ہوتا ہے اور محنت بھی کم ہوتی ہے۔ اور دوسرا مشکل اور غیر سائنٹی فک طریقہ ہوتا ہے۔ اس میں وقت بھی بہت لگتا ہے اور خرچ بھی زیادہ ہوتا ہے، محنت بھی زیادہ ہوتی ہے اور پھر بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ گوہر مقصود ہاتھ آئے گا بھی یا نا امیدی اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

دوسرا راستہ وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو سائنس کی ترقیوں کے قائل نہیں ہیں۔ حالانکہ لوگ سائنس کے کرشموں سے خود فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً ریل، تار، موٹر، ہوائی جہاز، ریڈیو اور بیشمار سائنس کی چیزوں سے خود فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر رٹ یہی لگائے جاتے ہیں کہ سائنس بالکل ڈھکوسلا ہے۔ جو کچھ تھا، پچھلے زمانہ میں تھا، اور وہی "دقیانوسی" طریقے صحیح ہیں۔ ان میں ذرا سا رد و بدل کرنا منع ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ دنیا میں تین قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جن کے دماغ میں رتی بھر بھی فاسفورس نہیں ہے وہ تو ترقی کے اصولوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ان کا تو سرے سے دماغ ہی کمزور ہے۔ دوسرے وہ جو ان کے متعلق سننا پسند نہیں کرتے۔ ان کے دماغ میں بیشک صلاحیت ہے۔ مگر وہ اس قدر متعصب ہوتے ہیں کہ ایک لفظ بھی سائنٹی فک طریقوں کے حق میں، اور دقیانوسی طریقوں کے خلاف ان سے کہا جائے تو ان کو ناگوار سا گزرتا ہے۔ اپنے تعصب کی وجہ سے وہ اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتے جس ڈھچر پر قائم ہیں اسی پر قائم ہیں۔ لکیر کے فقیر ہیں۔ اسی لکیر کو ان کی چرخ چوں ایسی چلتی ہے۔ سائنٹی فک ایجادیں ہوائی جہاز کی تیز رفتاری کو اپنی آنکھوں سے

دیکھتے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

تیسرا گروہ وہ ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ ہر چیز کے متعلق گزشتہ زمانے کی نسبت انسانی علم کئی ہزار گنا بڑھ گیا ہے مگر عقل بہت کم بڑھی ہے جس چیز کی ہم کو سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ عقل ہے۔ اس گروہ کے مرد اور عورتیں عقل کی باتوں اور عقل کے سائنٹیفک طریقوں کی تلاش میں رہتے ہیں خواہ وہ کیسے ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں۔ وہ یہ بات جانتے ہیں کہ انسانی دماغ میں دو ارب سے زیادہ خانے ...... (Brain Cells) ہیں اور ہم ان کا بہت ہی تھوڑا سا یعنی از حد خفیف سا حصہ استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے باوجود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے دماغ میں ابھی بہت زیادہ عقل حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ وہ ہر قیمت پر اس قسم کے مضامین پڑھنے، اور ایسی باتیں سننے کے، جو عقل میں اضافہ کریں از حد مشتاق رہتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم سو رہے ہیں، اور ہم کو جھنجوڑ کر جگانے والا، ہم پر احسان کر رہا ہے۔

جس نے یہ سمجھ لیا کہ مجھ کو سب کچھ آتا ہے اسے کچھ نہیں آتا۔ اس کے برخلاف جس نے یہ سمجھا کہ مجھے تو بہت ہی کم معلومات ہے اور جیسا کہ بجلی کے موجد اور دنیا کے سب سے بڑے سائنسدان نے اپنی آخر عمر میں کہا تھا۔

"میں تو علم کے سمندر میں سے ایک بوند بھی نہیں پی سکا اور یہ بات میں آخر عمر میں سمجھ سکا ہوں کہ علم سے زیادہ ہم کو عقل کی ضرورت ہے"۔

چنانچہ تیسرے گروہ کے مرد اور عورتیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے، عقل بڑھانے والے علمی مضامین ایسے شوق سے پڑھتے ہیں، جیسے کوئی کئی دن کا بھوکا کھانا کھاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ ترقی پسند ہیں اور خواہ آپ وزیر اعظم ہیں یا اسکول کے طالب علم، آپ اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ علم کی، عقل کی، اور موجودہ حالت سے ترقی کرنے کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ اس قسم کے مضامین، جن کے پڑھنے سے علم کے ساتھ ساتھ عقل بھی بڑھتی ہو، بڑے شوق سے مطالعہ کرتے ہوں گے۔

# افسوس کرنا بیکار ہے

جو شخص اپنے حافظے کی کمزوری پر افسوس کیا کرتا ہے۔ وہ اپنا وقت ضایع کرتا ہے اور جو شخص اس پرانے طریقے پر یقین رکھتا ہے کہ حلوے یا خمیرے کو کھا کر اس کا دماغ روشن ہو جائے گا۔ وہ بھی تقریباً اپنا وقت ہی ضایع کرتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ یہ یقین رکھتے ہوں گے۔ کہ سائنٹی فک طریقوں سے ضرور آپ کے دماغ میں طاقت آ سکے گی۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کا حافظہ بہت تیز ہو جائے گا۔

**خود اعتمادی بہت بڑی چیز ہے** فرانسیسی سائیکولوجسٹ موسیو کوئے (M. Cue) لکھتا ہے:

"جب تم کوئی کام انجام دینا چاہو، جو عقل کے دائرے کے اندر ہو۔ تو وہ خواہ کیسا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ تم یہ سمجھو کہ وہ حد درجے آسان ہے۔

اس بات کی پرواہ نہ کرو کہ دوسرے اس کو از حد مشکل سمجھتے ہیں۔ ان کے لئے مشکل یا محال ہے تو ہوا کرے، تمہارا اپنا فرض یہ ہے کہ تم اُس کو آسان سمجھو۔ اس کے برخلاف اگر تم اُس کو مشکل یا ناممکن سمجھوگے، تو تمہارے لئے بھی وہ ناممکن ہو جائے گا۔"

موسیو کوئے کی تحقیقات پر یقین رکھتے ہوئے آپ اپنے دل میں یہ بات بٹھا لیجئے کہ دماغ کو طاقتور کرنا اور حافظے کو تیز کرنا (اوروں کے لئے مشکل ہو تو ہو) مگر آپ کے لئے بہت ہی آسان ہے۔

موسیو کوئے نے تحت الشعور نفس (Sub-Concious Mind) کی بیس سال تک تحقیقات کی ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ ہمارا تحت الشعوری نفس از حد طاقتور ہے۔ ہمارا تحت الشعوری نفس علی بابا کے "جن" کی طرح ہماری فرمانبرداری کرتا ہے اور ہمارے احکامات بجا لاتا ہے۔

موسیو کوئے کی دوسری تحقیقات یہ بھی ہے کہ تحت الشعوری نفس از حد بیوقوف بھی ہے۔ ہم اس سے خواہ کچھ ہی کہدیں خواہ وہ واقعات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، ہمارا تحت الشعوری نفس اُسے فوراً قبول کر لیتا ہے۔

چونکہ یہ نفس بیوقوف بھی ہے، اور از حد طاقتور بھی ہے۔ اس لئے ہم اس سے اپنے فائدہ کا کام

لے سکتے ہیں۔

**خود کو مشورہ دینا** | جب ہم کوئی بات خود اپنے تحت الشعوری نفس سے کہتے ہیں تو اس کو سائنٹفک زبان میں خود کو مشورہ دینا یا آٹو سجیشن (Auto - Suggestion) کہتے ہیں۔ حافظے کو تیز کرنے کے معاملے میں، خود کو مشورہ دینا بھی بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم چند نمونے کے مشورے لکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک یا دو مشورے جو آپ کے حسب حال ہوں ان کا انتخاب کر لیجیئے۔ اور رات کو سوتے ہوئے بیس بیس مرتبہ، آہستہ آہستہ مگر سمجھ سمجھ کر اپنی زبان سے ادا کیا کیجیئے۔ اور بالکل اسی طرح صبح کو۔ نمونے کے مشورے یہ ہیں:-

(۱) حافظہ تیز کرنے کے لیئے میں اپنے دماغ کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا کرتا ہوں۔

(۲) میرا دماغ ہر چیز کے نہایت گہرے اثرات قبول کرتا ہے۔

(۳) میرا حافظہ نہایت طاقتور ہے اور اس سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

(۴) ہر چیز کو، جس سے مجھے واسطہ پڑتا ہے میں بہت ہی اچھی طرح یاد رکھتا ہوں۔

(۵) آج جو نام یا چہرہ میرے سامنے آئے گا اسے میں بہت اچھی طرح یاد رکھوں گا۔ کل کا اللہ مالک ہے۔

(۶) خداوند کریم کے فضل و کرم سے روز بروز میرا حافظہ تیز ہوتا جاتا ہے۔

**سلطان بابو** "جناب آپ نے چھ مشورے لکھے ہیں ہم کو تو سبھی اپنی اپنی جگہ بڑے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تو فرمایئے کہ ان میں سے سب سے ضروری کونسا ہے۔ جسے ہم آج ہی رات سے شروع کر دیں۔

مسٹر میمن۔ مسٹر مورلیسن کی اجازت سے میں اس کا جواب دینا چاہتا ہوں۔

مسٹر مورلیسن۔ ہاں ضرور۔

مسٹر میمن۔ مجھ کو تو چھٹے نمبر کا مشورہ سب سے زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مسٹر مورلیسن۔ "بے شک آپ کی رائے صحیح ہے" مشورہ ۶ از حد ضروری ہے، یہ تو ہونا ہی چاہیئے۔ اس کے ساتھ ایک اور ملا لیا کرو"

سلطان بابو۔ "کیوں جناب اگر ہم چھ مہینے تک صبح شام اسی طرح مشورے دیئے جائیں تو کیا رہیگا"

مسٹر مورلیسن "بڑا لاجواب۔ آپ کا حافظہ بڑا تیز ہو جائے گا"

سلطان بابو۔ "جناب آپ بزرگ ہیں، آپ کے فرمانے سے ہم یہ نظریہ قبول کر لیتے ہیں، مگر آپ نے فرمایا تھا کہ اپنا اطمینان کرنے کے لیئے دل کھول کر سوالات کر لیا کرو۔ اگر سائنس کے پاس جواب ہوگا تو دیدیا جائے گا۔ اور اگر سائنس نے "خاصیت" کہہ کر ٹال دیا تو اللہ کی مرضی"

مسٹر میمن۔ "دیکھئے اس کے متعلق عرض کروں مسٹر کوئے کا نظریہ اس طرح نہیں ہے۔ بلکہ کوئے صاحب یہ لکھتے ہیں:-

> اگر تختہ میں ایک کیل جڑی ہوئی ہو اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ کیل تو نکل جائے، اور اس کے بدلے دوسری کیل قائم ہو جائے، تو ہم کو چاہیئے کہ پہلی کیل کے اوپر دوسری کیل رکھ کر زور سے ٹھوکیں، اس طرح پہلی کیل تو نکل جائے گی، اور اُس کے بدلے دوسری کیل قائم ہو جائے گی"

اقلیدس۔ "شاباش! آپ سائیکولوجی خوب سمجھتے ہیں"

سلطان بابو۔ "تو جناب اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے دل یا سائنٹفک زبان میں یہ کہنا چاہیئے کہ ہمارے تحت الشعوری نفس میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ ہم بھلکڑ ہیں۔ جب ہم خود اپنے کو یہ مشورہ دیا کریں گے کہ ہمارا حافظہ تیز ہے تو یہ بھلکڑپن کی کیل "ہمارے دل سے نکل جائے گی اور تیز حافظہ ہونے کا خیال اس کی جگہ جم جائے گا"

مسٹر مورلسین:- شاباش۔ بالکل ٹھیک ہے۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے دل میں تو یہ بات بیٹھ گئی کہ ہمارا حافظہ تیز ہے، مگر صرف دل میں بیٹھ جانے سے، فی الحقیقت حافظہ کیونکر تیز ہو جائے گا؟"

**حاجی اشفاق**:- بات یہ ہے کہ خیالات کا اثر جسم پر بھی ہوتا ہے۔ اگر کوئی بیمار آدمی فی الحقیقت یہ خیال اپنے دل میں جما لے، کہ میں روز بروز اچھا ہوتا جا رہا ہوں تو دوائیں سونے پر سہاگے کا کام دیں گی، بہت جلد اور بہت اچھا اثر پیدا کریں گی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مریض چاق و چوبند ہو جائے گا۔

مسٹر میمن۔ میں بھی حاجی جی کے خیال کی بڑے زور سے تائید کرتا ہوں۔ تمام ہندوستانی اور پاکستانی استاد پہلوان، اور خصوصاً سینڈو بھی جو مشہور انگریز پہلوان گزرا ہے، اس بات پر زور دیتے رہے ہیں، کہ آئینے کے سامنے ورزش کی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آئینے کے سامنے ورزش کرنے سے ہم کو یہ محسوس ہونے لگے گا، اور یہ بات ہمارے دل میں بیٹھ جائے گی کہ ہم میں روز بروز طاقت آتی جا رہی ہے اور روز بروز تندرست ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خداوند کریم کے فضل و کرم سے، جلد سے جلد تندرست بھی ہو جائیں گے۔

مسٹر مورلسین۔ یہ اور سمجھ لیجئے کہ ہمارا خیال ہمارے عمل پر کیوں کر اثر کرتا ہے۔ جب ہم کوئی کام کرنے کا خیال کرتے ہیں تو ہمارے خیال کی وجہ سے ہمارے جسم کا خون، متعلقہ اعضاء کی طرف خودبخود دوڑنے لگتا ہے مثلاً آپ مسجد میں نماز پڑھنے کا خیال کریں، تو آپ کے جسم کا خون، زیادہ مقدار میں، آپ کی ٹانگوں میں پہنچ جائے گا۔ اگر آپ کا مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کا خیال زیادہ طاقتور ہوگا تو آپ کے پیر خودبخود مسجد کی طرف اٹھ جائیں گے۔ اور بغیر کسی خاص کوشش کے، نہایت آسانی سے آپ مسجد میں پہنچ جائیں گے۔

بالکل اسی طرح اگر آپ یہ خیال کریں کہ شراب خانے میں جا کر شراب پئیں گے۔ تو اس حالت میں بھی خون آپ کی ٹانگوں میں پہنچ جائے گا۔ اور ٹانگیں آپ کو کھینچ کر شراب خانے میں پہنچا دیں گی۔"

مسٹر میمن نے شک۔ بے شک بالکل صحیح ہے۔ پہلے عالم خیال اور پھر عالم شہود۔ پہلے ایک چیز خیال میں آتی ہے، اور پھر اس کا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ خیال کرنے سے کہ ہمارا حافظہ روز بروز تیز ہوتا جا رہا ہے۔ خون خودبخود دماغ میں زیادہ مقدار میں پہنچنے لگے گا۔ جس طرح پہلوان جب یہ خیال دل میں

جمالیتا ہے کہ میرے ڈمنر روز بروز زیادہ طاقتور اور موٹے ہوتے جارہے ہیں تو اس کے جسم کے خون کی زیادہ مقدار ڈمنروں میں پہنچ جاتی ہے اور فی الحقیقت ڈمنر طاقتور ہو جاتے ہیں۔

جب خون کی زیادہ مقدار دماغ میں پہنچے گی تو دماغ کے خانے (Brain Cells) زیادہ فربہ ہو جائیں گے۔ خانہ فربہ ہونے کی وجہ سے دماغ خود بخود زیادہ طاقتور ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا خیال، گہرا سائنٹی فک مسئلہ ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس کو دو تین مرتبہ پڑھ کر اچھی طرح سمجھ لیں۔ قوت خیال سے بڑی اور اہم انسان میں اور کوئی طاقت نہیں ہے۔ اگر خیال کی طاقت نہ ہو، تو انسان ایسا ہے جیسے انجن، جس میں بھاپ نہ ہو، یا جیسے تار، جس میں بجلی نہ ہو۔

**حرکت حافظے میں مدد دیتی ہے** گذشتہ نمبروں میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ تصور کے ذریعے کسی چیز کو اس کے اصلی قد و قامت (size) سے بڑا دیکھنا دماغ پر نہایت گہرا اثر پیدا کرتا ہے، یعنی سنتے تو تھے کہ لوگ میل کا بیں اور تل کا پہاڑ بنایا کرتے ہیں۔ مگر چیزوں کے یاد رکھنے کے سلسلے میں یہ تل کا پہاڑ بنانا بڑا ضروری ہے۔ شلاً کسی آدمی کی شکل آپ یاد رکھنی چاہتے ہیں، تو اس کی شکل کو سو گنی بڑی تصور کے ذریعے دیکھئے۔ کسی پنسل کی شکل آپ یاد رکھنا چاہتے ہیں تو تصور کے ذریعے اس کو دلی کے قطب مینار کے برابر بڑا دیکھئے۔ اس طرح اس پنسل کا نہایت ہی گہرا نقش آپ کے دماغ پر پڑے گا۔ اور پنسل کی شکل و صورت، آپ کو بہت اچھی طرح یاد رہ جائے گی۔

آج کی صحبت میں ہم، تصور کے ساتھ ساتھ حرکت کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ حرکت ایک ایسی چیز ہے جو فوراً توجہ کو کھینچ لیتی ہے۔۔۔ مثلاً ہم ایک ہاتھ کو حرکت دے کر اٹھا لیتے ہیں، تو تانگہ والے کی توجہ فوراً ہماری طرف لگ جاتی ہے اور وہ تانگا ٹھیرا لیتا ہے۔

اچھے لکچراروں کو دیکھئے جب وہ لیکچر دے رہے ہوتے ہیں تو ہاتھوں کو عجیب عجیب طریقوں سے حرکت دیتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کی حرکت، حاضرین کی توجہ کو اور زیادہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ بندر کا تماشہ کرنے والا مداری بندر کو نچاتا ہے اور اس کے گرد ایک بڑا مجمع بندر کی یہ حرکتیں دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتا ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز جو حرکت میں ہوتی ہے، فوراً ہماری توجہ کھینچ لیتی ہے، اور دماغ پر بہت گہرا اثر کرتی ہے۔

آیئے میں آپ کو بتاؤں کہ آپ اس "حرکت" سے کیونکر آدمیوں کی شکلیں چیزیں وغیرہ، اپنے دماغ میں محفوظ رکھ سکتے ہیں، اور ان کو یاد رکھ سکتے ہیں۔

فرض کیجئے، آپ کسی گھوڑے کا حلیہ یاد رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ گھوڑا آپ نے آج ہی خریدا ہے۔ اگر خدا نخواستہ چوری ہو جائے اور شناخت کا موقع آجائے، تو اور گھوڑوں میں آپ کیونکر شناخت کر لیا؟

گھوڑے کو سو گنا، ہزار گنا، لاکھ گنا تصور کے ذریعے دیکھئے۔ ایک پہاڑ کے برابر بڑا دیکھئے۔ اب اس کو دوڑتا ہوا حرکت کرتا ہوا دیکھئے۔ یہ بھی دیکھئے کہ وہ سامنے کی دونوں ٹانگیں اونچی کئے الف کھڑا ہے۔

بڑا اور حرکت میں دیکھنے کی وجہ سے آپ اس کی شکل صورت، خد و خال، رنگ۔ اس کی ایال ٹانگیں، کھوتھنی وغیرہ نہیں بھول سکتے۔ اگر پچاس گھوڑوں میں بھی یہ گھوڑا ملا دیا جائے گا تو آپ فوراً شناخت کر کے اپنے گھوڑے پر ہاتھ رکھ دیں گے۔

آپ ایک مکان کی شکل یاد رکھنا چاہتے ہیں۔ وہی تصور کے ذریعے اس کو بہت بڑا دیکھئے۔ پھر دیکھئے یہ مکان ہوا میں معلق ہے۔ پھر اس کو ہوائی جہاز کی طرح اڑتا ہوا دیکھئے۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے سورج مشرق کے بدلے مغرب سے نکلنے لگے۔ مچھلیاں پانی کے بدلے خشکی میں پیدا ہونے لگیں۔ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا کہ آپ اس مکان کی شکل بھول جائیں۔

کیا آپ اُن صاحب کی شکل یاد رکھنا چاہتے ہیں، جن سے کل رات کو آپ کی کلب میں پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ وہی پُرانی ترکیب۔ پہلے اُن کی شکل کو تصوّر کے ذریعے بہت ہی بڑا دیکھئے۔ اتنا بڑا کہ ان کا سر بادلوں سے بس ذرا ہی نیچے ہو۔ اسی نسبت سے ان کے ہاتھ، پیر، اور کلہ جبڑا بھی ہو۔ جو لباس وہ پہنے ہوئے تھے۔ مثلاً کوٹ، کالر، ٹائی، ٹوپی وغیرہ، وہ بھی ان کے موجودہ "تصوری" قد و قامت کے لحاظ سے مناسب ہو۔ اب ان کے برابر ایک بہت ہی بڑا "تصوری" درخت دیکھئے۔

درخت اتنا بڑا ہو کہ اس کی پھننگ بادلوں سے لگتی ہو اور جڑ اور شاخیں بھی اسی تصوری حساب سے متناسب ہوں۔

اب آپ ان صاحب کو "حرکت" دیجئے یہ اس درخت پر چڑھیں۔ اور ایک شاخ "دوسری شاخ پر اس طرح چھلانگیں مارتے پھریں جس طرح بندر چھلانگیں مارتا ہے۔

اب ان ہی صاحب کو ہوا میں معلق دیکھئے۔ پھر ان ہی کو ہاتھ اور ٹانگیں چلاتے ہوئے ہوا میں اڑتا دیکھئے۔

کیا آپ ان کو تصور کے ذریعے مندرجہ بالا طریقے سے "حرکت" میں دیکھ سکتے ہیں؟ ہاں ضرور کیوں نہیں دیکھ سکتے۔

دماغی طاقت کی کوئی حد نہیں ہے۔ ممکن ہے ابتدا میں آپ کو کچھ دقت پیش آئے۔ مگر استقلال اور مشق دونوں بہت بڑی چیزیں ہیں۔ تھوڑی سی مشق سے آپ کو عادت ہو جائے گی اور پھر اس قسم کے تصورات قائم کرنے کے لئے بس دو، تین سکینڈ کا سلسلہ رہ جائے گا۔

اس قسم کے تصورات قائم کرنے کی مشق آپ روزانہ کرسکتے ہیں مثلاً یونہی ایک شخص کی شکل کو تصور کے ذریعے بہت بڑا دیکھا۔ پھر اسی کو بہت بڑی سائیکل چلاتے ہوئے دیکھا۔ ذرا آگے چل کر وہ سائیکل پر سے گر گیا اس کے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ یا ایک شخص کو اس کے نہایت بڑے "تصوری" قد میں دیکھا تیز ہوا چل رہی ہے۔ ہوا میں اس کی نہایت بڑی "تصوری" ٹوپی اڑ گئی۔ پھر وہ ٹوپی سڑک پر ہوا کی وجہ سے "گول" چل رہی ہے۔ اس قسم کے واقعات روزانہ سڑکوں پر دیکھنے میں آتے رہتے ہیں اس سے تصور آپ بڑی آسانی سے کرسکتے ہیں۔

جس طرح جسمانی ورزش کرنے سے جسم میں طاقت آتی ہے اسی طرح ورزش کرنے سے دماغ طاقتور ہوتا ہے۔ تصور کے ذریعے آپ دماغ کو طاقتور کرسکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دماغ طاقتور ہوگا تو حافظہ خود بخود تیز ہو جائیگا۔

آئندہ صحبت میں ہم آپ کو بتائیں گے کہ جس طرح باقاعدہ امریکی دفتروں میں فائل رکھے جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح آپ اپنے دماغ میں کیونکر فائل رکھیں۔

(کاپی رائٹ بحق مضمون نگار محفوظ) ایس۔ اے۔ خالق (ایڈیٹر روپیہ اخبار۔ دہلی)

# اے باپ

شب کو جب ہوتا ہے حاصل فکرِ دنیا سے فراغ　　یادِ عہدِ رفتہ سے معمور ہوتا ہے دماغ
اس تماشاگاہ میں کل واقعاتِ رنج و فرح　　گھومنے لگتے ہیں چلتی پھرتی تصویروں کی طرح
دیکھ کر چھن جانے والے گوہرِ نایاب کو　　دیکھ کر چھپ جانے والے روئے عالمتاب کو
شعلہ زن ہوتا ہے دل پہلو میں انگارے کی طرح　　پردہ گر ہوتا ہے رخ پر اشک سیارے کی طرح
کھینچتی ہوں سینۂ سوزاں سے آہ پُر شرر　　کہنے لگتی ہوں سوئے گردوں اٹھا کر چشمِ تر
سچ بتا دے ماہتاب اے عابدِ شب زندہ دار　　تو نے دیکھا ہے کبھی مجھ سا حزیں مجھ سا فگار
جیسے بادِ شرطہ سے کج روی کشتی کی دور　　انتقالِ ذہن سے لیتا ہے جائے غم سرور
اے دلِ ناداں نہیں ہے وجہ تاروں کی چمک　　تیرے اوپر خندۂ دنداں نما ہے اور فلک
لیلیِ شب کھا کے آنکھوں کی سیاہی کی قسم　　کہہ رہی ہے تجھ سے روشن بخت ہیں دنیا میں کم
ہاں مری مونس ہے وہ جانِ گرانقدر و عزیز　　ہفت کشور کے خزائن جس کے آگے ہیں پشیز
جس کا رخ مرہم ہے زخمِ فرقتِ احباب کا　　بوسۂ شیریں ہے جس کا تلخیِ غم کی دوا
جس کی جاں ہے میری فکرِ منفعت کی مستقر　　جس کا دل ہے میرے غم کے سامنے سینہ سپر
مجھ پہ جب حاصل تفوق ہے، شرف ہے، مجد ہے　　علم و دانش ہیں تجارب ہیں وسائل ہیں اسے
جب اسے ہر دم ہے میرے رنج و راحت کا خیال　　مضطرب کیوں مجھ کو رکھے اپنی حالت کا خیال

---

اے مرے پیارے! مرے بے انتہا پیارے پدر　　کیا نہیں تجھ کو مرے جوشِ محبت کی خبر
تو نظر آتا ہے پاک و برتر و دلکش مجھے　　ساری دنیا، سارے عالم، ساری مخلوقات سے

تیری الفت، تیری طاعت، تیری تعلیم صفات — میری راحت، میری جنت، میری تدبیر نجات

حق رسی کی کعبۂ مقصود! تیرا دل ہے راہ — تیرے طوف رخ سے پاتی ہے ثواب حج نگاہ

باپ ہو گر وجہ حیرت خو میں شیطاں کیلئے — حاملان عرش سے افضل ہے انساں کیلئے

پھر مری نظروں میں ہوگی تیری وقعت کس قدر — اے صفا کیش! اے ملک خو! غور کر اندازہ کر

حشر سے پہلے جہاں میں "شور نفسی" ہے بپا — ہے نہاں ہر شخص کی الفت کی تہ میں مدعا

دوست حسن خلق کے محکوم دولت کیلئے — خویش الفت بھر کے پیلک لیاقت کیلئے

پر غرض سے بے غرض ہے تیری شفقت اے پدر — مجھ سے تو میرے لئے رکھتا ہے الفت اے پدر

گر مری تخمیر خو پھیلائے ہر سو برہمی — تیری الفت میں نہ آئے گی۔ نہ آئے گی کمی

ڈر نہیں میری روش سے نفس کو آفات کا — ڈر ہے تیرا اور خدائی ذات کا زنجیر پا

تیرے ڈر سے وقف حفظ جسم و جاں رہتی ہوں میں — تیرے خوش رہنے کی خاطر شاداں رہتی ہوں میں

ہے مجھے تیرے سبب حاصل بدیں حالت یوں — ایک وجدانی مسرت ایک روحانی سکوں

طفل شیریں خندہ و شیریں لب و شیریں ادا — خوش نوا، خوش باش خوش پرواز خوش پیکر لوا

شاد ہیں میری طرح۔ لیکن نہیں اتنے کہاں — میں ہوں جتنی تیری آغوش کرم میں شادماں

اس قدر خنداں نہ ہوگا خسرو گلشن گلاب — اس قدر نازاں نہ ہوگا۔ قیصر گردوں رکاب

---

آہ میں ہرگز نہ بھولوں گی وہ ایام طرب — جب مجھے حاصل تھا بچہ کا محبت زا لقب

جب مجھے آتے تھے دنیا کے یہی دو چار کام — کھیلنا، کھانا، پہننا، شادماں رہنا مدام

جب سرور و عیش لفظوں تھا۔ خرد کم عقل کم — جب پہیلی تھیں معمّا تھیں۔ لغات فکر و کم

---

[1] رضی الرب فی رضی الوالد (الحدیث) [2] ما من ولد بار ینظر الی والدیہ نظرۃ رحمۃ الا کتب اللہ لکل نظرۃ حجۃ مبرورۃ (الحدیث)

لب تک آیا تھا نہ جامِ تشنگی افزائے علم
طبع بھی ناواقفِ تکلیف استقائے علم

تھا یہ حالِ علم گر سیدھی لکیر اک دیکھ لی
ہو کے خوش "آ با الف آ با الف" چلا اٹھی

آہ! میرا عہدِ طفلی۔ توبہ۔ عہدِ سلطنت
کسقدر رشک آفریں تھا کس قدر پُر تمکنت

تیرا گھر وہ سرزمیں تھی جس میں میرا راج تھا
تیرا زانو تختگہ تھا۔ دستِ شفقت تاج تھا

تھی نظر سے دور اک معصومہ اک حورِ جناں
میں سمجھتی تھی کہ میرا باپ ہی ہے میری ماں

شب کو اکثر تجھ کو سرہانے کھڑا پاتی تھی میں
پیار کی نظروں سے جھک کر دیکھتا پاتی تھی میں

ہے مرے نزدیک سارا واقعہ کل کی سی بات
کیا تجھے بھی یاد ہے! اے والدِ عالی صفات

تو نے جب بازیچۂ اطفال میں رکھا قدم
لڑنے والوں نے بنایا کس طرح تجھ کو حکم

اُف وہ ننھے شاکیوں کے منہ بنانے کی ادا
اور وہ بج کے مسکرانے سر ہلانے کی ادا

یاد ہے وہ خود ہی گرنا، خود ہی کھسیانا مرا
پھر وہ تیرا گُد گُدانا، اور وہ ہنس جانا مرا

اپنی لغزش یاد ہے۔ تیری نصیحت یاد ہے
یاد ہے مجھ کو وہ اندازِ ملامت یاد ہے

میری بیٹی! میری بیٹی ہو تو بچنا جھوٹ سے
عیب جتنے ہیں، سب سے بدتر ہے، وہ اچھا جھوٹ ہے

یوں مرے پیشِ نظر ہے ابتدائی زندگی
یاد تھی جس طرح آدم کو بہشتی زندگی

وا دریغا، دن دہاڑے، کُل جہاں کے سامنے
میرا گنجِ عیش لوٹا رہزنِ ایام نے

لوٹ آ اے عشرتِ ایامِ طفلی لوٹ آ
پھر مجھے اک بار بس اِک بار اپنا منہ دکھا

اے پدر آغوش ہے تیری وہ دار انقلاب
جس میں ہوتا ہے مبدل عہدِ طفلی سے شباب

تو ہی رہبر، وہی استاد ہے میرے لئے
میں نہ ہی بچی وہی نافہم ہوں تیرے لئے

مہر لب ہے گرچہ تیرا پاس جذبات اے پدر
کہہ رہا ہے دل زبانِ بے زبانی سے مگر

جب کہوں میں خیرباد اس عالمِ حق پوش کو
رُوح چلدے، سونپ کر قالب تری آغوش کو

خاتون علی گڑھی

# بڑھاپے کی کہانی

جاڑے کا موسم تھا۔ کوئی دس بجے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ کسی کام کو گھر سے نکلا۔ شیخ منگلو کے چھتے میں جو پہنچے تو ایک بڑھیا نواب فیض احمد خاں کے دروازے کی دہلیز سے لگی ہوئی بیٹھی تھی۔ ستر سے زیادہ ہی عمر ہوگی۔ سفید بگلا سے بال، سر ہلتا ہوا۔ ایسا پھٹا ہوا برقع جس میں بیسیوں پیوندوں کے بعد بھی ٹمک باندھنے کی جگہ نہ ہو اوڑھے ہوئے جسم تھر تھرا رہا ہے۔ ایک ہاتھ جس پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں باہر نکلا ہوا ہے۔ منہ پر مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ شاید آنکھوں سے بھی نہیں سوجھتا۔ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر زبان نہیں کھلتی۔ سردی کے مارے آواز نہیں نکلتی۔ بڑھیا کی حالت پر مجھے ترس آگیا۔ ٹھہر کر اپنی جیب ٹٹولنے لگا۔

دوست:۔ ٹھہر کیوں گئے۔؟

میں:۔ کچھ نہیں۔

بڑھیا کی لکڑی نالی میں گر گئی تھی اسے نکال کر اس کے برابر رکھ دیا۔

دوست:۔ یہ کون ہے؟

میں:۔ تم نہیں جانتے؟

دوست:۔ نہیں۔

میں:۔ موت کی طلب گار۔ مصیبت کی ماری۔

دوست:۔ یہاں ایسی گندی جگہ اور اس سردی میں کیوں بیٹھی ہے؟

میں:۔ اندھی ہے۔ اچھی بری جگہ نہیں سوجھتی۔ جہاں جس نے لاکر بٹھا دیا بیٹھ گئی۔

دوست:۔ تو کیا بھیک مانگتی ہے۔

میں :۔ اور کیا کرے جب تک ہاتھ پاؤں چلتے تھے تو لالوں کی لال تھی۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا۔ خود کما نہیں سکتی۔ اپنے سب الگ ہو گئے۔ غیروں کی کمائی میں حصہ پانے کا آسرا باندھنا پڑا۔ گھر میں پڑی رہے یا کسی ویرانے میں جا بیٹھے تو کون پوچھتا ہے۔ ایسے لوگ اس دنیا میں اکا دکا ہی ہیں جو ایسے ذوی الحقوق کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیتے پھریں۔ گلی میں راستے پر بیٹھی ہے تاکہ لوگوں کو اپنی حالت دکھائے۔ ہزاروں میں سے ایک نے بھی خیال کر لیا تو اس کا کام بن گیا۔ میری جیب میں اس وقت جو تھی وہ نکال کر بڑھیا کے ہاتھ پر رکھدی اور ہم آگے بڑھے۔

دوست :۔ لیکن یہ کوئی صدا تو لگاتی نہیں۔

میں :۔ جو سرتاپا صدا ہو تو سنڈے مسٹنڈے فقیروں کی طرح کیا صدا لگائے۔

دوست :۔ کچھ تو کہنا چاہیئے۔

میں :۔ کہنا کیا چاہیئے۔ وہ کہتی ہے تم نے سنا نہیں ؟

دوست :۔ نہیں۔ کیا کہتی ہے ؟

میں :۔ یہ کہتی ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے کان، ناک، آنکھ، ہاتھ، پاؤں، دانش فراست جیسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان پر فرض ہے کہ ہم جیسے اپاہجوں ٹھکرائے ہوؤں کی خبر گیری کریں۔

دوست :۔ یہ تو اس کا حال ہے۔ زبان سے تو کوئی سوال نہیں کرتی۔

میں :۔ حال سے زیادہ قال میں تاثیر کہاں ؟

دوست :۔ مگر دیکھنے والوں کی وہ آنکھیں بھی تو ہونی چاہئیں جو زبان حال سمجھیں۔

میں :۔ واقعی دنیا میں زیادہ تر اندھے بستے ہیں اور اسی لئے خدا کی مخلوق پریشان ہوئی جاتی ہے۔ اچھا اس بڑھیا کی تم نے کہانی سنی ہے۔ ؟

دوست :۔ کیسی کہانی۔ کیا یہ کہانی بھی کہتی ہے۔ ؟

میں۔ جگ بیتی نہیں۔ آپ بیتی سنو گے،

دوست :۔ کسی روز اپنے گھر بلوا لینا۔

میں :۔ مگر وہ زبان سے کہانی نہیں کہتی۔

دوست :۔ پھر ؟

میں :۔ جس زبان حال سے بھیک مانگتی ہے اسی سے کہانی بھی سناتی ہے۔ لیکن تم نہ شاید اس کی زبانی سن سکو گے نہ تمہاری سمجھ میں آئے گی۔ ہاں مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا پر عمل کرو تو ممکن ہے کچھ سمجھ پا اس کی عمر کو پہنچ کر خود کہانی سنانے کے قابل ہو جاؤ تو تمہاری سمجھ میں آئے ـــــ ہاں کہانی نہ ہے ایسی دلچسپ کہ اگر وہ زبان قال سے کہنے بیٹھے اور تم سننے پر آؤ تو شاید مہینوں میں بھی ختم نہ ہو۔ قصے میں قصہ نکلتا ہی چلا آئے۔ یہ تو زبان حال ہی ہے کہ ایک فقرے میں ساری کہانی طے ـ میں سُن چکا ہوں اور مجھے یاد بھی ہے کہو تو مختصر لفظوں میں سنا دوں ؟

یہ کہتی ہے کہ بیٹا یا بیٹی، غریب یا امیر کسی کے ہاں کیوں نہ ہو سب گھر والے خوش ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنا پرایا مبارک باد دیتا ہے۔ محلے والیاں ہمسائیاں چلی آرہی ہیں۔ رشتے داروں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ آنے والے کھلتے ہوئے آتے ہیں۔ بڑی بوڑھیاں، جوان لڑکیاں جسے دیکھو بچے کو دیکھنے کی خوشی۔ اور خالی دیکھنا ہی نہیں بلکہ اس کے رنگ، حسن، وضع اور تناسب اعضا پر رائیں دی جاتی ہیں۔ مھر جنہیں بچوں کا چاؤ ہے یا جن کے بچے نہیں جیتے وہ تو کھنچے جاتے ہیں۔ بس نہیں چلتا کہ اپنے کلیجے میں رکھ لیں۔ کوئی گود میں اٹھا رہی ہے۔ کسی نے منع کرتے کرتے پیار ہی کر لیا۔ دو بلائیں لے رہی ہیں تو چار دور ہی دُور سے لڑکیوں کو کہہ رہی ہیں کہ بی بس! زچہ کے پاس سے ہٹ جاؤ۔ بیچاری کا دم گھٹا جاتا ہوگا۔ بچے کو زیادہ ہلکان نہ کرو۔ کوئی مرچیں اتار کر چولھے کے پاس دوڑا ہے کہ نظر اتارے۔ کسی نے مٹھی بھر کالا دانہ انگیٹھی میں ڈال دیا۔ اللہ ابھی پیٹ سے نکلتے دیر نہیں ہوئی اور یہ لاڈ یہ پیار! وجہ کیا؟ فطرت کا تقاضا۔ نیچر کا زور۔ اگر بچوں کی طرف بڑوں کو اللہ اس طرح متوجہ نہ کرتا اور ماؤں کے دل میں مامتا نہ رکھ دیتا تو ان کی پرورش کس طرح ہوتی۔ بچوں کی بھولی بھالی صورتیں دلوں کو بیقرار رکھتی ہیں اور ہر کس و ناکس اُن پر مائل اور گرویدہ ہوا چلا جاتا ہے۔ لیکن جن کو خدا نے عقل رسا یا چشم بینا عطا فرمائی ہے وہ دوسرے ہی خیال سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے اصلی گھر سے یہ نو وارد مسافر آیا ہے۔ ہماری ولایت کا تازہ وارد ہے

دنیا کی ہوا اسے نہیں لگی۔ دیکھئے اس کے خیالات کیا ہیں۔ وہاں کے خیالات کب تک رہیں۔ ہنستا ہے تو کیوں؟ کیا ابھی اپنے وطن کا سماں نظروں کے سامنے ہے؟ اور روتا ہے تو کیا سوچ کر؟ کیا یہاں کی باتیں اسے پسند نہیں۔

یہ بڑھیا بھی اسی چاؤ چونچلے سے پیدا ہوئی تھی۔ اور اس پر بھی پہلا سال اتنے ناز برداروں کے جھرمٹ میں گزرا۔ بڑے بڑے چاہنے والوں حسینوں اور مال داروں کی گودوں میں اس نے پرورش پائی۔ ذرا سا روتی یا منہ بناتی تو گھر کا گھر بے چین ہو جاتا۔ ہر ایک بہلانے کو دوڑتا۔ اُس کی انگلی دکھتی تو کتنوں کی جانوں پر آبنتی۔

دوسرا برس آیا۔ کچھ کچھ ہاتھ پاؤں میں طاقت آئی۔ ٹھمکتے ٹھمکتے گھٹنیوں چلنے اور پھر کھڑی ہو کر لئے تسیدے پاؤں مارنے لگی۔ دادا دادی۔ نانا۔ نانی۔ ماں باپ سب آنکھیں بچھانے لگے کہ چوٹ نہ لگ جائے۔ پانی کو مم۔ ابا، اماں کہنا شروع کیا تو گھر بھر نہال نہال تھا۔ جو ہے ہاتھ پھیلائے ہوئے کہ میری گود میں آئے۔ ہر اک چاہتا ہے کہ میں اچھالوں کداؤں۔ میری انگلی پکڑ کر چلے۔ میری دی ہوئی چیز کھائے۔ مینا کی طرح اپنی بولی بول کر مجھے شاد کرے۔ ایک ایک بول کے لئے سو سو خوشامدیں اور ذرا سی مسکراہٹ کے لئے لاکھ لاکھ آرزوئیں۔

رفتہ رفتہ وہ دن آگئے کہ خالص محبت کے ساتھ اغراض بھی شامل ہو چلیں۔ عمر کیا بڑھی تعلقات نے بھی کروٹ لی۔ اب کوئی تو اس لئے خاطر کرتا تھا کہ میرا کام کر دیجئے۔ اور کوئی اس امید میں کہ بڑی ہو کر میرے گھر کا چراغ ہو گی۔

پھر ہوش سنبھالتے ہی انگلیاں اٹھنے اور آنکھیں پڑنے لگیں۔ دنیاوی تعلقات کے پیرایہ میں چاہتیں بھی اپنا رنگ بدلتی رہیں۔ ابھی یہ سلسلہ ختم ہونے نہیں پایا تھا کہ پندرھواں سال لگ گیا۔ جوانی کی رات کیا آئی کہ دفعتہً بدلی سے چاند نکل آیا۔ تمام جہان میں روشنی پھیل گئی۔ یا یوں سمجھو کہ شباب کی شوخیوں نے شہر کے نوجوانوں پر اپنا جادو شروع کر دیا۔ عورت خواہ کیسی ہی بھونڈی صورت کی کیوں نہ ہو اس عمر میں قدم رکھتے ہی پری بن جاتی ہے۔ حسین سے حسین نوجوان مرد پر فطرۃً ایسا پر اثر جادو ڈالتی ہے کہ

بغیر پیس بلوائے دم نہیں لیتی۔

سچ ہے اگر عورت میں قدرت کی طرف سے یہ کشش نہ پیدا کر دی جاتی تو نیچر کی خدمت کا بہت زیادہ اہم کام یعنی توالد و تناسل کس طرح سرسبز ہوتا۔ اور خاص کر وہ بیچاریاں جن کو ازل سے حسن کا کوئی شائبہ بھی عطا نہیں ہوا اپنی زندگی کے دن کیونکر گزارتیں۔ اچھا تو یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک غریب اور کم حیثیت لڑکی بھی اچھے لچھے دولتمند نوجوانوں بلکہ شہزادوں پر حکومت کر سکتی ہے۔ اور ایسی حکومت جو کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو رعایا پر۔ زبردست کو کمزور پر۔ حتیٰ کہ شیر کو بکری پر بھی نصیب نہیں۔

بڑھیا نے کہا۔ کہا کیا اب بھی وہ اگر کوئی دل کے کانوں سے سننے والا ہوتا تو یہی کہہ رہی تھی کہ یہ سارے دور میں دیکھ چکی ہوں۔ جوانی ایک وقت تھا کہ مجھ پر بھی پڑتی تھی۔ ان ہی رعشہ دار ہاتھوں نے کتاب زندگی کے سارے ورق اُلٹے ہیں۔ تینوں زمانوں کی سیر ان آنکھوں نے دیکھی ہے جن میں اب اندھیرے کے سوا کچھ نہیں۔ زندگی کے ہفتخواں طے کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوں۔ اور اب ڈیڑھ گز زمین ہے جو میرا پردہ ڈھک لے۔ بچپن میں گودیوں میں کھیلی۔ ارمانوں میں پلی۔ لڑکپن سینکڑوں دلوں پر حکومت کرتے گذرا۔ اس کے بعد جوانی ہوئی تو خدا جانے کتنے خود غرض انسانوں کو تڑپایا، پھڑکایا۔ چوتھا پن آیا تو بچوں کو دودھ پینے کیلئے میری خواہش تھی۔ شوہر کو اولاد کی پرورش کے لئے میری ضرورت۔ کنبے، محلے، پڑوسیوں کے چھوٹے چھوٹے بچے دنیا میں زندگی بسر کرنے کے طریقے مجھ سے پوچھنے آتے تھے اور اسی طرح چوتھے پن میں بھی میں ہر دل عزیز سمجھی جاتی تھی۔ پانچواں اور چھٹا پن بھی اشتم پشتم گذر گیا۔ دوسروں کی خدمتیں کیں۔ کسی کے بچے پالے کسی کے ناز اٹھائے۔ کسی کا سودا سلف کیا۔ کسی کی ہنڈیا ڈوئی کی۔ بہرحال روٹی ٹکڑے کے لئے میرا جینا کسی پر بار نہ تھا۔ اب یہ ساتواں پن ایسا ہے کہ اپنے پرائے سب پر بھاری ہوں۔ زمین بھی قبول نہیں کرتی۔ موت بھی کترا جاتی ہے۔ کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ اسی کے پیٹے میں ہوں۔ دنیا کے تمام تعلقات ٹوٹ گئے۔ اتفاقات سے وہ لوگ بھی زندہ نہ رہے کہ محنت کا بدلہ نہ سہی قرض ہی ادا کرنے کے طور پر کہ میں نے ان کی خدمت کی تھی میری خدمت کرتے یا خدا کے خوف سے میری خبر گیری کو فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض عین سمجھتے۔ اب تو یوں سمجھو کہ درخت بویا وہ بڑھا اس میں پھول آیا۔ پھل لگا۔ پھل پکا۔ اس نے رنگ روپ نکالا اور

شاخ ہی پر لٹکے لٹکے سٹر گیا۔ مگر سٹر کر بھی ٹپکتا نہیں لٹک رہا ہے۔ انسان یا جانور اسے کوئی پوچھنا تو در کنار سونگھتا تک نہیں۔ حتیٰ کہ مالی یعنی نیچر کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ کہیں ٹوٹ کر گر پڑے اور درخت صاف ہو جائے۔ مگر ہوا کا کوئی جھونکا بھی نہیں آتا جو اسے گرا کر سب کی مرادیں پوری ہوں۔

قصہ تو ختم ہو گیا مگر قصے کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ ابھی شاید تم نہ سمجھے ہو۔ کہانی کیسی ہی سہی دل دکھانے والی یا دل خوش کرنے والی۔ وہی اچھی ہوتی ہے جس کا نتیجہ سبق آموز ہو۔ بڑھیا کی کہانی میں ایک سبق ہے۔ اور سبق بھی یاد رکھنے کے قابل۔ دنیا میں موت سے زیادہ کوئی شے یقینی نہیں لیکن عملی طور پر شک بھی اسی کی صحت میں مانا جاتا ہے اور اسی لئے بداعمالیوں کے ارتکاب کے وقت خدا کا خوف محسوس نہیں ہوتا۔ موت کے آنے میں شبہ نہیں تاہم مرنے کا نام سن کر کوئی ایسا نہیں جو ناخوش نہ ہوتا ہو اور دو چار نہ کہے۔ دنیا میں بعض خدا کے بندے اس کلیہ سے مستثنیٰ بھی ہیں۔ اور وہی حقیقتاً اچھے بھی ہیں۔ دنیا کی چیزوں میں اچھے برے دو لو اعتبارات ہوتے ہیں۔ اس بڑھیا میں ساری برائیاں سہی لیکن وہ موت کو نہیں بھولتی۔ اور اس لحاظ سے بہتوں سے اچھی بھی ہے۔

اشرف صبوحی دہلوی

---

# رازِ بقا

کسی نے فصل گل میں جاکے پوچھا خاک گلشن سے — ہوائے مشک بیز اڑنے لگی پھر تیرے دامن سے
پھر آتے ابر کے جھونکے تجھے شاداب کرنے کو — گیا و سبز اٹھی پھر بستر کمخواب کرنے کو
ترے دامن سے پھر اٹکھیلیاں کرتی صبا نکلی — شگوفے کے دہن سے ایک دھیمی سی صدا نکلی
در شبنم نے پھر اوراق گل پر تارے چمکائے — اور ان تاروں میں لاکھوں عکس مہر و مہ نظر آئے
فضا میں چہچہے گونجے ہیں تیرے نغمہ خوانوں کے — چنے جانے لگے شاخوں پہ تنکے آشیانوں کے
عجب حیرت فضا ہے یوں ترا آباد ہو جانا — خزاں آتے ہی پھر شہر مردہ و برباد ہو جانا
بنا ہے حسن کیا دنیا میں یوں مٹنے مٹانے کو — یہ کیا اک محض دھوکا ہے ہمیں احمق بنانے کو
یہ سن کر گوشہ گلشن سے دھیمی سی صدا آئی — کہ تو وارفتہ ہے تو اے بزم قدرت کے تماشائی
نہیں دیکھا ہے اس عبرت کدے کو غور سے تو نے — نہیں کی ہے یہاں کے ذرہ ذرہ پر نظر تو نے
بقا ہی کی پوشیدہ ہے اس مٹنے مٹانے میں — کہ آئین تغیر کار فرما ہے زمانے میں

محمود اسرائیلی

# کھلے ہوئے پھول کو دیکھ کر

چاہتا ہے جی کہ یوں صحرا نوردی کیجئے
خار صحرا پاؤں میں پھولوں کے ساغر ہاتھ میں

اُف تیرا دلآویز حُسن، تیرا رسیلا جوبن، دو جادو ہیں چلتے ہوئے۔ تیری بھینی بھینی خوشبو۔ تیری باعرہ نواز رنگت۔ تیری شمشیر حُسن کے دو جوہر ہیں بغایت دلفریب۔

چمنستان جمال کے شاہد رعنا، گلزار کی زینت، باغبان کی دلبستگی، بلبل کی جمعیت سب ایک تیری ہستی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تو کھلتا ہے کِھلاتا ہے۔ مہکتا ہے مہکاتا ہے، مگر آہ تیری جائے قیام یعنی یہ صحن چمن تیرے لئے مناسب مقام نہیں۔

معدن حسن کے بے بہا گوہر! کاش کسی جنگل میں کسی صاف شفاف بہتی ندی کا کنارہ تیری جلوہ گاہ ہوتی۔ بادل گرجتے آمنڈتے۔ برستے جاتے اور بجلی تیرے دیدار کی پیاسی تجھے دم بدم پردہ سحاب اُلٹ اُلٹ کر دیکھتی۔ تڑپ تڑپ کر آتی اور قربان ہو ہو جاتی۔ سر صبح صادق کے وقت چاندنی کی خوش آئند چاندنی بادلوں میں سے چھن چھن کر آتی اور زمین و آسمان چاندنی سے بنے ہوئے نظر آتے۔ اس وقت، آہ اس وقت تیرا جلوۂ حُسن حسینوں ہزار پریوشوں لاکھ ماہرویوں کی تاب رُخسار پر پانی پھیر دیتا۔

بدنصیبوں کے کہاں ایسے نصیبے اے ماہ
چاند کی چاندنی میں تجھ کو لب جو دیکھیں

تیری ناز بردار ٹہنیاں نسیم سحری کے ہر فرحت افزا جھونکے سے سطح آب پر جھوم جھوم کر اُٹھتیں۔ ہوا کا ہر جھونکا تجھے آب جُو میں ایک غوطہ دیتا اور شبنم کے دو چند گوہر صفت قطرے جو بیش قیمت ہر صبح تیرے عارض روشن پر ٹپکاتا ہے۔ ندی کے پانی میں مل کر بہہ جاتے۔ مہاتا

آپ سے ہر مرتبہ ایک نیا حُسن اور ایک انوکھی پھبن لے کر اُٹھتا۔ آہ ہر صبح کو جب کہ نسیم کا سنّاٹا اور طائروں کی چہکار اطراف دشت میں گونجتی۔ ندی کا پانی بے قرار ہو کر لہریں لیتا۔ تیرے حُسن کے تماشائی تیرے جمال کے فدائی یعنی جنگل کے پرندے تیرے پاس آتے۔ تجھے پُوجتے۔ تجھے سجدہ کرتے۔ تیری نرم نرم پتّیوں کو چُوستے۔ تیری نازک پنکھڑیوں سے آنکھیں ملتے۔ تیرے گرد پھرتے۔ ہر طرح سے تجھ پر صدقے ہوتے نثار ہوتے۔ قربان ہوتے۔ مٹ جاتے۔ فنا ہو جاتے۔

صنعت صانع کا ایک پُجاری، ایک وحدانیت کا دلدادہ تیری زیارت کے لئے علی الصّباح چل کر آتا۔ چُپ چاپ تیرے روبرو بیٹھتا۔ تجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا۔ تیری برق وش تجلّی کی تاب نہ لا کر اُچھل اُچھل پڑتا اور کبھی تیرے حُسن کے زوال کا خیال کر کے آنکھوں میں آنسو بھر لاتا۔ سُورج کی پہلی شعاع تیرے عارض تاباں پر پڑتی اور وہ اُن دو قسم کے جذبات سے متاثر ہو کر تجھ سے اس طرح مخاطب ہوتا۔

دُنیائے حُسن کے مسلّم نازنین! تو باغبان کی اُمیدوں کا مجموعہ۔ تو بلبل کی حسرتوں کا مرکز۔ تو اپنے صانع کی وحدانیت کا مظہر ہے۔ تو دل میں نہیں اُتر سکتا۔ تو آنکھوں میں نہیں سما سکتا۔ آہ بتا کہ تجھے کیا کروں ؂

جی چاہتا ہے صنعت صانع پہ ہوں نثار
بُت کو بٹھا کے سامنے یادِ خدا کروں

خاتم قُدرت کی رنگین آبدار شبنم ہر صبح تیری بے ثباتی پر زار و قطار روئی۔ بلبل نے زاریاں کر کر کے سارا جنگل سر پر اُٹھا لیا "کسی نے تجھ تک قُدرت کا پیغام نہ پہنچایا۔ کسی نے تجھے چند شدنی امور کی اطلاع نہیں دی۔ آ میں تجھے قبل از وقت وہ پیام سُناؤں جو تجھے عاجلاً و آجلاً سُننا پڑے گا۔ تیری نرم و نازک پنکھڑیوں کو دست تغافل خزاں پریشان کر دے گا۔ تیری پیلی پیاری پتّیوں پر زمانہ آفتوں کے آسمان توڑ دے گا۔ تیری

دلآویزیاں، تیری دلفریبیاں، تیری دل رُبائیاں، خاک میں مل جائیں گی۔ تیرے حُسن وجمال تیرے ناز و انداز روزگار ناساز گار کے ہاتھوں باد تاراج کے سپرد کر دیئے جائیں گے اور قُدرت کی وہ مہربان دایہ جس نے یہ خوبیاں تجھے بخشی ہیں خود تجھے ناپید کر دے گی۔ گردش تاک میں ہے اور فتنہ گھات میں، دیکھنا اس چند روزہ خوبصورتی پر نہ بھولنا۔ اس آنی جانی رعنائی پر نہ اترانا۔ بلبل سے نہ بگڑنا نازاں نہ ہونا۔ مغرور نہ ہونا۔ بلکہ اُسی طرح ہنستے بولتے کھلتے کِھلاتے، مہکتے مہکاتے مٹی میں مٹی ہو جانا۔

دریائے جمال کے انمول موتی! جا پردۂ عدم میں جا کر جلوہ فگن ہو۔ تیرے لبھائے ہوئے، بہلائے ہوئے، پرچائے ہوئے دل تجھے کبھی فراموش نہ کریں گے۔ تلخ کام عندلیب کے نالے اطراف دشت میں گونج گونج کر تجھے زندہ جاوید بنائیں گے اور حسرمان نصیب باغبانوں کی دردبھری صدائیں تجھے نہ مٹنے والی شہرت عطا کریں گی۔ قصّہ کوتاہ یوں کہ تیری فنا میں بقا کا رنگ جھلکے گا۔

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

## سیّد سرفراز حسین زیدی

---

| | |
|---|---|
| گفتار بوقت خویش زر مے گردد | زو ہر بد و نیک بہرہ ور مے گردد |
| باران بہار ز اعتدال موسم | در سر گل و در بحر گہر مے گردد |

---

| | |
|---|---|
| نکوئی گر رود زیں دہر نیکو تر شود پیدا | چو گیرد قطرۂ دام عدم گوہر شود پیدا |
| غبار خاطر دانا سعب اظہار ہنر گردد | صفا برخیزد از آئینہ چوں جوہر شود پیدا |

# ایڈیٹر کی ڈاک

(۱)

"فردوس" کا پہلا پرچہ موصول ہوا۔ بھیّا احسان الحق صاحب کی مختصر تحریر مجھے بہت پسند آئی۔ واقعی اب اردو کی ترقی کے لئے جد و جہد بیکار معلوم ہوتی ہے۔ اس زبان کو تو ہندوستان کی مسلم اور غیر مسلم آبادی میں اتحاد اور اشتراکِ عمل کا ایک ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ مقصد ہی فوت ہو گیا اور ہندو ہندی اور سنسکرت کی جانب رغبت کر رہے ہیں ہم کو بھی چاہیئے کہ اپنی دینی زبان عربی اور تمدنی زبان فارسی کی طرف توجہ کریں۔ تاکہ اور اسلامی ملکوں سے یگانگت اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں مفید ثابت ہوں۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کا آج سے ۲۵۔۳۰ سال پہلے یہی خیال تھا۔ اور اسی خیال کو عمل میں لانے کیلئے انہوں نے اردو میں شعر کہنا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ حال میں نواب سرور الملک کی خود نوشت سوانح عمری دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں انہوں نے اپنی اور سر سالار جنگ اول کی ایک گفتگو نقل کی ہے جو حیدر آباد میں فارسی کی جگہ اردو کو دفتری زبان قرار دینے کے مسئلہ پر ہوئی تھی۔ سالار جنگ مرحوم فارسی کو ترک کرنے کے سخت مخالف تھے۔ اور اردو کی حمایت کو مسلمانوں کے تنزل اور انحطاط کی علامت خیال کرتے تھے۔ معلوم نہیں کہ بھیّا صاحب نے اپنی تجویز محض ہنگامی حالات کی تلخی سے متاثر ہو کر طنزیہ پیرائے میں پیش کی ہے یا وہ واقعتاً وہ فارسی کو اس ملک کے مسلمانوں کی علمی اور ادبی زبان بنانے کے حامی ہیں۔ اگر مؤخر الذکر قیاس صحیح ہے تو میں بھی ان کی تجویز کی تائید کرتا ہوں۔ نصاب تعلیم کو ترک کر دیا جائے۔ اور جس مستعدی سے ہندو ہندی کو رواج دینے کی کوشش کر رہے ہیں اگر ہم بھی اسی مستعدی کے ساتھ کام کریں تو پندرہ بیس برس میں فارسی کو پھر وہی نفوذ حاصل ہو جائے گا جو سلطنت مغلیہ کے زمانہ اقتدار میں اس کو نصیب تھا۔ اردو بھی معمولی بول چال کے لئے باقی رہ سکتی ہے جس طرح

اس وقت۔ پنجابی، پشتو، سندھی، بنگالی وغیرہ میں اور جو رشک وحسد ان زبانوں کے حامیوں کو سوبائی اغراض کی بنا پر اردو کے خلاف پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بھی کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ یہ ناچیز خیالات صرف آپ ہی کے لئے ہیں۔ "فردوس" میں ان کا کوئی ذکر نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ میں کسی بحث مباحثہ میں نہیں الجھنا چاہتا۔ اور جہاں تک آپ کے خیالات کا مجھے اندازہ ہے یہ توقع بھی فضول ہے کہ آپ میری ہمنوائی فرمائیں گے۔

خاکسار:۔ ........

یہ تحریر ایک جیسے ذی علم اور صاحب غور وفکر بزرگ کی ہے۔ ممدوح بحث و مباحثہ میں الجھنا نہیں چاہتے۔ لہذا میں ان کا نام حذف کر رہا ہوں۔

عربی اور فارسی کو پاکستان میں از سرِ نو زندہ کیا جائے اور فروغ دیا جائے تو اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن عربی اور فارسی کی خاطر اپنی پلی پلائی زبان کو ختم کر دینے کا میں واقعی قائل نہیں ہوں۔ ہندو اردو کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ یہ بُرا ہے۔ لیکن مسلمان اردو سے دستبردار ہو جائیں۔ یہ اور زیادہ بُرا ہے۔

ہندوستان میں اردو کا مستقبل یقیناً تاریک ہو گیا۔ لیکن پاکستان میں اردو ضرور رہے گی اور یہاں یہ ایسی جڑیں پکڑ لیگی کہ پھر انشاء اللہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب کا خیال میرے نزدیک بالکل صحیح ہے کہ دلی اور یو۔ پی والے زبان وغیرہ کے اعتبار سے پاکستان کو دلی اور یو۔ پی بنا دیں گے۔ اور پاکستان کی خوبیوں کو خود اختیار کریں گے۔

اردو کی طرف سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ دشواری ہندوستان کے مسلمانوں ہی کے لئے کیا ہندوؤں کے لئے بھی ہے، جو ہندو مسلمان ہندی نہیں جانتے۔ ان سب کو اردو چھوڑتے ہوئے تکلیف ہو گی۔ لیکن اردو کا.... کچھ نہیں بگڑے گا۔ اسے تو خدا نے ایک گھر چھین کر دوسرا گھر عنایت فرما دیا ہے۔

مجھے اس وقت پنڈت مدن موہن مالوی یاد آ گئے۔ تمیں پینتیس برس قبل کی بات ہے

دلی میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ مالوی جی صدر تھے۔ انہوں نے ہندی میں خطبہ صدارت کہنا شروع کیا وہ بے تکلفی سے بولا کرتے تھے۔ اوّل اوّل تو مالوی جی نے ہندی میں تقریر کی۔ مگر ہندی چل نہ سکی اور مالوی جی کو آخر اُردو ہی کی مدد لینی پڑی۔ حالانکہ مالوی جی ہندی کے سب سے بڑے حامی گزرے ہیں اور کانگریس پلیٹ فارم پر ہندی سب سے پہلے وہی لائے تھے۔ کیا تعجب ہے کہ تھوڑے عرصے بعد سب ہندو مالوی جی کی مانند ہندی سے گھبرا اٹھیں اور دوبارہ اردو کو اختیار کر لیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو کبھی اوّل سے آخر تک ہندی بولیں گے۔ اُن کی شستہ اور فصیح اردو میں اب کوئی لفظ ہندی کا آجاتا ہے تو چھلکی کھلنے لگتی ہے۔ اوّل سے آخر تک ہندی بول کر وہ تقریر کا مزا نہیں بگاڑ سکتے۔ یہی ہندوستان کے اور بے شمار ہندوؤں کا حال ہے۔ اردو میں قبولیت کی جیسی صلاحیت ہے وہ ہندی میں نہیں ہے۔ ہندی باوجود کوشش کے سمٹتی ہوئی ہے۔ اور اردو بغیر کوشش کے پھیلی ہے۔

**(۳)**

ا اس وقت ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ بعض معروف و غیر معروف اہلِ قلم کے نجی خطوط نفسیاتی حیثیت سے بھی بڑے وقیع ہوتے ہیں، اور ضرورت ہے کہ ایسے خطوط کی حتی الامکان حفاظت کی جائے، اس حفاظت کی ایک بہترین صورت یہ بھی ہے کہ آپ ایسے حضرات انہیں حاصل کریں اور رسالوں میں شایع کردیں۔ اگر آپ "فردوس" میں ایسے خطوط، کسی خاص عنوان کے ساتھ کبھی کبھی شائع فرماتے رہیں تو یہ نہایت قابلِ قدر بات ہوگی، اس طرح بہت سے خطوط بآسانی ایک مجموعے کی شکل میں نکل سکیں گے۔

ا فردوس میں کبھی "یادِ رفتگان" یا کسی اور موزوں عنوان سے ایسے شعرائے ماضی کا کچھ کلام بھی تبرکاً شائع ہوتا رہنا چاہیئے جو کبھی زبانوں پر تھے، لیکن آج (شاید) کتابوں میں بھی نہیں ہیں، مثلاً (۱) مضطر خیرآبادی مرحوم (۲) مرزا مائل دہلوی ثم جے پوری مرحوم (۳) کیفؔ، ٹونکوی، مرحوم (۴) وحشی (سید ظہور احمد صاحب) شاہجہاں پوری مرحوم۔

(۳) معلوم نہیں پاکستان میں ادب و شعر کی رفتار کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ فردوس میں کبھی کبھی اس پر بھی تبصرہ ہوتا رہے۔

(۴) ہندوستان میں بداخلاقی اور بدمذاقی کے افسانوں کی ایک وبا پھوٹ پڑی تھی، خدا کرے پاکستان میں یہ صورت نہ ہو، اور فردوس میں شائع ہوں تو صرف اخلاقی اور معیاری افسانے۔

نیازمند، بیمار و گنہگار حیرت شملوی

(۱) بہت اچھی تجویز ہے، میں خوشی سے اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔ خود بھی کوشش کروں گا کہ ایسے خطوط ڈھونڈ نکالوں۔ احباب بھی مدد فرمائیں۔

(۲) اس تجویز پر عمل کیا جا رہا ہے۔

(۳) ابھی کچھ خبر نہیں۔ فردوس کے تبادلہ میں رسالے آنے لگے ہیں۔ پاکستان میں ادب و شعر کی رفتار کا ان سے پتہ لگے گا۔

"پاکستان میں ادب و شعر کی رفتار" آپ نے عنوان بتا دیا۔ شاید اسے مستقل عنوان بنا سکوں

(۴) فردوس میں افسانے شائع ہوں گے تو انشاء اللہ اخلاقی اور معیاری ہی شائع ہوں گے۔

(۳)

آپ نے بہت اچھا پرچہ پیش کیا ہے۔ اس کی ہر تحریر صاف ستھرے اور نکھرے مذاق کی آئینہ دار ہے۔ اس وقت ایسے پرچوں کی اشد ضرورت ہے۔ لکھائی چھپائی۔ نیز ترتیب و تدوین بھی خوب ہے۔ مندرجات کی افادیت نے "فردوس" کو دوسرے رسائل کی سطح سے بہت بلندی پر پہنچا دیا ہے۔

اب فردوس کے بارے میں کچھ دوستانہ مشورے بھی گوش گزار کروں۔ آپ ایک پرانے صحافی ہیں۔ میں نے "خطیب" اور "نظام المشائخ" کا دور شباب دیکھا ہے۔ یہ جرائد و صحائف اس وقت کے سب سے ممتاز ادبی، ملی اور اخلاقی صحائف تھے۔ علامہ اقبال، حضرت اکبر مرحوم، اور دوسرے یگانۂ عصر شعرا و ادبا کے تازہ ترین افکار آپ ہی کے ان جرائد میں ہوتے تھے۔ لیکن اب ادب کی ڈگر بدل گئی ہے۔ لوگوں کے مذاق بدل گئے ہیں۔ اخلاقی اعتبار سے "فردوس" کا ہر حرف آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ لیکن

اس میں آج کا ادب نہیں ہے۔ فردوس کو ہم خطیب اور نظام المشائخ ہی کا بدلا ہوا روپ کہہ سکتے ہیں۔ اگر لکھنے والوں کے نہ ملنے کے باعث یہ پہلا شمارہ ایک اخلاقی کتاب کی صورت میں پیش کرنا پڑا ہے، تب تو کوئی بات نہیں۔ اور اگر آپ نے فیصلہ یہی کیا ہے، تو پھر آپ نے پرانے اور نئے لکھنے والوں کو ساتھ ہی دعوت کیوں دی ہے۔ نئے لکھنے والے فردوس کے پہلے شمارہ کی تحریروں کے انداز کے افسانے اور مضامین تو لکھ نہ سکیں گے۔ ان کا ادب تو حقیقی زندگی کی صحیح عکاسی ہے۔ ان کے ہاں اخلاقی قدر بھی کوئی چیز نہیں۔ میں مخرب اخلاق افسانوں اور مضامین کو ملک و قوم کے لئے سم قاتل سمجھتا ہوں۔ پھر بھی جدید ادب کا حامی ہوں۔

میں اس خط کے ساتھ ہی فردوس کے لئے کوئی افسانہ بھی بھیجتا۔ لیکن فردوس دیکھنے کے بعد اب یہ مفصل خط لکھ کر جب تک آپ کا جواب نہ پالوں سوچ رہا ہوں، کیسی چیز بھیجوں؟ بواپسی ڈاک مطلع کیجئے۔ افسانے کئی ایک مکمل ہیں۔ میں "فردوس" کے لئے خاص طور پر زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی کوشش کروں گا۔ اور آپ چاہیں گے تو ہر مہینہ ایک سے زیادہ افسانے بھی دوں گا۔

آپ کا اپنا۔ آسی رام نگری

"مخرب اخلاق افسانوں اور مضامین کو" آپ "ملک و قوم کے لئے سم قاتل سمجھتے ہیں" تو اپنے افسانے اور مضامین بھیجنے میں ہرگز تامل نہ کیجئے۔

غالباً فردوس کا کوئی مضمون ابھی تک پھس پھس اور غیر دلچسپ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہیں کہیں مذہبی چاشنی ضرور ہے۔ لیکن ایسی باتیں جو خشک اور عجیب و غریب "علمی" زبان میں پیش کی جایا کرتی ہیں، اگر سلیس اور سادہ زبان میں لکھی جائیں تو انہیں ادب میں شامل کر ہی لینا چاہیئے۔

"زبان اور کلچر کی تبدیلی" کے عنوان سے ایک مضمون اکتوبر کے فردوس میں شایع ہوا تھا۔ وہ ادبی پرچے میں کھپ گیا تو یہ مضمون بھی گوارا کر لیجے جس کا عنوان "تقدیر" ہے اور اس پرچے میں چھپا ہے۔ دنیا تھوڑا سا میری عمر، میری طبیعت اور میرے ذوق کا مارجن دے۔

تو پھر میں شاید دنیا کے ساتھ چل سکوں گا۔

زندگی کی عکاسی سے میں نہیں روکتا اور نہ مجھے عکاسی کی ضرورت سے انکار ہے۔ لیکن عکاسی ثقاہت کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبال بھی آخر عکاس تھے اور آپ بھی مخرب اخلاق افسانوں کو ملک و قوم کے لئے سم قاتل سمجھ کر افسانے لکھتے ہی ہیں۔

(۴)

"فردوس" کے جو دو پرچے عنایت کئے تھے۔ انہیں سرسری نظر سے دیکھا۔ ابھی صحیح معنوں میں پڑھا نہیں ہے۔ موجودہ حالات میں آپ نے جیسا پرچہ نکالا ہے قابل قدر ہے۔ اگر "طویل" اور "مختصر" مضامین کسی طرح سموئے جا سکیں تو بہت اچھا ہو۔

پہلے پرچے میں "شاہجہان کی اولاد" پر جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے دلی اور شاہزادوں کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ مرزا احمد شاہ صاحب اور میاں مجی کے علاوہ میں ایسے شاہزادوں کو بھی جانتا ہوں جو ابتداء زمانہ سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھیک مانگنے پر مجبور ہوئے۔ آپ کے مضمون نے ایک واقعہ کی یاد تازہ کردی جسے ذیل میں درج کرتا ہوں۔

ایک مصور صاحب نے جامع مسجد کی قلمی تصویر بنائی اور مولانا محمد علی مرحوم کے پاس لائے۔ اس تصویر میں سیڑھیوں کے پاس ایک بڑھا فقیر دکھایا گیا تھا مولانا تصویر دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ اور اس کے نیچے یہ جملہ لکھدیا "His forefathers built it" "اس کے آبا و اجداد نے اسے بنایا تھا"۔

اس فقرے نے مصور کی کاوش کو چار چاند لگا دیئے اور اسے وہ تاریخی اہمیت دیدی جو کسی دوسری طرح حاصل نہ ہوتی۔

عباس حسین قادری دہلوی۔

مجھے بھی مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ ہی کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ آپ بڑے لمبے لمبے مضمون لکھتے ہیں اور ایک اشاعت میں کبھی کوئی بات ختم نہیں کرتے۔ مولانا ہنسے اور فرمایا کہ یہ بھی تو دیکھو کہ مضمون کو کتنا "لائٹ" بنا دیتا ہوں۔ لوگ پڑھنے سے اکتاتے نہیں اور دوسری قسط کے منتظر رہتے ہیں۔ یہی جواب آپ کے اس فقرے کا ہے کہ طویل اور مختصر مضامین کسی طرح سموئے جا سکیں تو اچھا ہو۔

فردوس کے مختصر مضامین ذرا ملاحظہ کیجئے اختصار کے باوجود تشنگی نہیں پائے گا۔ حوبل مضامین بھی مولانا کے مضامین کی طرح اس قدر لاجیٹ ہیں کہ بعض تو لینے اندر افسانوں کی سی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسی پرچہ میں آپ کے بڑے چاراہدی صاحب کا مضمون ہے کیا اسے سمویا جاسکتا ہے

میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں اور خواہ مخواہ کے طول اور بے معنی اختصار سے ضرور پرہیز کروں گا۔

(۵)

فردوس، ماہ ستمبر میں آپ کا اعلان پڑھا۔ اس میں غیر مشہور ادبا کی قدر کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ میں ایک غزل ارسال خدمت کررہا ہوں اور آپ سے انصاف کا متوقع ہوں۔ اگر آپ اپنے اعلان کے مصداق نکلے تو میں دعا کروں گا کہ ہزار دو رسالہ کا ایڈیٹر آپ جیسا انسان بن جائے اور اگر اس اعلان سے مقصود کچھ اور ہے تو برعکس دعا ہوگی۔

فیض محمودی۔ صدر حلقہ ارباب درد۔ تونسہ۔ ضلع ڈیرہ غازیخان

آپ کی غزل قابل اشاعت ہے۔ انشاءاللہ شایع کروں گا۔ لیکن آپ کا یہ لکھنا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر غزل کو شایع نہ کیا گیا تو برعکس دعا ہوگی۔ حلقہ ارباب درد کے صدر کو نقط دردمندی زیب دیتی ہے اور فیض محمودی سے سب کو صرف فیض پہنچنا چاہیئے۔

ایڈیٹروں کا اتنا وقت اچھی نظم ونثر کو شایع کرنے میں صرف نہیں ہوتا، جتنا خراب نظم ونثر کو پڑھنے اور نہ شایع کرنے میں ضایع جاتا ہے۔ بددعاؤں کی کمی نہیں رہے گی۔ لیکن تونسہ شریف سے تو دعائیں ہی آنی مناسب ہیں۔

چلتی کو گاڑی کہیں اور بہنے دود کو کھویا
رنگی کو نارنگی کہیں یہ دیکھ کبیرا رویا　　　کبیر

# ماہ گذشتہ

قائد اعظم کا غم ابھی تازہ تھا کہ ہز ایکسیلنسی شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کی وفات حسرت آیات نے اسے پھر ہرا کر دیا۔ پچھلا زخم ابھی بھرنے نہ پایا تھا کہ ایک چرکا اور لگ گیا

شیخ غلام حسین ہدایت اللہ سندھ کے نمبر ایک کے زمینداروں میں تھے اور یہاں کے مسلمانوں پر اُن کا بڑا اثر تھا سندھی مسلمان معاشی اعتبار سے ساہوکار گردی کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے شیخ غلام حسین ہدایت اللہ نے انہیں اپنی قسمت مسلم لیگ سے وابستہ کرنے پر راضی کیا۔ شیخ صاحب نہ صرف مسلم لیگی سیاست کے ایک چوٹی کے لیڈر تھے بلکہ سندھ اور ہندوستان کے عام سیاسی لیڈروں میں آپ کا شمار تھا۔ سندھ کو حق خود اختیاری آپ ہی کی کوششوں سے ملا تھا۔ اور پہلی گول میز کانفرنس میں آپ نے ہندوستانی نمائندے کی حیثیت سے شرکت فرمائی تھی۔

شیخ غلام حسین ہدایت اللہ پر قائد اعظم کو انتہائی اعتماد تھا اور قائد اعظم سے شیخ صاحب کو والہانہ محبت تھی۔ اسی اخلاص کو دیکھ کر آپ کو قیام پاکستان کے بعد صوبہ سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا آپ پہلے اور واحد پاکستانی تھے جنہیں یہ با اختیار اور معزز عہدہ پیش کیا گیا تھا عالم حیات میں آخری مرتبہ آپ قائد اعظم کی تعزیت کے لئے باہر تشریف لائے اور پھر ایسے واپس ہوئے کہ مرکر ہی نکلے ۔ ۴ر اکتوبر کو ساڑھے تین بجے (سہ پہر) آپ نے اس جہان فانی سے کوچ کیا اور ۵ر کی صبح کو نو بجے میت فوجی احترام کے ساتھ اٹھائی گئی قریباً آدھ گھنٹہ میں جلوس عیدگاہ میدان پہنچا۔ جہاں نماز جنازہ ادا ہوئی۔ اس کے بعد آپ کو وہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

---

شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کے انتقال کے بعد عوام اس تردد میں تھے کہ کون ان کی جگہ سنبھالے گا۔ لیکن ۶ر تاریخ کو جسٹس دین محمد کے انتخاب نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ جسٹس دین محمد کی طرف اب تک عوام کا ذہن نہیں پہنچ سکا تھا، لیکن انتخاب خوب ہے اور بہت خوب خود جسٹس صاحب کو بقول ان کے یہ اطلاع لاہور ریلوے اسٹیشن پر ملی۔ آپ راولپنڈی میں تھے کہ کراچی سے طلبی نامہ ملا اور آپ لاہور تک اس حقیقت سے بے خبر رہے کہ گورنری آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ ۸ر اکتوبر کی شام کو آپ نے حلف وفاداری اٹھا لیا۔ خواجہ ناظم الدین صاحب کی گورنر جنرلی اور جسٹس دین محمد کی گورنری دونوں کو عام و خاص نے پسند کیا ہے۔

---

۱۹ر جولائی ۱۹۴۸ء کو حکومت ہند نے مغربی پاکستان سے ہندوستان جانے والوں پر پابندی عائد کی تو حکومت پاکستان نے حکومت ہند کو سمجھایا کہ یہ پابندی واپس لے لے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف پاکستان کے مسلمانوں کو اپنے اعزا و اقربا سے جو ہندوستان میں ہیں ملنے جلنے میں دقتیں پیش آتی ہیں بلکہ یہ حرکت خود ہندوستان اور پاکستان کی باہمی کشیدگیوں کو دور کرنے میں رکاوٹ ہے۔ مگر حکومت ہند نے اپنا فیصلہ واپس لینے سے انکار کر دیا۔ بالآخر ۱۵ر اکتوبر ۱۹۴۸ء سے پاکستان نے بھی جوابی کارروائی کے طور پر مغربی پاکستان

آنے والوں پر پابندی عائد کر دی اب یہ لوگ پاکستان ہائی کمشنر کا اجازت نامہ لئے بغیر مغربی پاکستان میں داخل نہ ہو سکیں گے۔

یک طرفہ پرمٹ سسٹم متذکرہ بالا خرابیوں کے علاوہ ان ہندوستانیوں کے لئے ایک سخت دشواری پیدا کرتا تھا جن کو پرمٹ سسٹم کے نفاذ کے بعد کسی مجبوری سے اچانک پاکستان آنا پڑتا۔ کیونکہ مستقل پرمٹ قانوناً تو ضرور موجود ہے لیکن عملاً شاید ہی کسی کو ملا ہو۔ اور غیر مستقل پرمٹ کے دو دن کے لئے پاکستان آئے ہوئے احباب کے لئے بھی ہندوستان لوٹنا خطرناک ہو گیا تھا۔ عارضی پرمٹ کی مدت گزر جانے کے بعد یا تو وہ واپس پاکستان تشریف لے آئیں یا بڑے گھر کی ہوا کھائیں۔ اپنے بزرگ بھیا احسان الحق صاحب کا واقعہ اس ضمن میں لکھنا مناسب سمجھتا ہوں۔ آپ نے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے باوجود دلّی نہیں چھوڑی۔ اور دلّی میں آپ کا مسلسل قیام ہے لیکن آپ کے فرزند حیدرآباد (سندھ) آ گئے تھے صاحبزادہ صاحب پر اچانک فالج گرا۔ جوان بیٹا۔ بوڑھے باپ سے سینکڑوں میل دور اور فالج میں گرفتار۔ باپ کو کیسے گوارا ہوتا کہ فوراً اُڑ کر نہ پہنچے چلتے وقت بھیا صاحب نے چیف کمشنر کو اپنی روانگی کی اطلاع دیدی اور درخواست کی کہ وہ ہندوستان کے ہائی کمشنر متعینہ کراچی کو لکھ دیں کہ واپسی کے وقت پرمٹ دیدیا جائے آپ کے تشریف لانے کے دوسرے روز صاحبزادے کا انتقال ہو گیا جب دل کو ذرا سکون ملا تو واپسی کی فکر پڑی۔ لیکن یہاں پرمٹ کہاں۔ چیف کمشنر صاحب دلّی کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آٹھ دس روز اور انتظار کیا لیکن بے سود۔ مجبوراً عارضی پرمٹ لے کر واپس گئے ہیں۔ دیکھئے مدت مقررہ گزرنے کے بعد کیا گزرتی ہے۔ جالی پرمٹ کے بعد کم از کم یہ دشواری جاتی رہے گی۔

* * *

اس سال بھی عید الاضحیٰ ایک خاص اہمیت کی حامل تھی گذشتہ سال آزاد پاکستان کی پہلی عید قربان کچھ ایسے موقع پر آئی تھی کہ قوم اپنی حالت پر اشکبار تھی۔ گھر سے بے گھر سینکڑوں ہزاروں نہیں لاکھوں بھائی مارے مارے پھر رہے تھے۔ ایسے میں کیا عید منائی جا سکتی تھی۔ اس مرتبہ کچھ امید تھی کہ عید شایان شان طریقہ پر منائی جا سکے گی۔ لیکن قائد اعظم اور شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کی وفات نے اس عید کو بھی سوگواری اور سادگی میں بدل دیا۔ البتہ انتظام کے اعتبار سے یہ عید سابقہ عیدوں پر بازی لے گئی۔ قائد اعظم کے مزار کے قریب ایک وسیع لیکن ناہموار پہاڑی نما میدان میں (کراچی کا) سب سے بڑا اجتماع تھا۔ قریباً تین لاکھ انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور سوائے اس خرابی کے کہ کہیں کہیں جگہ درمیان میں خالی نظر آتی تھی صفیں قابل تعریف حد تک سیدھی تھیں۔ غالباً اگلی دفعہ یہ خرابی نظر نہ آئے گی، بشرطیکہ یہ طے کر دیا گیا کہ جب تک اگلی صف بھر نہ جائے دوسری صف نہ شروع کی جائے۔

لاہور کی شاہی مسجد میں عید الفطر کے موقع پر تئیس مسلمان نماز کے بعد دروازے سے نکلتے نکلتے پس کر ہلاک ہو گئے تھے۔ عید الاضحیٰ، خدا کا شکر ہے ساتھ خیریت کے گزر گئی۔

ہندوستان کی طرف سے البتہ فکر تھا۔ کیونکہ دسہرہ اور بقر عید ساتھ ساتھ تھے۔ جبر پچھلے سال کے مقابلہ میں اس سال عید بقر غنیمت رہی۔ گائے کی قربانی کا حق تو مسلمانوں سے چھینا ہی جا چکا ہے۔ مشرقی پاکستان میں دسہرہ اور درگا پوجا کے جلوس پوری شان اور پرانے طور طریقوں کے مطابق نکلے اور الحمد للہ بالکل اطمینان سے نکلے۔

---

حیدرآباد کا جو حشر ہوا وہ سب کو معلوم ہے اب بس انجمن اقوام متحدہ کی بساط پر یہ ایک مہرہ ہے۔ برلن اور فلسطین کی پیچیدگیاں بھی اس انجمن کے لئے دردِ سر بن کر رہ گئی ہیں۔ انجمن گروپوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ مشرقی گروپ اور مغربی گروپ میں تقریری جھڑپیں روزانہ ہوتی ہیں۔ اور ہر لمحہ خطرہ ہے کہ تیسری جنگ عظیم کسی وقت بھی شروع نہ ہو جائے۔ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کی ہمشیرہ مسز پنڈت نے ان تمام مسائل کا یہ حل پیش کیا ہے کہ ہندوستان نے حیدرآباد کے معاملہ میں جو کیا وہ آپ بھی کیجیے۔

---

انجمن اقوام متحدہ کا مقرر کردہ کمیشن اس برصغیر میں خود آیا۔ اس نے تمام حالات کو غور سے دیکھا مگر کئی مہینوں کے بعد بھی وہ کوئی حل پیش نہ کر سکا۔ آگ جلتی رہی۔ اور وادی کشمیر جنت نظیر میں گلگشت کر کے لاکھوں روپے کے خرچ کے بعد یہ لوگ واپس چلے گئے۔ سنا ہے آج کل جنیوا میں اپنی رپورٹ مرتب کر رہے ہیں۔ کشمیر کے متعلق رپورٹ جنیوا جیسے پر فضا مقام پر ہی مرتب ہونی چاہیئے تھی اور جس "تندہی" سے حالات پر غور کیا گیا تھا اُسی نسبت سے رپورٹ مرتب کرنے میں بھی وقت لگنا چاہیئے۔

---

اُدھر پیرس میں انجمن اقوام متحدہ مشرقی اور مغربی طاقتوں کے درمیان جمود کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے، یا یوں کہئے کہ دونوں طاقتوں کو مہلت دے رہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ طاقت مہیا کر لیں اور گذشتہ جنگ عظیم میں اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو آنے والی جنگ میں وہ کسر نہ رہ جائے۔ اِدھر لندن آج کل دولت مشترکہ کے ارکان کا مرکز بنا ہوا ہے۔ غرض شاید یہ ہے کہ جن ارکان کے درمیان کچھ کشیدگی ہو گئی ہو وہ آنے والی مصیبت کے پیش نظر ختم کرا دی جائے اور ایک مشترکہ دفاع کی اسکیم تیار کی جا سکے۔ کانفرنس میں کیا کچھ طے پایا اور کیا کچھ طے ہونے کی امید ہے سب صیغۂ راز میں ہے۔ اللہ تعالےٰ انجام بخیر کرے۔

سید علی مقتدیٰ واحدی

---

# رہنمائے تعلیم کا گاندھی نمبر

رہنمائے تعلیم بہت پرانا رسالہ ہے، جو پہلے لاہور سے نکلتا تھا اور اب دلی سے شایع ہو رہا ہے۔ رہنمائے تعلیم کے مالک اور کرتا دھرتا سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ جی ہیں اور چیف ایڈیٹر حصہ نظم کے جناب جوش ملسیانی اور حصہ نثر کے جناب شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ حضرت نوح ناروی رہنمائے تعلیم کے سرپرست ہیں آج کل غالباً اردو کا یہی ایک پرچہ ہے، جسے سکھ، ہندو اور مسلمان مل کے چلا رہے ہیں۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے کسی سکھ اور ہندو کی بابت میں نے نہیں سنا کہ وہ پہلے اردو میں نظم و نثر لکھا کرتا تھا اور اب اس نے ہندی لکھنا اختیار کر لیا ہے۔ سکھوں اور ہندوؤں کے اردو اخبار بھی سب اردو میں بدستور جاری ہیں البتہ اکثر سکھ اور ہندو اخباروں کا خیال اردو کے بارے میں بدلا معلوم ہوتا ہے۔ رسالے شاید اس تبدیلی سے پاک ہوں۔ کم از کم سرسری نظر ڈالنے سے مجھے رسالہ رہنمائے تعلیم پاک نظر آیا۔

رہنمائے تعلیم کا گاندھی نمبر اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کی ضخامت ایک سو اڑسٹھ صفحے ہے اور قیمت دو روپے۔ لیکن رہنمائے تعلیم کے مستقل خریداروں کو سالانہ چندے میں عام رسالوں کی طرح ملے گا۔ عام رسالوں کی ضخامت ہر مہینے چونسٹھ صفحے ہوتی ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ ہے۔ چندہ سالانہ پانچ روپے۔ گاندھی نمبر میں گاندھی جی کے متعلق ۲۱ نظمیں اور ۱۵ نثر مضامین ہیں۔ ممتاز اہل قلم حضرات کے نام گاندھی نمبر میں نظر آئے۔ جیسے خواجہ غلام السیدین۔ منشی گوپی ناتھ امن۔ سید امتیاز علی تاج۔ شوکت تھانوی۔ حافظ ولایت اللہ۔ مرزا فدا علی خنجر۔ اسد ملتانی۔ عرش ملسیانی۔

اردو کے حقیقی بہی خواہوں کو وہ ہندوستان میں ہوں یا پاکستان میں اس رسالہ کی قدر اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔
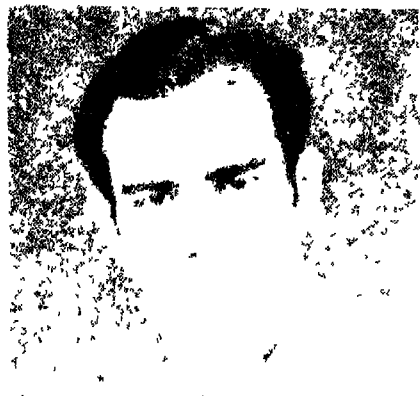
# FIRDAUS

Moderate Rates, Wide Circulation
& Best Representation

THE FIRDAUS

چندہ سالانہ
پانچ روپے آٹھ آنے
ٹیلیفون نمبر ۳۶۶۳

# فردوس

قیمت فی رسالہ
آٹھ آنے
پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱

جلد ۲ | کراچی - مارچ سنہ ۱۹۴۹ | نمبر ۳

## فہرست مضامین



ایڈیٹر۔ محمد واحدی
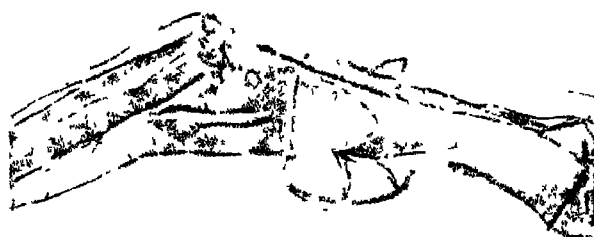
# اِدارۂ فِردوس کی حوصلہ افزائیاں

انجمن ترقی اُردو کے ارگن "قومی زبان" کراچی نے ماھنامہ فردوس کا خیر مقدم ان الفاظ میں کیا ہے:۔

ملّا واحدی صاحب دلّی کے مشّاق و تجربہ کار صحافی ہیں نظام المشائخ۔ اور بعض دوسرے رسائل نکالتے رہے ہیں۔ دلّی کے ہنگامہ کے سبب انہیں بھی ترک وطن کرنا پڑا۔ اب کراچی میں فردوس کی نخل بندی کی ہے۔ مضامین میں تنوّع اور دل کشی اور ہلکا مذہبی و اصلاحی رنگ پایا جاتا ہے۔

رسالہ طلوع اسلام کراچی لکھتا ہے:۔

ہمارے ملّی زوال سے جہاں اور شعبوں میں بے راہ روی پیدا ہوئی وہاں شعر و ادب بھی بے زمام ہوگیا۔ اور لطف یہ کہ اس ادبی اوباش پن کا نام ادب لطیف رکھ لیا گیا اور سمجھ لیا گیا کہ محض اس نام سے اس کی تمام کثافتیں لطافتوں میں بدل گئی ہیں۔ کچھ ارباب ذوق ایسے بھی تھے جو اس ہمہ گیر بے راہ روی کی زد میں نہ رہے اور متانت و سنجیدگی کے مسلک پر گامزن رہے۔ دلّی (مرحوم) کے واحدی صاحب کا شمار ان میں ہے۔ دِلّی اجڑی تو ان کی محفل ادب بھی برہم ہوگئی۔ اب آپ کراچی سے "جگر لخت لخت" کو جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاکہ پھر سے ارباب نظر کی "دعوت مژگاں" کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ اُن کی اس کوشش کا ماحصل "فردوس" ہے۔

رسالہ ہمایوں لاھور لکھتا ہے:۔

"فردوس" دہلی کے کہنہ مشق صحافی اور ادیب جناب واحدی صاحب کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے اور ادب و شعر کو ہلکے پھلکے خوشگوار رنگ میں پیش کرتا ہے۔ ہندوستان کے مراکز تہذیب و ادب کو کاغذ پر محفوظ رکھنے کے لئے خاص جد و جہد کر رہا ہے۔ رسالہ اپنی مخصوص روش پر بہت کامیاب ہے اور لکھنے والوں میں بھی اچھے اچھے اہل قلم کے نام نظر آتے ہیں۔

رسالہ معارف اعظم گڑھ لکھتا ہے:۔

دہلی کے مشہور صاحب قلم جناب واحدی صاحب نے فردوس کراچی سے نکالا ہے، اس کے بیشتر مضمون نگار ہندوستان کے ہیں، اس لئے وہ اچھے ادبی رسالوں کی تمام خصوصیات کا حامل ہے، اگر مقام اشاعت معلوم نہ ہو، تو یہ قیاس بھی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ رسالہ کراچی سے نکلتا ہے، مضامین میں تنوّع معلومات میں افادہ، اور ذہنی لطف و تفریح ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے، کوئی مضمون بھی دلچسپی سے خالی نہیں، دِلّی کے ادیب بے بدل خواجہ محمد شفیع صاحب کا مضمون "ہماری رسموں کا فلسفہ" پرنسپل مشتاق احمد صاحب زاہدی کا مضمون "دلّی سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک" اور "قابل حفاظت خطوط" خصوصیت کے ساتھ بہت دلچسپ ہیں، سندھ میں صحیح ادبی مذاق پیدا کرنے

کے لئے ایسے مضامین کی بڑی ضرورت ہے - ہم کو امید ہے کہ اردوئے معلیٰ کا یہ پودا سندھ کے ریگستان میں نہ صرف بارآور ہوگا بلکہ اُس کو زبان وادب کا لہلہاتا ہوا چمن بنا دے گا۔

## "قومی زبان" کراچی دوبارہ رقم طراز ہے۔

خوشی کی بات ہے، واحدی صاحب کا پودا کراچی میں جم گیا۔ اور نشوونما پا رہا ہے۔ نومبر کا فردوس سات جزو رنگین تصویروں کے ساتھ چھپا ہے - جناب صوفی کا "اردو کا پہلا صوفی شاعر" کے عنوان سے حضرت خواجہ میر دردؔ پر ایک مضمون شاملِ رسالہ ہے۔ لیکن اس میں مسائل تصوف سے زیادہ دوسرے اوصافِ کلام کی تحسین اور حالاتِ زندگی کا سرسری تذکرہ کیا ہے۔ سنِ ولادت درج نہیں۔ اور وفات (۱۱۹۹ھ) کے وقت ۹۸ سال کی عمر شاید سہو کتابت ہے - خواجہ صاحب نے ۶۸ یا ایک قول کے بموجب ۶۶ برس کی عمر میں رحلت کی - یہ شاہ عالم ثانی کا زمانہ تھا۔ لیکن حضرت کی آدھی سے زیادہ عمر سابق بادشاہوں کے عہد میں گزری۔

"اکبر الٰہ آبادی کے کلام کا مطالعہ" بھی سرسری سا ہے تاہم ان دونوں مضمونوں میں بہت سے اچھے شعر چنے ہیں۔

محقی صاحب نے سب سے پہلے مضمون "تقدیر" میں عمر خیام کے مشہور شعر ع

من بدکنم و تو بد مکافات دہی - الخ

پر احتساب کیا ہے۔ حالانکہ یہ نازِ بندگانہ نہیں تو محض لطیفۂ شاعرانہ ہے - یوں بھی بہت سے گنہگار بندے ہیں - جو خیام کی طرح عدل سے زیادہ رحمتِ الٰہی کی وسعتوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

---

اختر انصاری صاحب (اکبرآبادی) ایم اے "ہماری افسانہ نگاری" پر خامہ فرسائی کی ہے - پاکستان میں رہ کر رامائن و مہابھارت کی روحانی قوت و تاثیر اور بھیم وارجن کی بہادری کے قصّے "ہمارے ملک" سے منسوب کرنا کچھ موزوں نہیں نظر آتا۔ بعض اور بے احتیاطیوں کی مثالیں ملتی ہیں -

رسالے میں ایک افسانہ "چراغ کے نیچے" مس اختر قریشی ایم اے نے لکھا ہے۔ اس میں زبان کی دو ایک غلطیاں نظر آئیں - مگر سیدھا سادہ ہونے کے باوجود قصّے کا خاتمہ کافی دلچسپ ہے۔

تحریر میں دلچسپی کے لحاظ سے عبدالخالق صاحب (ایڈیٹر روپیہ اخبار" دہلی) خاص تعریف کے مستحق ہیں کہ خشک علمی اور کاروباری مضامین تک میں کہانی کا مزا پیدا کرنے کا فن جانتے ہیں۔ زیرِ نظر رسالے میں اُن کے مضمون "اپنا حافظہ تیز کیجئے" کی تیسری قسط چھپی ہے - حسنِ بیان کی ایک اور عمدہ مثال اشرف صبوحی صاحب کی "بڑھاپے کی کہانی" ہے جو کہ روزمرہ کے مشاہدے کو نہایت سبق آموز اور نہایت پُرلطف قصہ بنا دیا - خود ٹُوٹی کمشی بڑھیا دلی کی داستان (غدر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۱ء تک) مشتاق احمد صاحب زاہدی نے لکھی ہے۔ جن کی ادبی قابلیت اور قوتِ انشا پردازی کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں۔

---

فردوس کی نظمیں پسندیدہ اوراق میں گل بہ جبد احمد حسین صاحب امجد کا مسدس ہے جس میں ہر بند کے ساتھ

یہ ترجیع آتی ہے ؎

تپش دے، خلش دے، غمِ جاں گسل دے مرے دینے والے مجھے درد دل دے

پنڈت دتاتریہ صاحب کیفی کا نثری مقالہ مناسب وقت دمطبوع خاطر ہے۔ پنڈت جی اردو کی محبت میں رقیبوں کی گلیاں چھانتے اور ان کی زبان سے اپنی زبان کی فضیلت وہمہ گیری کی شہادتیں بہم پہنچاتے ہیں۔ موصوف کو یقین ہے کہ پاکستان میں اردو کو بڑی قوت اور ترقی نصیب ہوگی۔ برخلاف اس کے فردوس کے اس پرچہ میں ایک فی علم (پاکستانی) بزرگ لکھتے ہیں کہ ہم نے فارسی چھوڑ کر ہندو مسلم اتحاد کے خاطر اردو اختیار کی تھی۔ اب ہندو اسے چھوڑ رہے ہیں۔ تو ہمیں بھی اردو چھوڑ کر فارسی کی طرف رجوع کرنا مناسب ہے۔ تائید میں نواب سالار جنگ اوّل کی ایک رائے نقل کی ہے کہ وہ اپنے زمانے میں فارسی چھوڑ کر اردو اختیار کرنا مسلمانوں کے انحطاط کی علامت سمجھتے تھے۔

فاضل مدیر نے اس خیال سے قطعی اختلاف اور اپنا یہ عقیدہ تحریر کیا ہے کہ اردو پاکستان میں "جڑیں پکڑیگی اور انشاءاللہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گی"

## قومی زبان، کراچی کا تیسرا تبصرہ:-

دسمبر کے فردوس کے شروع میں حضرت ساحل بلگرامی کا مضمون ہے۔ جس میں حضرت امام حسینؓ کے جذبہ قربانی میں اُن کے نسب کے اثرات تاریخی روایات سے ثابت کئے ہیں۔ عارف بٹالوی صاحب نے اپنے مختصر سے مقالہ میں جنگ کی فروعات اور امن پر اس کی فضیلت جتائی ہے۔ بحث جوش انگیز اور سبق آموز ہے۔ لیکن بعض گوشے تشنۂ تفصیل رہ گئے۔ اور کہیں کہیں عبارت ربط اور سلاست سے بے نیاز پائی جاتی ہے۔

خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی نے اپنے خط میں تو واحدی صاحب کو لکھا ہے کہ ابھی بزم ادب سجانے کی فرصت نہیں، "رزم حیات یکہ وتنہا لڑ رہا ہوں" لیکن "ہماری پرانی رسموں کا فلسفہ" اپنی بجھی ہوئی اُردو میں سنایا ہے۔ اگرچہ آپ ان باتوں کو تاریخ پارینہ کا باب سمجھنا چاہیئے۔ مضمون میں "حصہ بقرہ" (صفحہ ۳۱) غالباً سہو کتابت ہے۔ مگر ایک جگہ "پانی نما" ترکیب فاضل ادیب کی روانی طبع پر انگشت نمائی کرتی ہے (صفحہ ۲۶)

دو افسانوں میں سے ایک حضرت ماہر القادری کا نوشتہ، ہر چند سیدھا سادہ ہے۔ لیکن تصویر کی حرمت پر شاید اتنا پُر اثر فتویٰ مولوی نہ لکھ سکے جتنی شاعر کی یہ تمثیل کارگر ہے۔

ہمارے دوست عبدالخالق صاحب (ایڈیٹر روپیہ میگزین) نے حسب معمول ادکسی جن گیس کے مضمون میں کہانی کا مزا پیدا کر دیا ہے۔ پرنسپل مشتاق احمد صاحب زاہدی نے دہلی، مرحوم کی داستان ۱۸۵۷ء تک تمام کردی ضمناً ہندوستان کے سیاسی انقلاب کے مشہور واقعات بھی دہرائے ہیں۔ جن کا بالواسطہ یا بلا واسطہ اہل دہلی کے اخلاق ومعاشرت پر اثر پڑا۔ غرض رسالے میں دل چسپی کے ساتھ افادیت کا سامان بھی کافی جمع ہے۔

بہرہ نظم میں اوّل میر حسن کی مثنوی سے حمد کے اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ جو اس رنگین مرقع کا شاید سب سے پھیکا پہلو ہے۔ اسے اردو منظومات میں سب سے افضل قرار دینا، بے جا مبالغہ اور مثلاً مصحفی وحالی کی قدر شکنی معلوم ہوتی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

# اسلامی انقلاب

" دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے، جس نے دس برس کے مختصر عرصے میں، ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفے، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی۔ جنگ کا قانون بدل دیا۔ ایک نئی قوم پیدا کی اور طویل العمر سلطنت قائم کر دی۔ ان تمام کارناموں کے باوجود وہ اُمّی تھا۔ وہ کون؟ محمد بن عبد اللہ۔ عرب اور اسلام کا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم)

اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو اپنے آپ مکمل کر دیا اور اپنے پیروؤں کے لئے اور سلطنت کے لئے ترقی دوام کے اسباب بھی خود مہیا فرما دیئے۔ قرآن اور احادیث میں ایسی تمام ہدایات موجود ہیں، جن کی ایک مسلمان کو دینی اور دنیاوی معاملات میں ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ حج کا سالانہ اجتماع فرض قرار دیا۔ تاکہ دنیا بھر کے اہل استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر دینی اور دنیاوی معاملات میں باہم مشورہ کر سکیں۔ اُمّت پر زکوٰۃ فرض کر کے اُمّت کے غریب طبقہ کی حاجت روائی کا بندوبست کیا۔ قرآن کی زبان کو دائمی اور عالمگیر زبان بنا دیا۔ عربی مسلمانانِ عالم کے تعارف کا ذریعہ ہے۔ قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع عطا کیا اور کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر فقط تقوے کی وجہ سے فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس طرح اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا، جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے مدت تک اس اصول کے مطابق عمل کیا۔ یہ کہہ کر کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر فوقیت نہیں، اسلام میں داخل ہونا ساری دنیا کے واسطے آسان کر دیا۔ نامسلموں کے لئے اسلامی ملکوں میں امن و اطمینان اور عیش و آرام سے سکونت رکھنے کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے اور خدا کا محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فایدہ پہنچائے۔

خاندانی اور ازدواجی اصلاحات بھی پیغمبر اسلام کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ انہوں نے نکاح اور وراثت کے قانون وضع کئے۔ عورت کا مرتبہ بلند فرمایا۔ نزاعات اور مقدمات کے فیصلہ کن قوانین بنائے۔ بیت المال کا نظام قایم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا۔ علم کی اشاعت اور تعلیم اُن کی کوششوں کا بڑا حصہ رہیں۔ انہوں نے

حکمت کو مومن کی گم شدہ میراث قرار دیا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا۔ کیا اِن کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا" یہ ایک عیسائی مورخ کے الفاظ ہیں جس نے اسلام اور پیغمبر اسلام کا ایمانداری کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر تعلیمات جو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہیں چار ابواب پر منقسم ہیں اور اُن ہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے

(۱) عقاید (۲) عبادات (۳) معاملات (۴) اخلاق۔ یہی تعلیمات اسلامی انقلاب کی روح ہیں۔

عرب میں روحانی اور اخلاقی انقلاب پیدا کرنا۔ تمام عالم کے لئے کامل ترین شریعت پیش کرنا۔ توحید۔ مساوات۔ حکمت و دانائی۔ پند و موعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز سے آشنا کرنا۔ اسے اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ خاتم النبیین نے ایک شریعت ابدی کی تاسیس۔ مذاہب عالم کی اصلاح۔ حسنِ اخلاق کی تکمیل قانون الٰہی کا اظہار اور تہذیب نفس کی آخری منزل دکھا کر اپنی تعلیمات میں وہ تمام چیزیں پیدا کر دیں جو انقلاب کے وسیع ترین مفہوم میں پیدا ہونی چاہئیں۔

اب اس انقلابی نظام کا ایک سرسری خاکہ ملاحظہ فرمایئے۔ پہلے جہاد کو لیجئے۔ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت صرف اس صورت میں دی گئی ہے۔ جب اغیار کی دست درازی خطرہ کی حد تک پہنچ جائے۔ نمبر دو۔ جب اشاعت اسلام میں رکاوٹیں پڑنے لگیں۔ نمبر تین۔ جب مسلمانوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اسلام سے قطع تعلق کر لیں۔

اسلام صلح و آشتی کا پیغام ہے۔ اس کے متبعین کو بس ان مخصوص حالات میں لڑائی کی اجازت ہے۔ قرآن نے وفائے عہد کی بڑی تاکید کی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے معاہدے کو جس قدر قابل احترام قرار دیا ہے اُس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ قرآن میں کسی مسلمان کے بے خطا قتل کا جو تاوان رکھا ہے۔ وہی تاوان بعینہٖ اس غیر مسلم کا بھی ہے جس کی قوم سے عہد نامہ ہو چکا ہو۔

جس وقت قرآن نازل ہوا اُس وقت عربوں کی ملکیت میں غلام اور کنیز بہ کثرت تھے۔ قرآن نے انہیں آزاد کرنے کی بہت ترغیب دی۔ زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک خاص حصہ اس لئے مقرر کیا کہ اس سے غلام اور کنیز آزاد کئے جائیں۔ زکوٰۃ اور حج کا تعلق اجتماعی معاملات سے ہے۔ زکوٰۃ سے مقصد یہ بھی ہے کہ اغنیا کی دولت

ضرورت مندوں کو مدد دے۔ حج کا بھی ایک پہلو یہ ہے کہ دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان میدان عرفات میں جمع ہو کر تبادلِ خیالات کے بعد ایک دوسرے کی امداد کے ذرایع پر غور کریں۔ قرآن نے مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیا اور اُن تمام کاوٹوں کو جو مساوات کی راہ میں حایل تھیں ختم کر ڈالا۔ ہر قسم کے نسبی فخر اور خاندانی شرافت کے دعوے کو مٹا کر بزرگی کا معیار تقوے کو بنایا۔ قرآن نے ہر مسلمان کا حق برابر کر دیا۔ اور ہر مسلمان کی جان و مال اور آبرو یکساں بتائی۔

نظام زندگی کی اصلی بنیاد زوجین کے خوشگوار تعلقات پر ہے۔ اللہ تعالےٰ نے عقد نکاح کو پیمان مستحکم فرمایا ہے اور اپنے اس احسان کو جتایا ہے کہ ہم نے زوجین میں باہمی مہر و الفت رکھی ہے اور مردوں کو عورتوں کا اور عورتوں کو مردوں کا لباس بنایا ہے۔

میاں بیوی کے حقوق برابر رکھے۔ لیکن مرد پر مہر فرض کیا۔ وراثت کا ایک مکمل اور مفصل نظام پیش کیا۔ عرب میں عورتیں ترکہ نہیں پاتی تھیں۔ اسلام نے انہیں ترکہ دلوایا۔

آداب کے سلسلہ میں مسلمانوں کو سکھایا کہ جب تم کسی کے گھر میں داخل ہو تو اطلاع کر کے اور اجازت لے کر داخل ہو۔

دولت مندی اور تمول کا مسئلہ ہر مذہب میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ یہودیت نے دولت کی برائی کی ہے اور غربت کو اچھا کہا ہے۔ عیسائیت اور بدھ مت دونوں نے دولت کی سخت تحقیر کی ہے۔ عیسائیت دولتمندی کو نجات کی راہ کا کانٹا خیال کرتی ہے۔ بدھ مت نے ترک دنیا کو نیکی بتایا ہے اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی تعلیم دی ہے۔ لیکن اسلام نے بالکل نیا تخیل پیش کیا۔ وہ کہتا ہے کہ دولت بحیثیت دولت اور غربت بحیثیت غربت نیک و بد اور خیر و شر دونوں صفتوں سے پاک ہے۔ دولت کا درست دنادرست طریقہ حصول اور جایز دناجایز مصرف خیر و شر ہے۔ اگر دولت صحیح طریقے سے حاصل کی جائے اور صحیح طریقے سے صرف کی جائے تو وہ نجات کا ذریعہ ہے۔ اور اگر اُس کے حصول و صرف کا طریقہ صحیح نہیں ہے تو وہ بُری ہے۔ اخلاقی اچھائیاں اور برائیاں امیر و غریب دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ ایک سخی اور فیاض امیر اور ایک قناعت پسند غریب دونوں فضیلت کے ایک ہی درجے پر ہیں۔ علیٰ ہذا ایک مغرور اور بخیل دولت مند اور ایک خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہیں۔ زکوٰۃ کا بنیادی منشا یہی ہے کہ امیروں اور غریبوں دونوں کے اخلاق کی اصلاح ہو جائے۔ دنیا اسلام

کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتی کہ اُس نے سب سے پہلے حصول دولت کے ناجائز طریقوں کی ممانعت کی۔ یعنی دھوکہ۔ فریب۔ خیانت۔ لوٹ مار۔ جُوا اور سود کو حرام قرار دیا۔ "زمین خدا کی ہے اور سب انسان خدا کے بندے ہیں۔ جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے" متروکہ جائداد کا وارث کسی ایک کو نہیں بلکہ بقدرِ استحقاق بہت سے عزیزوں کو بنایا۔ ممالک مفتوحہ کو امیر اسلام کی ملکیت نہیں قرار دیا بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا۔ فطرت کی ان بخششوں کو جو انسانی محنت کی ممنون ہیں جماعتی تصرّف میں دیدیا اور بغیر لڑائی کے دشمنوں سے حاصل کی ہوئی زمینوں کو امیروں کی بجائے غریبوں کا حق قرار دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توراۃ میں علاوہ زکوٰۃ کے خیرات کی تعلیم نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اُس کے حوالے کی گئی ہیں، جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے۔ اسلامی تعلیم ان دونوں تعلیموں کی جامع ہے۔ اسلام نے خیرات کے دو درجے رکھے ہیں۔ ایک قانونی۔ دوسرا اخلاقی۔ قانونی خیرات کی ادائیگی ہر صاحب نصاب پر فرض ہے اور اس کا وصول کرنا اور خرچ کرنا جماعت کے ذمہ لازم ہے۔ اخلاقی خیرات کو ایک بلند روحانی تخیّل کی شے قرار دیا اور بلند ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب بھی دی۔ اس تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف طبیعتوں کے مطابق ہے، اور ہر شخص کے لئے اُس کی اہلیت کی مناسبت سے نجات کا راستہ کھولتی ہے۔ اسلام نے وہ طریقہ سکھایا، جس سے اہل حاجت مستفید ہوں اور نیک کاموں کے لئے بروقت امداد مل سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبہ کمال کے لئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت بھی پیش کر دی۔ ذرا بالشوازم (Bolshevism) یا انارکزم (Anarchism) کمیونزم (Communism) سوشلزم (Socialism) کے ساتھ ساتھ اس اقتصادی نظام کا بھی مطالعہ کیا جائے۔

(۱) جو شخصی ملکیت کو جائز قرار دیتا ہے۔

(۲) جو دولت اور سرمایہ کو چند ہاتھوں میں محدود رکھنے سے روکتا ہے۔

(۳) جو سود کو حرام کرتا ہے۔

(۴) جو متروکہ جائداد کو صرف ایک شخص کی ملکیت نہیں بناتا۔

(۵) جو نفع عام کی چیزوں کو جماعت کی ملک کہتا ہے۔

(۶) جو ہر مالدار پر سالانہ ایک مقررہ رقم کی ادائیگی فرض کرتا ہے۔

(۷) جو مالداروں سے سالانہ رقم (زکوٰۃ) وصول کرنا اور اس رقم کا خرچ کرنا جماعت کے ذمہ لازم کرتا ہے۔

اسلامی نظام حکومت اور نظم مملکت سمجھنے اور سمجھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے خود آنحضرتؐ کی حکومت کا جائزہ لیا جائے۔ آنحضرت کی حکومت دینی حکومت تھی۔ ان کی حکومت کا محور ذات خداوندی ہے۔ اس حکومت کی بنیاد دینی حکومت پر قایم ہوئی۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد جانشینی کا مسئلہ ایک سیاسی ہنگامہ کی شکل میں اٹھا۔ حضرت نے اپنے جانشین کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ کیونکہ حضور کو اعتماد تھا کہ مسلمان خود کسی کو منتخب کرکے اپنا امیر بنالیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بڑی فراست سے اس ہنگامہ کو فرو کیا اور جانشینی کے لئے حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب عمل میں آیا۔ یہ خلافت کی ابتدا تھی۔ خلافت کا اصلی مقصد ناموس اسلام کا تحفظ اور شرعی زاویہ نگاہ سے حکومت کا نظم و نسق ہے۔ حضرت ابوبکر کی بیعت میں نظام شوریٰ کا دخل تھا۔ صحابہؓ کا اجتماع ہوا اور تبادلہ خیالات اور اسباب ترجیح پر نقد و تبصرہ کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کا انتخاب بھی جمہوری اصول پر ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنا فیصلہ صحابہؓ کے مشورہ کے بعد صادر کیا تھا۔ تمام صحابہؓ نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ لیکن یہ طریقہ کار لائحہ عمل نہیں بنایا جاسکتا۔ حضرت عثمانؓ کا انتخاب حضرت عمر کے انتخاب کی نسبت نظام شوریٰ سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اس انتخاب کے وقت خلافت کے متعدد امیدوار تھے اور مسلمانوں کی اجتماعی مجلس کا انتخاب میں بڑا دخل تھا۔ حضرت علیؓ کی بیعت بھی نظام جمہوری کے مطابق تھی۔

خلفائے راشدین کی سیاسی زندگی کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں فرمانروائی حاصل تھی۔ اُن کے اختیارات و فرائض کسی دستور کی شکل میں تفصیل و وضاحت کے ساتھ لکھے ہوئے نہیں تھے۔ مگر اُن کے اقتدار و اختیار کی غیر تفصیلی اور اجمالی حد بندی ضرور تھی۔ فرائض کی بنیاد شریعت اور امت کی رضامندی پر قایم تھی۔ اور وہ ان حدود سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ خلفاء اربعہ نے شرع کی حد میں رہ کر حکومت کے فرائض انجام دیئے۔ اُن کی فرمانروائی کی بنیاد شرعی دستور حکومت تھا۔ اور وہ اس سے سرمو انحراف نہیں کرتے تھے۔ خلافت راشدہ کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ صحیح خلافت جو تمام شرائط

اور قدیم روایات عرب کی حامل ہو، مجموعی حیثیت سے صرف خلفائے اربعہ کے عہد میں پائی جاتی تھی۔

(بہ اجازت اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب - ریڈیو پاکستان - کراچی)

وحید الدین قادری

## نعت

آنکہ ذاتش بود ذات اوّلیں　　آمدہ در شکل ختم المرسلیں
رحم کن یا رحمۃً للعالمین　　من ندانم ایں چنین وآں چنیں
سر نہادم بر درِ والائے تو　　می شناسم قبلۂ ایمان و دیں
دید چوں روئے جنابِ مصطفٰے　　آفریں می گفت صورت آفریں
روز و شب وردِ زبان و دل بُود　　یا شفیع المذنبیں یا شاہ دیں
آرزو دارم حضورِ مُحضورؐ　　یک نظر کن بر منِ زار و حزیں

بر فلک برخیز چوں انگشت پاک
پارہ پارہ شد قمر ماہ مُبیں

قمر عینی الہ آبادی مدیر ادبی پرواز میر اباد بنگالی

صفحہ ۲ کا بقیہ - ماہر القادری نے دِلّی کی یاد میں جذبیت کی غزل کیا لکھی مرثیہ سنایا ہے۔ پہلے تین شعر ہم نقل کرتے ہیں:-

الفاظ نہیں ہیں چیخیں ہیں، اشعار نہیں ہیں نالے ہیں
کچھ گہری گہری چوٹیں ہیں، کچھ نازک نازک چھالے ہیں
قسمت کے اندھیرے میں آکر تدبیر بھی رستہ بھول گئی
راتوں کی سیاہی کیا کہئے جب دن ہی کالے کالے ہیں
چہروں پہ سپیدی غربت کی، ہونٹوں کی ہنسی مرجھائی ہوئی
آنکھیں ہیں کہ سوکھی جھیلیں ہیں، دل ہیں کہ بھڑکے تھالے ہیں

# فرنگی طرز معاشرت اور آداب مجلس

گلستان اُندلس (SPAIN) میں مسلمانوں نے کئی صدیوں تک ایسے زور و شور کی حکمرانی کی ہے کہ اگرچہ مخالفین نے ایڑی سے چوٹی کا زور لگایا، مگر انصاف علم اور تہذیب کے یہ گہرے نقوش، مٹنا تو درکنار، ہلکے ہونے کا نام بھی نہیں لیتے۔

سارے فرنگستان میں، علم اور تہذیب سکھانے کا سرچشمہ، اندلس کے دو بڑے شہر غرناطہ (Granada) اور قرطبہ (Cordova) تھے فرنگستان کی ہر مشہور زبان، فرانسیسی، جرمن، انگریزی، لاطینی وغیرہ میں جو اُندلس کی تاریخیں ہیں، ان میں غرناطہ اور قرطبہ کے فیض کی تعریف میں صفحے کے صفحے بھرے پڑے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ پدرم سلطان بود، ہم ایسے تھے، اور ویسے تھے، اور یوں تیس مار خاں تھے، اور یوں لندھور بن سعدان تھے، اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ جہاں بانی میں ہم فرد تھے۔ حکمرانی میں ہم بے مثل تھے، سائنس اور حکمت میں ہم دنیا کے استاد تھے، ہماری تہذیب سب سے اچھی تھی، ہمارا طرز معاشرت بے مثل تھا اور سب سے بلند تھا۔ ہم نے ہی فرنگستان کو علم پڑھایا، تہذیب سکھائی، یہ ہمارے ہی تو شاگرد ہیں، علم اور تہذیب کے افق پر جب غرناطہ اور قرطبہ سورج کی طرح چمک رہے تھے۔ اس وقت کیمبرج، آکسفورڈ، گوٹن جن (Gottengen) اور پیرس کی یونیورسٹیاں سو رہی تھیں۔

دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

بے شک ان خیالات سے دل بھی بہلتا ہے، اور نیند بھی خوب گہری آتی ہے، اور مُردوں سے شرط لگا کر ہم ایسے سناتے ہیں کہ جھنجوڑنے پر بھی آنکھ نہیں کھلتی، بجائے اس کے کہ ہم جگانے والے کا شکریہ ادا کریں، ہم اُلٹے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ کچی نیند میں کیوں جگا رہے ہو۔

میرے دوستو! آپ حضرات میں کچھ ایسے بھی ضرور ہوں گے جن کو میری بات بُری لگے گی، مگر آپ کو صبر

سکون سے غور کرنا چاہیئے، اور بقول حضرت علیؓ۔ لا تنظر الیٰ من قال فانظر الیٰ ما قال (یہ نہ دیکھ کہ کون کہتا ہے، بلکہ یہ دیکھ کہ کیا کہتا ہے۔)

آپ حضرات میں ایسے بھی ضرور ہیں، جو مجھ سے ذاتی طور سے واقف ہیں، ممکن ہے کہ یہ کہیں کہ مسٹر خالق کو اُن کے بچپن سے انگریزیت بہت چڑ گئی ہے، اس لیئے اُن کی قلم سے فرنگی تہذیب اور طرز معاشرت کی جو تعریف لکھی جاتی ہے تو وہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، ایسا ہونا تو بالکل قدرتی امر ہے۔

یہاں میں اُن کو یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ بالکل خالی الذہن اور غیر جانب دار ہو کر لکھ رہا ہوں۔ سلطان بابو صاحب! میں تو ایک آئینہ ہوں، آپ کا چہرہ خوبصورت ہوگا، تو میں آپ کی خوبصورتی دکھا دونگا، آپ کی ناک کٹی ہوئی ہوگی تو میں نکٹا پن دکھا دونگا۔ آپ کا کان کُترا ہوا ہوگا تو میں صاف صاف کہہ دونگا کہ آپ کے کان کٹے ہیں۔ صاف گوئی میں اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ مجھ سے ریل کے گارڈ ناراض ہو جاتے ہیں، یا بادشاہ سلامت!

ہر چیز کی ایک کسوٹی ہوتی ہے، ایک معیار ہوتا ہے، ان ہی کسوٹیوں، فیتوں، اور ترازو بٹوں سے ہر چیز کو کسا، ناپا اور تولا جاتا ہے، آیئے ہم سچ کو اپنی کسوٹی بنالیں، اور جانچیں کہ آج کل ہمارے شاگردوں یعنی فرنگیوں کی تہذیب اور طرز معاشرت ہم سے کس قدر اچھا ہے۔

**سلطان بابو** "جناب ہمیشہ سے آپ کی زبان سے فرنگی۔ فرنگی۔ فرنگی سنتے سنتے کان بدمزہ ہو گئے ہیں۔ کیا فرنگیوں میں چور لٹیرے نہیں ہوتے، ڈاکو نہیں ہوتے، وعدہ خلاف نہیں ہوتے۔ شرابی، کبابی عیاش نہیں ہوتے، چاہے وہ سردی ہی کی وجہ سے سہی، چھ چھ مہینہ تو نہاتے نہیں، گردن، سر، اور ہاتھ بے شک مل مل کر دھوتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہا کر آرہے ہیں.........."

**حاجی اشفاق** - اچھا پھر اگر فرنگی بات کی پابندی کرتے ہیں، ایماندار ہوتے ہیں، قوانین کی پابندی کرتے ہیں تو لندن، برسلز، برلن، پیرس، روم، میں وکیل کیوں ہوتے ہیں۔ عدالتوں اور ججوں کی تنخواہوں کا خرچ کیوں اٹھایا جاتا ہے، فضول پولیس رکھی جاتی ہے۔ ذرا اس کو بھی اپنی سچ کی کسوٹی پر کس کر دکھایئے" آپ بھی۔ براہِ کرم یہ نہ دیکھیئے کہ کون کہہ رہا ہے، بلکہ یہ دیکھیئے کہ کیا کہہ رہا ہے"

**مسٹر میمن۔** بے شک، بے شک۔ میں بھی حاجی جی کی بات پر صاد کرتا ہوں، ہم سب کو یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ کون کہتا ہے بلکہ یہی دیکھنا چاہیئے کہ کیا کہتا ہے۔ اب یہ دیکھئے میں یہ کہہ رہا ہوں، کہ آپ کی زبان سے اکثر سنتا ہی رہتا ہوں کہ فرنگیوں میں تعلیم ہے۔ تعلیم ہے، تعلیم ہے، اور ہم تعلیم سے بے بہرہ ہیں، بے بہرہ ہیں، بے بہرہ ہیں۔ تو جناب اس تعلیم کا اچھا اثر بھی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ درخت اپنے پھل سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ اس تعلیم کا اثر کیا ہوا.........؟

**حاجی اشفاق۔** "ڈکیتی، ظلم و ستم، لڑائی بھڑائی، خون خرابے، ایٹم بم ......"

**مسٹر میمن۔** "بے شک، بے شک میں حاجی جی کی بات پر صاد کرتا ہوں، آسٹریا نے ۱۹۰۸ء میں، خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے ترکی کے دو صوبوں بوسینا اور ہرزے گوینا کو ہڑپ کر لیا۔ آسٹریا فرنگستان میں ہے، اس نے لڑائی بھڑائی کا بیج بو دیا۔ اب دوسرے تعلیم یافتہ ملک اٹلی نے سوچا، کہ آسٹریا تو موٹا ہو گیا، میں کیوں دبلا رہوں، ۱۹۱۱ء میں ترکی کا افریقی مقبوضہ طرابلس اٹلی صاحب ڈکار گئے۔ خیال رہے کہ اٹلی بھی فرنگستان میں ہے۔ ابھی یہ خون خرابہ چل ہی رہا تھا کہ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جرمنی آسٹریا، اٹلی، روس، فرانس، انگریز یہ سب فرنگستانی ہیں، ان سب فرنگستانیوں میں جوتیوں میں دال تو ہمیشہ ہی سے بٹا کرتی تھی۔ مگر اب کے سے ایسا خون خرابہ ہوا کہ جیتنے والوں اور ہارنے والے دونوں کو چھٹی کا کھایا یاد آ گیا۔ چاہیئے یہ تھا کہ ان میں کچھ عقل آ جاتی۔ مگر عقل چہ کُتی است کہ پیش مرداں بیاید۔ پھر اسپین میں خانہ جنگی شروع ہو گئی، اگر صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ تھے، تو بغیر کشتم کشتا کئے جھگڑا چکانے کی کوئی اور صورت نکالتے ......"

**حاجی اشفاق۔** پھر یہیں تک بس نہیں ہوا۔ یہ تعلیمیافتہ فرنگستانی لڑائی، بھڑائی، اور خونخواری کے معاملے میں درندوں کو بھی مات کرتے ہیں۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے ہم تو یہی سنتے آ رہے ہیں کہ ان میں کتنا چھینا جھپٹی خون خرابہ چلتا ہی رہتا ہے، اسپین کا معاملہ ختم ہونے کے بعد ۱۹۳۶ء میں فرنگستانی موسولینی، بیچارے کبوتر کی طرح معصوم ہیل سلاسی شہنشاہ حبش پر چڑھ دوڑے۔ اور غریب حبشیوں پر زہریلی گیس چھوڑ کر "فتح" کا جھنڈا اڑایا۔ شاہنشاہ کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ حبشیوں کا ملک ہضم کر کے، مسولینی ایسا اکڑ گئے تھے کہ خدا کی پناہ

**سلطان بابو**- بے شک تعلیم یافتہ فرنگستانی موز ولینی ،حبشیوں کو اپنے بوٹ کے نیچے روندکر ایسے اکڑ گئے تھے کہ زمین پر پیر نہیں رکھتے تھے ۔قرآن شریف کی آیت ہے لا تمش فی الارض مرحا زمین پر اکڑ کر نہ چل۔ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہے۔ موز ولینی کی اکڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود ان کو گولی ماردی گئی اور ان کی لاش کئی روز تک منظر عام سڑک کے کنارے پڑی رہی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

**مسٹر میمن**- میں آپ کی بات پر صاد کرتا ہوں۔ دیکھئے فرنگستانی ہٹلر نے کیا کیا۔ دنیا امن چین سے بیٹھی تھی۔ بے فکری سے پیر پھیلا کر اپنی نیند سوتے تھے۔ کوئی کسی سے پوچھنے والا نہیں تھا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

[illegible] دکھلاتے تھے۔ صرف آنکھیں ہی

[illegible] مگر سامنے آگئے، طاقت کے

[illegible] حملہ کر دیا اور اس کے تین دن کے

بعد ایک تیسرا حملہ روس پر کیا [illegible] ۹ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء کو ڈنمارک پر پھر اسی دن ۔ اسی تاریخ کو ناروے پر تو لڑائی بڑھائی تو تیر بہ ہدف اور تیر کی تیزی کے زمانے سے ہوتی ہی رہتی ہے ۔مگر جتنی تیز رفتاری سے ہٹلر نے ملک کے ملک ہڑپ کئے اتنی تیزی سے چڑیمار چڑیاں بھی نہیں پکڑ سکتا۔"

**مسٹر میمن**- میں حاجی جی کی بات پر صاد کرتا ہوں۔

ہٹلر کا موٹو تھا بلٹز کریگ ( Blitz Kerig ) یہ جرمن زبان کے الفاظ ہیں ان کے معنی ہیں بجلی کی سرعت سے لڑائی۔ چنانچہ ۱۰ مئی سنہ ۱۹۴۰ء کو ہٹلر نے لکسمبرگ پر حملہ کر دیا۔ اور اسی دن اور اسی تاریخ کو یونان پر۔ بچپن میں سنا کرتے تھے کہ بس کوئی دن جاتے ہیں کہ دجال آنے والا ہے؛ ہٹلر خیر دجال تو نہیں تھا، کیونکہ دجال کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کانڑا ہو۔ مگر ہٹلر دجال کا قریبی عزیز ضرور تھا۔"

**سلطان بابو**- "ہٹلر کا موٹو اور اس کے حملے تو آپ نے گنوائے ،مگر آپ بڑے عددوں کو بھول گئے۔"

مسٹر میمن۔ "کون سے بڑے عدد؟ جی ہاں خوب یاد آیا۔ ہٹلر نے فرانس پر حملہ کیا، روس پر حملہ کیا، اٹلی پر حملہ کیا۔ یورپ میں کوئی خوش نصیب ملک ایسا ہوگا، جو لڑائی کے اژدہے میں نہ پھنسا ہو"

حاجی اشفاق:"سارے یورپ میں صرف یہ آدھی درجن ملک تو بچے رہے۔ یعنی آئرلینڈ، پرتگال، اسپین، سوئیڈن، سوئٹزرلینڈ اور ترکی، اور باقی تو سارے کے سارے آگ کی لپیٹ میں آگئے۔ ایک اژدھا تھا جو نگلے جا رہا تھا"

سلطان بابو:"اژدھا تو فقط زمین پر ہی نگلے جاتا ہے۔ مگر اس فرنگی تہذیب و نام نہاد تمدن کا "اژدھا" تو ہوا میں اُڑ کر بھی نگلتا تھا۔ اور سمندروں میں بھی۔ سمندر کی سطح کے نیچے۔ بیچ پانی میں بھی توڑ دیکھیاں ظلم ڈھا رہی تھیں۔"

حاجی اشفاق:"آپ ہم کو فرنگی آداب مجلس اور تہذیب کے متعلق بتانا چاہتے تھے، اور ہم نے آپ کی بات سننے سے پہلے ہی آپ سے الجھنا شروع کر دیا۔ پھر آپ فرمائیں گے یہ کہاں کی تہذیب ہے؟"

اقلیدس:"میں یہی دیکھ رہا تھا کہ آپ لوگ خاص طور پر میرا نقطہ نظر معلوم کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ میں ابھی پوری طرح شروع بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ دخل در معقولات"

مسٹر میمن۔ "جناب بادی النظر میں بے شک بد تہذیبی معلوم ہوتی ہے۔ مگر ذرا آپ خوردبین سے دیکھئے۔ اس مضمون کو ہزار ہا ناظرین بھی تو پڑھیں گے، آپ کی وہی دقیانوسی رٹ ہوگی۔ فرنگی! فرنگی!! فرنگی تہذیب!! اگر خلیج بنگال سے لے کر بحیرہ عرب تک بے شمار ناظرین کے دل میں اعتراض پیدا ہوا کہ فرنگی تہذیب سے لڑائی بھڑائی پیدا ہوتی ہے۔ تو ان بے شمار ناظرین کو کون جواب دینے جائے گا۔ ۔ ۔؟"

حاجی اشفاق:"اور آپ بھی تو یہی فرمایا کرتے ہیں کہ گفتگو اگر سائیکولوجی (Psychology) کے قوانین کے ماتحت کی جائے تو پہلے سے سوچ لو کہ کیا کیا اعتراضات پیدا ہوں گے، اور ان کا جواب سب سے پہلے دو۔ لہٰذا اگر آپ کے پاس کوئی معقول منطقی جواب ہے، کہ ایٹم بم خیالی پلاؤ ہے۔ جنگ عظیم آرام کرسی پر بغیر "ہلے جلے" دراز ہو کر "سوچا" ہوا افسانہ ہے۔ لاکھوں یتیم اور بیوائیں جن کی زندگیاں برباد ہو گئی ہیں، دروغ، کذب، جھوٹ اور افترا ہے تو ضرور جواب دیجئے۔۔۔۔۔۔"

**سلطان بانو** - یہ نہ دیکھئے کہ کون کہتا ہے بلکہ یہ دیکھئے کہ کیا کہتا ہے، سچ کی کسوٹی پر جانچئے۔ اگر فی الحقیقت جنگ عظیم ناول نہیں ہے۔ افسانہ نہیں ہے، سینما کا فلم نہیں ہے۔ بچوں کو سلانے کے لئے چڑے چڑیا کی کہانی نہیں ہے تو "سچ کی کسوٹی پر کس کر تسلیم کر لیجئے۔ کہ فرنگی تہذیب، فرنگی آداب مجلس۔ فرنگی تعلیم بجائے ہمارے سامنے تو فقط لڑائی بھڑائی ہے "

**حاجی اشتیاق** - لڑائی افسانہ کیونکر ہو سکتی ہے۔ آپ کی منطقی طاقت کو "بہت سوچ کر" ہم نے تاریخ وار تبادلے تسلیم کئے ہیں۔ جب یاد آیا۔ آپ بھی یاد کیجئے۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں لڑائی [illegible] کی تھیں۔ آپ ہی تو ہمت فرمایا تھا "علی کی سرحت "سے سب ... میں کچھ حقیقت بھی ہے "

[illegible]

کسی نے تیرا علم مجھ سے حاصل نہیں کیا۔ آخر میں مجھے ... تم ... کے میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ مجھ کو تو تم بولنے ہی نہیں دیتے۔

جہاں گل ہوتا ہے، وہاں خار بھی ہوتا ہے۔ گلاب کے پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹا بھی موجود ہے۔ مگر تم ہی بتاؤ کہ ہمارا کیا فرض ہے۔ اچھائی کو دیکھنا یا برائی کو دیکھنا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خذ ما صفا ودع ما کدر، جو چیز اچھی ہے اس کو لے لو، اور جو بری ہے اس کو چھوڑ دو، میں یہ نہیں کہتا کہ فرنگی برے نہیں ہوتے ہیں۔ اُن میں بھی بدتر کہتر ہوتے ہیں۔ مگر ہم اُن کی برائیوں کو دیکھتے ہیں، ان کی شراب، عیاشی اور جوئے کو دیکھتے ہیں۔ مگر اُن کی اچھائیوں پر نظر نہیں کرتے "

**مسٹر جمشید جی** "۔ واقعی اُن میں اچھائیاں بھی بہت ہیں، اب آپ دل کھول کر ان کی تہذیب تعلیم اور طرز معاشرت

کی اچھائیاں گنوائیے، اور ہم ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی غلطیاں بھی بتائیے۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں بچیہ
وعدہ تو نہیں کرتے مگر جہاں تک ہم سے ممکن ہو سکیگا آپ کی بات میں دخل نہیں دیں گے۔"

قلیدس۔ "فرنگی اور امریکی لوگوں میں بہت سی ایسی اچھائیاں ہیں جن پر اسلام نے بہت زور دیا تھا، مگر
افسوس ہم ان کو بھول گئے، اور انہوں نے اختیار کر لیا۔ انہی کی بدولت وہ یا تو براہ راست تمام دنیا پر حکومت
کر رہے ہیں، اور باقی ممالک میں جہاں براہ راست اُن کی حکومت نہیں ہے، اُن کا زور ضرور چل رہا ہے۔ وہ
تقریر کرتے ہیں تو ساری دنیا دھیان لگا کر سنتی ہے۔ ہر چیز کے وجود میں آنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی
ہے، کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے، اس حکومت اور دولت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کا اخلاق ہم
سے بہت بڑھا ہوا ہے .... "

مسٹر میمن۔ "سنیئے ایک نہ شد دو شد۔ بے شک ہم نے وعدہ کیا ہے کہ آپ کی بات میں ہم دخل نہیں دیں گے، مگر
خود بھی تو سوچئے آپ ہی تسلیم کر چکے ہیں کہ فرنگی لوگوں میں شراب، جوا، عیاشی بہت ہے، پھر یہ اخلاق"
کہاں سے آئے۔ "کڑوا اور نیم چڑھا" اس پر طرہ یہ ہے کہ اخلاق ہم سے "بہتر" بھی ہوگئے۔ ماروں
گھٹنا پھوٹے آنکھ"

قلیدس۔ "اخلاق کے بارے میں ہمارے اور فرنگیوں کے معنی الگ الگ ہیں۔ مثلاً عورتوں کا پردہ نہ کرنا ہمارے نزدیک بری
بات ہے۔ فرنگی عورتوں میں چونکہ پردہ کا رواج نہیں ہے، اس لئے پردہ نہ کرنا اُن کے نقطۂ نظر سے کوئی بات نہیں
ہے۔ دوسری مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے گوشت کھانا بڑی بری بات ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر
سے کوئی عیب نہیں ہے بلکہ ہم کو اس کا مطلق احساس بھی نہیں ہے کہ گوشت کھانا عیب ہو بھی سکتا ہے۔ اسی طرح
فرنگیوں کے نزدیک شراب، جوا، عیب میں داخل نہیں ہیں۔ جس طرح ہندوؤں کو حق حاصل نہیں ہے کہ ہمارے
گوشت کھانے پر اعتراض کریں۔ یا جس طرح فرنگیوں کو حق نہیں ہے کہ ہماری عورتوں کے پردے پر اعتراض کریں
اسی طرح ہم کو بھی حق نہیں ہے کہ اُن کے ہاں کی رواجی چیزوں پر اعتراض کریں۔"

کسی کے نزدیک مثلاً سکھوں کے نقطۂ نظر سے سگرٹ پینا، پان میں زردہ کھانا بہت برا ہے۔ ہندو اور مسلمان
سے بہت برا نہیں سمجھتے۔ عام طور پر بڑے بڑے علماء حقہ پیتے ہیں اور پان میں زردہ کھاتے ہیں۔ اسی طرح فرنگ

وغیرہ کو فرنگی بھی بُرا سمجھتے ہیں مگر اتنا خبط ہم سگرٹ، حقہ کو سمجھتے ہیں۔

غیر ازاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر رکھتے ہوئے ہم کو اچھی چیزیں لے لینی چاہئیں، اور بری چھوڑ دینی چاہئیں۔

آیئے اب ہم اُن کی اچھائیوں پر نظر کریں۔

بچوں کی تربیت ماں کی گود و پنگھوڑے سے شروع ہوتی ہے۔ ایک جرمن یا فرانسیسی ماں اپنے بچوں کو "ہوا" سے کبھی نہیں ڈراتی۔ ہمارے یہاں کی عورتیں ذرا سی بات ہوئی اور بچے کا "ہوا" سے ڈرا کر دم [illegible] (Sub-conscious mind) پر جم جاتا ہے۔ تو بڑے ہو کر [illegible] سے بات کرتے ہوئے ڈرتے

[illegible] ہاں بچہ ذرا سا رو دیا

[illegible] ہرگز نہیں کرے گی — دودھ

اپنے وقت پر ہی دے گی [illegible] کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچپن ہی سے وقت پر کھانے کی عادت ہو جاتی ہے۔ جو ساری عمر ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

عرصہ دراز ہوا پنجاب کے اسکولوں میں پہلی دوسری جماعت کے چھوٹے بچوں کو جو اردو کی کتاب پڑھائی جاتی تھی اس میں یہ کہانی لکھی تھی :-

کسی نے ایک حکیم سے پوچھا کہ کھانا کس وقت کھانا چاہیئے۔ حکیم نے جواب دیا، "امیر کو جب بھوک لگے اور فقیر کو جب ملے۔"

حکیم کا یہ جواب نری عقلمندی کا جواب سمجھا جاتا رہا ہے، حالانکہ حکیم صاحب کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو عقل کی ہوا بھی نہیں لگی۔ غور سے دیکھئے اس جواب سے، حکیم صاحب عوام کے دل میں بیقاعدگی کا بیج بو رہے ہیں۔ امیر ہوں یا فقیر، سب کو اپنے وقت پر کھانا کھانا چاہیئے۔ امیروں کو وقت پر کھانے اور ذرا کم کھانے سے، مقررہ ٹائم پر بھوک بھی لگنے لگیگی۔ فقیر کو چاہیئے، جتنے ہی میسر ہوں اپنے وقت پہ کھانے چاہئیں۔

یورپ اور امریکہ میں غریب سے غریب لوگ بھی، جو صرف آلوؤں اور شلجموں پر گزر کرتے ہیں، وہ ان اُبلے ہوئے آلوؤں ہی کو اپنے وقت پر کھاتے ہیں۔

ہمارے ہاں کا باوا آدم نرالا ہے۔ گھر میں اگر پانچ آدمی ہیں، تو ہم ۱۵ اقسام کا ناشتہ ہے۔ ایک صبح کو فقط پانی ہی پیتے ہیں، اور کچھ نہیں کھاتے، دوسرے شربت پیتے ہیں۔ تیسرے چائے پیتے ہیں چوتھے کھجوریاں کھاتے ہیں۔ پانچویں باسی روٹی کا ناشتہ کرتے ہیں۔ پھر ایک اور تماشہ دیکھئے ایک کھانا نو بجے کھاتے ہیں ایک دس بجے۔ ایک بارہ بجے۔ ایک ایک بجے۔ رات کو بھی یہی کیفیت ہے۔ رات کو بارہ بارہ بجے بھی کھانا کھایا جاتا ہے۔

وہاں از چپراسی تا بادشاہ و صدر حکومت کے کھانے کے اوقات ایک ہی ہیں۔ صبح کو آٹھ اور نو کے درمیان حاضری۔ ایک اور دو کے بیچ میں لنچ۔ اور رات کو آٹھ اور نو کے درمیان طعام عشا۔

پھر ہمارے ہاں نیچے فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ ہندستان اور پاکستان میں کروڑوں خاندان ایسے ہیں جو میز پر بیٹھ کر کھانا کھانا معیوب خیال کرتے ہیں۔ فرش پر بیٹھ کر چبا [illegible] ان سے ہم نہیں کہہ سکتے، کھانا جلد ہضم ہو جاتا ہے۔ نوالے بغیر چبائے نگل لینے سے ہماری صحت خراب رہتی ہے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے ہم کو کامیابی نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں دونوں ڈومینینوں میں چالیس کروڑ کی آبادی ہے۔ دونوں ملکوں میں چالیس آدمی بھی نہیں ہیں جو اپنے قوت بازو سے کروڑپتی ہو گئے ہوں۔ ایک آدھ دلی میں، دو ایک کراچی میں، پانچ چھ بمبئی میں سات آٹھ کلکتے میں۔ دو ایک مدراس میں بھی ہوں گے۔ چار پانچ ادھر اُدھر بھی سمجھ لیجئے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ یہاں کروڑوں میں ایک کروڑپتی بھی نہیں ہوتا وہاں ہزاروں میں ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں جراثیم کے مہلک اثر سے کوئی واقف نہیں۔ کسی سے کہو تو انعام میں "وہمی" ہونے کا خطاب مل جاتا ہے۔ تازہ ہوا اور سائنٹیفک طریقے سے ورزش کرنے کا کوئی قائل نہیں۔ کھانا پینا غلط۔ تیز مرچیں اور چٹپٹے مصالحہ دار کھانے کھاتے ہیں، جن سے زبان کا چٹورا پن تو پورا ہو جاتا ہے، مگر خون بگڑ جاتا ہے۔ اور صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم مرتے بہت ہیں۔

ہمارے سال بھر میں ہزار میں سے اٹھائیس آدمی مر جاتے ہیں، یورپ اور امریکا میں سال بھر میں ہزار میں سے

صرف بارہ مرتے ہیں۔ مرنے کے مسئلے میں بھی، زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

اوپر میں لکھ چکا ہوں کہ ہم سائنٹی فک ورزشیں کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ "دھواں دھوں" قسم کی ورزشیں ہیں۔ دبادب ڈنٹر اور دبادب بیٹھکیاں۔ ان سے ہمارے ہاتھ پیر تو بے شک پیا نو باجے کے پائے کی طرح موٹے ہو جاتے ہیں مگر دل کمزور ہو جاتا ہے۔ دل ایسا ہے جیسے گھڑی یا گھنٹے کی بال کمانی۔ اس قسم کی غیر سائنٹی فک ورزشوں سے، انسانی جسم کی یہ "بال کمانی" کمزور ہو جاتی ہے اور گھنٹہ گھر خواہ کیسا ہی مضبوط، ٹھوس اور بلند و بالا کیوں نہ ہو، بند ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے مجرب جسیم و تجیم، لنگھور بن سعدان، رستم ہند اور رستم زمان پہلوان پنیسٹھ، ستر برس کی عمر کو نہیں پہنچتے۔ ہمارے بچپن میں جتنے نامی گرامی پہلوان تھے۔ جیسے غلام پہلوان، کلو پہلوان، کیکر سنگھ، آغا پہلوان، چھٹن میاں، کالے میاں، چولھا میاں، جگی میاں۔ ان میں سے کوئی بھی ۶۵ سال کو نہیں پہنچا۔ شاید ساٹھ برس کے بھی نہیں ہوئے۔ جسمانی حیثیت سے سب دیو کے دیو تھے۔ دودھ کے لڑکنے کے لڑکنے غٹاغٹ پی جانے کی وجہ سے اور حلووں کے کڑھاؤ کے کڑھاؤ" و ڈانگلیوں سے" چاٹ جانے کی وجہ سے چربی بہت پیدا ہو جاتی ہے۔

چربی کے گٹھل کے گٹھل جگر، معدے، دل کے چاروں طرف چمٹ جاتے ہیں۔ جن سے ان اعضا کے فعل میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اگر ہم اپنے گھنٹے میں روئی کے گالے ٹھونس دیں تو جو حشر ہوگا، وہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ دیو ہیکل پہلوان تین تین سو سال کی خبر لاتے۔ مگر چربی اور بال کمانی کی کمزوری کی وجہ سے ایک پٹ ختنی میں غایب ہو گئے!

یورپ اور امریکہ میں بھی بڑے بڑے "مجرب" لوگ ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے موٹے اور بھسپھس مگر وہ اپنی چربی کو بیماری سمجھتے ہیں، اور اس کو کم کرنے کا فکر کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں چربی اور موٹاپا بجائے بیماری کے اچھی صحت کی علامت سمجھا جاتا ہے!

ہمارے ہاں طاقت اور انرجی (Energy) میں فرق نہیں سمجھا جاتا۔ ہم کو ترقی کرنے کے لئے۔ طاقت کی نہیں بلکہ انرجی کی ضرورت ہے۔

مہاتما گاندھی جی، اور حضرت قائد اعظمؒ، طاقتور نہیں تھے، مگر اُن کے جسموں میں انرجی کا ٹھاٹھیں مارتا سمو

(Deanamo) بنتا تھا۔ ایک دیوہیکل پہلوان جب دھواں دھوں ورزش کر کے پڑ جاتا ہے تو اُس سے ہل کر ایک کھجور نہیں اٹھائی جاتی۔ کیونکہ بے چارے میں انرجی مطلق نہیں ہوتی۔ یورپ اور امریکہ میں انرجی پیدا کرنے کی غذائیں کھائی جاتی ہیں۔ دودھ، مچھلی، انڈا، مکھن، پنیر ا

ہمارے ہاں گائے کی پرستش تو ضرور کی جاتی ہے۔ مگر آبادی کے لحاظ سے فی کس تولہ بھر دودھ بھی حصے میں نہیں آتا۔ یورپ اور امریکا میں، کسی نہ کسی شکل میں خواہ وہ پنیر کی شکل ہو یا مکھن کی، آدھ سیر سے سیر بھر تک فی کس دودھ حصے میں آجاتا ہے۔ فرمائیے چستی اور چالاکی اُن میں ہو سکتی ہے یا ہم میں؛ ہمارا طرز معاشرت بہت ہی پست ہے۔ کروڑوں انسان ایک آدھ دھوتی، یا ایک آدھ کرتے پاجامے میں سال سال بھر خوشی خوشی گزارہ کرتے ہیں۔

کروڑوں آدمی ننگے پیر پھرتے ہیں یا سلیپر کی قسم کی روپے سوا روپے کی جوتی پہنتے ہیں، جس سے چلا پھرا نہیں جاتا ہر وقت گھسٹر گھسٹر۔ دلّی جس زمانے میں۔ لی تھی۔ یہ اب تک لکھنؤ اور یو۔ پی میں سلیم شاہی یا سیاٹ جوتی پہننے کا رواج ہے۔ آپ بڑے آدمی ہیں تو چاہے اپنی جوتی میں ہیرے ٹانک لیجیئے۔ مگر رہیگی تو وہی گھسٹر گھسٹر۔

**سلطان بابو۔** جناب بس اب حد ہو گئی۔ ہم کہاں تک خاموش سنتے رہیں۔ آپ ہی تو فرمایا کرتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں از حد غریب ملک ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں لڑائی سے پہلے فی کس آمدنی کا اوسط صرف چھ پیسے تھا۔ فرمائیے، غریب ہندوستانی اور پاکستانی کس طرح مکھن توس، انڈے، پنیر کھا سکتے ہیں، اور کیونکر ٹائی، کالر، کوٹ، واسکٹ، پتلون، بوٹ، ہیٹ کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں؟

**حاجی اشفاق۔** جاڑے کے موسم میں کروڑوں ہندوستانی اور پاکستانی سردی میں اکڑتے ہیں، اگر اُن کے پاس پیسہ ہوتا تو اوورکوٹ اور جیسٹر بنوا لیتے، سردی میں کیوں موں موں کرتے۔

**مسٹر میمن۔** میں بھی حاجی جی کی بات پر صاد کرتا ہوں۔ پیٹ بھر پڑیں روٹیاں تو ساری کہیں موٹیاں، کروڑ ہندوستانی اور پاکستانی گھروں میں روٹیوں کے لالے ہیں، مکھن، انڈا، پنیر، اوورکوٹ، جیسٹر تو بڑی

دور کی چیزیں ہیں۔"

اقلیدس:۔" یہ بالکل صحیح ہے کہ دونوں ڈومینین از حد مفلس ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ اس میں قصور کس کا ہے۔ یہ ہماری تربیت کا قصور ہے۔ بیسویں صدی آدھی کے قریب گزر چکی۔ مگر ان ممالک میں ابھی تک حضرت نوح کے زمانے کے خیالات دلوں میں پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہیں۔ ہمارے ہاں ابھی تک بیکاری کو عیب نہیں سمجھا جاتا۔ کروڑوں سادھو۔ اور فقیر ہیں، جن کو سوسائٹی کھلاتی ہے۔ کروڑوں کسان ایسے ہیں، جو سال میں صرف تین مہینہ کام کرتے ہیں، یعنی ہل جوتنے اور فصل کاٹنے کے زمانے میں۔ باقی نو مہینے ماچے پر بیٹھے حقہ پیا کرتے ہیں، گپ لڑایا کرتے ہیں۔ اگر یہ خالی دنوں میں شہروں میں جا کر کوئی کام کیا کریں، آمدنی تو بہرحال کام کرنے سے بڑھ سکتی ہے۔ خالی بیٹھنے اور اسنعکے تار بجانے سے آمدنی نہیں ہو سکتی بنیا آٹا اور بزاز کپڑا مفت نہیں دے سکتا۔ یورپ اور امریکہ میں، اگر کوئی میلا رہے، مکان میں گندگی رکھے، لباس سیدھی طرح نہ پہنے، یا بیکار رہے تو سوسائٹی اس کو بُرا سمجھتی ہے۔ بڑے بڑے امراء اور کروڑپتی کوئی نہ کوئی کام ضرور کرتے ہیں۔ خالی ڈنڈے بجانا، اور کام نہ کرنا، اُن کے لئے باعث شرم ہے۔ اور وہ یہ بھی سمجھتے ہیں، کہ خواہ کوئی بھی ہو۔ اگر بیکار رہے گا تو کھائے گا ضرور اور کمائیگا کچھ نہیں۔ اس لئے ملک کا افلاس بڑھے گا۔ نپولین بھی یہی کہا کرتا تھا کہ "خالی بیٹھنے سے مفلسی آتی ہے"

ہمارے ہاں اگر صرف سو روپے ماہوار کی بھی آمدنی ہے، تو "شان رئیسی" یہ سمجھی جاتی ہے کہ کوئی کام نہ کیا جائے۔ ایک مثل بھی اسی قسم کی مشہور ہے:۔

"خدا دے کھانے کو، تو بلا جائے کمانے کو"

حاجی اشفاق:۔" واقعی اگر میں یہ سمجھونگا کہ میں بازار میں جب نکل سکتا ہوں، جب میرے پاس کوٹ، پتلون، ٹائی یا شیروانی درست ہو۔ اور میرا کھانا، پینا اور رہنے کی جگہ بھی اچھی ہو۔ فرنیچر بھی میرے پاس ہو۔ تو ان چیزوں کے حاصل کرنے کے لئے، مجھ کو کام بھی کرنا پڑے گا اور محنت بھی کرنی پڑے گی۔ اس کے برخلاف اگر میں نے یہ سمجھ لیا، کہ چار چپاتیاں۔ اور دو کرتے پاجامے، اور ایک چٹائی مجھ کو کافی ہے، تو پھر اس صورت میں مجھ کو کیا غرض جو میں محنت کروں۔"

مسٹر میمن ۔ "میں بھی حاجی جی کی بات پر صاد کرتا ہوں ۔ بالکل ٹھیک ہے ۔ مگر اب سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ دونوں ڈومینینوں میں جو کروڑوں بیکار ہیں ۔ ان کو کام کہاں سے دیا جائے ؟"

اقلیدس ۔ "یہ تو بالکل سیدھی سی بات ہے ۔ سوائے موٹی عقل والوں کے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ معیار زندگی بلند کرنے سے ، ملک کی دولت بڑھتی ہے ، اور پست کرنے سے افلاس بڑھتا ہے ۔ اگر چالیس کروڑ انسان سال بھر میں صرف دو جوتے خریدیں ، تو اسّی کروڑ جوتوں کا سالانہ خرچ ہے ۔ کس قدر جوتوں کے کارخانے قائم ہو جائیں گے اور کتنے لاکھ بیکاروں کو کام مل جائے گا"

مسٹر میمن ۔ "بالکل ٹھیک ہے میں آپ کی بات پر صاد کرتا ہوں ۔ اسی طرح اگر کروڑوں آدمی جوتوں پر پالش کر کے باہر نکلا کریں ، تو کس قدر پالش کے کارخانے قائم ہو جائیں گے ، اور بیکاروں کا کیسا بھلا ہوگا ۔ اسی طرح پھر اگر یہ بیکار بھی اپنے کمائے ہوئے روپے کو خرچ کریں اور اپنے اپنے کوٹ ، جوتے ، ٹوپیاں ، پتلونیں یا پاجامے ٹھیک رکھیں ، تو لاکھوں درزیوں کا کام چلنے لگے گا ۔ بے شمار کپڑے کے میل قائم ہو جائیں گے ۔ اور اس طرح اور لاکھوں کروڑوں بیکار کام سے لگ جائیں گے"

سلطان بابو ۔ "واقعی معیار زندگی بلند کر لینے سے ملک کا افلاس دور ہوتا ہے ۔ اگر میں صبح کو اٹھ کر یونہیں ذرا سے پانی سے منہ پر چھپکا مار لیا کروں ۔ یا کنوئیں ، تالاب یا دریا میں بغیر صابن کے یونہی ڈبکی لگا لیا کروں ، تو میری ذات سے اوروں کو نفع نہیں پہنچ سکتا ۔ اور اگر صبح کو مجھے صابون بھی چاہیئے ۔ تولیہ بھی چاہیئے ۔ منجن اور برش کے بغیر بھی میرا کام نہ چلے ۔ سر کے لگانے کا تیل ، یا کوئی کریم بھی میری ضروریات میں شامل ہو ، تو میں کس قدر تولیوں ، منجن ، برش ، صابن کے کارخانوں کو چلانے میں مدد دے رہا ہوں ۔۔۔ یہ کارخانے قائم ہوتے ہیں تو پھر ان کی وجہ سے ریلوں کو زیادہ کام ملتا ہے ۔ تجارت بڑھنے سے ہوائی جہاز کو آمدنی ہوتی ہے ۔ کوئلے کی کانوں میں زیادہ کام ہوتا ہے ، ملک کے سارے آدمی کام پر لگ جاتے ہیں ۔ ہر جگہ کام ہی کام نظر آئے گا ۔ اور خوش حالی کا چشمہ گھر گھر بہ نکلے گا"

مسٹر میمن ۔ "واقعی فرنگی طرز معاشرت میں ، اور ہماری طرز معاشرت میں بڑا فرق ہے ۔ اُن کے ہاں یہ سکھایا جاتا ہے کہ معیار زندگی بلند کرو ۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں یہ سکھایا جاتا ہے ، کہ ضروریات کو کم کرو ۔

معیار زندگی کو پست کرد، اور اس کا نام سیدھی سادی زندگی رکھا ہوا ہے۔"

**سلطان بابو۔** "یہ بات اب ہماری سمجھ میں اچھی طرح آگئی ہے اس سے پہلے جو میں کلکتے جاتا تھا تو ٹکری کے گلے میں سے، یا چارپائی کی ادوان میں سے ذرا سا رسّی کا ٹکڑا لے لیتا تھا۔ اور دری ہی میں دو جوڑے کپڑوں کے لپیٹ کر اسی رسّی سے باندھ لیتا تھا، اور کلکتے پہنچ جاتا تھا۔ اب میں ہولڈال (بستر بند Hold all) بھی خرید دوں گا۔ ہینڈ بیگ بھی خریدونگا۔ چمڑے کے سوٹ کیس بھی خریدوں گا اور اس سے یہ سمجھونگا کہ جہاں میری اپنی حیثیت اچھی ہوتی ہے، وہاں چمڑے کے کارخانوں کا بھی فائدہ ہوتا ہے"

**مسٹر میمن۔** "اور ایک بات تو رہ گئی، وہ جو آپ کے پاس مٹن کا کھڑکھڑ کرتا ہوا ٹرنک ہے، اس کو کسی غریب کو دیدیجئے۔ اور اُس میں جو کپڑے ہیں، اُن کو غور سے دیکھئے جو ذرا سے بھی قابل اعتراض ہوں، اُن کو بھی کسی کو دیدیجئے۔"

**حاجی اشفاق۔** "کیا اچھا لباس، دکھاوے کی غرض سے پہنیں؟" "میرے خیال میں دکھاوے کی غرض تو غلط ہے: میرے خیال میں اس لئے صاف ستھرا اور بدن پر بالکل ٹھیک لباس پہننا چاہیئے کہ اس سے کام اچھا ہوتا ہے"

**اقلیدس۔** "میں حاجی جی کی بات پر صاد کرتا ہوں۔ فرنگی لباس کی صفائی کا بڑا خیال کرتے ہیں۔ ہر گھر میں ہفتے میں ایک دن مقرر ہوتا ہے اس روز لازمی طور پر عورتیں کپڑے دھوتی ہیں۔ بے شک ہر گھر میں مکمل دھوبی خانہ بھی ہوتا ہے۔ بھٹی چڑھانے کی ٹنکی، ان تمام اقسام کے صابن، کپڑے دھونے کے مصالحے، کپڑے سکھانے کی الگنیاں، استری، استری کرنے کی میز وغیرہ وغیرہ، فرنگی خود کپڑے دھونے کو عیب نہیں سمجھتے، میلا رہنے کو عیب سمجھتے ہیں۔ ...... ..."

**مسٹر میمن۔** "اس کے برخلاف، ہمارے یہاں خود کپڑے دھونے کو عیب سمجھا جاتا ہے، اور میلے رہنے کو نہیں۔ بڑے بڑے لکھ پتی، صرف جمعہ کو کپڑے بدلتے ہیں، خیال فرمائیے، سات دن میں پسینہ، اور اس کی بدبو، لباس کی کیا حالت ہو جاتی ہے"

**حاجی اشفاق۔** "اور اس پر طرہ یہ ہے کہ دن رات وہی لباس پہنے رہتے ہیں۔ رات کو سونے کے لئے بھی لباس

تبدیل نہیں کرتے"

**اقلیدس**:- یہ ہماری تربیت کا فرق ہے۔ کوئی فرنگی ایسا نہیں کرے گا کہ دن کے لباس میں سو جائے، رات کو لباس تبدیل کرنے سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دن کا لباس کم سے کم دس بارہ گھنٹے کے لئے جسم سے علیحدہ ہو جاتا ہے، اور بڑی حد تک اس کے جراثیم مر جاتے ہیں۔

**حاجی اشفاق**۔"جراثیم کے ہلاک اثرات کو تو ہمارے ہاں کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ ہمارے ہاں ابھی تک بے شمار گھروں میں دری چاندنی کا فرش ہوتا ہے، ان گھرانوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے مغربی تہذیب اختیار کرلی ہے، یہ بے تکلف چاندنی کے فرش پر جوتوں سمیت پھرتے ہیں سڑک کے جراثیم جوتوں میں لگ جاتے ہیں۔ جو چاندنیوں میں پھیل کر، اُن لوگوں کے کپڑوں میں، جو ان پر بیٹھتے ہیں لگ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جراثیم سے بیماری پھیلتی ہے"

**سلطان بابو**۔"میں بھی حاجی جی کی بات پر صاد کرتا ہوں، ہم جراثیم کے متعلق ذرا سا بھی ذکر چھیڑتے ہیں تو وہ ہم کو مراقی کہنے لگتا ہے۔ حالانکہ فرنگی اور امریکی، شیر اور سانپ سے زیادہ جراثیم سے ڈرتے ہیں، کیونکہ فی الحقیقت جراثیم، شیر اور سانپ سے کہیں زیادہ ہلاک ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے معقول آدمی وہیں بیٹھے بیٹھے تھوک دیتے ہیں۔ تھوک میں جراثیم ہوتے ہیں، جو ہوا میں شامل ہو کر بیماریاں پیدا کرتے ہیں، اور حضرت عزرائیل کے اسسٹنٹ کا کام کرنے لگتے ہیں"

**مسٹر میمن**:- اگر جراثیم کے اثرات کو نہیں بھی سمجھتے، تو کم سے کم وہیں بیٹھے بیٹھے تھوک دینا بدتمیزی تو ہے۔ یہ ہماری تربیت کا فرق ہے۔ جب بچہ گود میں ہوتا ہے تو فرنگن ماں، اس کو تربیت دینا شروع کر دیتی ہے جراثیم کے متعلق ایک اور بات بہت ہی ضروری ہے، ہم جامع مسجد کے آس پاس کے ہوٹلوں میں دیکھتے ہیں اور ایک دلی میں کیا، کشمیر سے راس کماری تک، اور ڈھاکے سے کراچی تک۔ تقریباً ہر اسلامی ہوٹل میں یہی کیفیت ہے۔ کہ چائے کی پیالیاں دھوئی نہیں جاتیں، بلکہ ایک ناند میں گھول دی جاتی ہیں۔ ابھی ایک تپ دق کا مریض چائے پی کر گیا۔ اُس کی پیالی ناند میں "دھوئی" گئی۔ پانی میں جراثیم بڑھتے ہیں، بلکہ ضرب کھاتے ہیں۔ اس ناند میں تپ دق کے، یا میریا کے، انفلوئنزا کے، اور اقسام

اقسام کے جراثیم کے شہر کے شہر آباد ہوتے ہیں۔ اور ہمارے جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔"

اقلیدس:" سائنس کی تحقیقات غلط نہیں ہیں۔ اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ جو صاحب اس کو وہم اور مراق خیال کرتے ہوں، وہ مجھے اس پتہ پر خط لکھیں۔

"ایس۔اے خالق۔ ایڈیٹر رسالہ روپیہ۔ گلی قاسم جان، بلّی ماران۔ دہلی

اور پہلے سے وقت مقرر کرکے میرے دفتر میں تشریف لائیں، میں اپنی جیب سے تانگے کا کرایہ خرچ کرکے، ان کو ٹپ دق کے ہسپتال میں لے چلونگا۔ اور ایک مسلمان مریض کو آدھا گلاس پانی پلاؤ نگا، اور باقی آدھا گلاس اُن بہادر صاحب کو دونگا کہ پی جایئے۔

قرآن شریف کی آیت ہے:۔

لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ — اپنے ہاتھوں ہلاکت کے منہ میں نہ جاؤ۔

غصہ نہ ہو جیئے، گلا نہ پھلایئے۔ میں نے کلام مجید کی آیت پیش کر دی ہے۔ پھر بھی اگر آپ کی بہادری ابلی پڑتی ہے، اور اگر آپ کسی ایسے شہر میں رہتے ہیں، جہاں چڑیا خانہ ہے، تو کل صبح کو چڑیا خانے میں جاکر، اپنی بہادری کا تماشہ، اپنے ہی شہر والوں کو دکھایئے، اور شیر کے پنجرے میں ہاتھ ڈال کر اپنا داہنا ہاتھ، شیر کے منہ میں دیدیجئے۔ دیکھئے داہنے ہاتھ کی شرط ہے بائیں ہاتھ کی نہیں ہے۔ اس لئے کہ داہنا زیادہ کام کا ہوتا ہے۔

گاؤں گنویں، اور قصبات کے رہنے والے "بہادر" جنگل میں جاکر ایک کالے زہریلے سانپ کی دُم پکڑ لیں، اور ذرا اسی قسم کا تماشہ اپنے گاؤں والوں کو دکھائیں! جتنا میرے خود نویس، قلم میں زور ہے، اور جتنی میرے دماغ میں طاقت ہے، وہ سب میں ان سطروں پر لگا رہا ہوں، کہ آپ کے دل پر پتھر کی لکیر کی طرح یہ از حد ضروری بات نقش ہو جائے کہ جراثیم ڈھکوسلا نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ہماری اور فرنگی تربیت کا فرق ہے کہ ہم ان کو ڈھکوسلا سمجھتے ہیں۔

اگر ایمانداری سے کہا جائے تو بس یہی فرق ہے کہ شیر اور سانپ ہم کو دکھائی دیتے ہیں، اور جراثیم دکھائی نہیں دیتے۔ اب آپ ذرا کچھ صفائی کے متعلق بھی سنئے۔ ایک ایک بڑھیا انگریزن،

فرانسیسی اور امریکن اپنے گھر کو روزانہ دھوتی ہے۔ اچھی طرح ایک ایک چیز کو جھاڑتی ہے اور ہفتے میں ایک دن ضرور خاص طور پر گھر کی صفائی کرنے کے لئے مقرر کر لیتی ہے، اُس روز ایک ایک کونے کُترے کو، ایک ایک کتاب اور تصویر کو اس طرح صاف کرتی ہے کہ گھر چندن سا ہو جاتا ہے۔

چوہوں، کیڑے مکوڑوں، نیولوں، سانپوں وغیرہ کا مار مار کر پڑا کر دیا جاتا ہے، چاہے چھوٹا سا کھنڈلا ہی کیوں نہ ہو، کھانا کھانے کی جگہ علیحدہ ہوتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو ایک الگنی اور ایک پردہ لٹکا دیتے ہیں، یا ایک الماری ایک طرف کھڑی کر دیتے ہیں، جس سے کھانے کا کمرہ علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اور بچے، بڑے، بڈھے سب وہیں کھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ بات جانتے بھی نہیں کہ کھانے کی جگہ علیحدہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ چینی، یا ایٹم کی قسم کے چھوٹے چھوٹے بھوروں کے خوردبینی ذرات بھی گریں، تو چونکہ کھانے کو ملتا ہے اس لئے چیونٹیاں چوہیاں آنے لگتی ہیں، چوہے اور چوہیاں پلیگ کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں شہروں کے اوپر چیلیں منڈلاتی رہتی ہیں۔ اس لئے کہ قصائی سڑک پر چھیچڑے پھینک دیتے ہیں۔ چیلوں کو کھانے کو نہ ملے تو نہ دکھائی دیں۔ مخیر اور نرم دل اصحاب، جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں کو کھلانے کے اور اور طریقے دریافت کرسکتے ہیں۔ ایک اور ستم ظریفی دیکھئے، باغ میں ابھی صفائی کی گئی ہے، ایک صاحب دو پیسے کی مونگ پھلیاں لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور سارے میں کوڑا پھیلا دیتے ہیں۔ ایک دوسرے صاحب گنا لے آتے ہیں، اور اس کے چھلکے گھاس کے زمردیں تختہ پر اس بُری طرح پھیلا دیتے ہیں کہ گھن آنے لگتی ہے۔ فرنگی لوگ پبلک مقامات کی صفائی کا بھی اتنا ہی خیال رکھتے ہیں، جتنا اپنے گھر یا دفتر کا۔

## کھانے پینے میں صفائی اور تمیز

غریب سے غریب فرنگی کی کھانے کی میز پر صاف ستھرا کپڑا بچھا ہوا ہوتا ہے۔ پانی کے گلاس اور پلیٹیں چم چم کرتی ہوئی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامی نے گھربار منادی میں اپنے متعلق شائع فرمایا تھا کہ

"صفائی سے کھانا کھانا چاہتا ہوں اس کے لئے بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔ وقت پر کھانا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔"

جو کیفیت حضرت خواجہ صاحب قبلہ کی ہے، وہ کیفیت تقریباً ہر فرنگی کی ہے۔ وہ اس لئے بھی محنت کرتا ہے کہ اچھا کھانے کو ملے اور اس لئے بھی محنت کرتا ہے کہ صفائی سے ملے اور وقت پر ملے۔ ہمارے ہاں یہ کیفیت صرف خال خال حضرات تک محدود ہے۔

## بے جا تکلف

اگرچہ استاد ذوق بڑے زور سے تکلف کرنے کو منع کرتے ہیں، مگر استاد کی سنتا کون ہے ؎

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

فرنگی لوگ کھانے پینے میں مطلق تکلف نہیں کرتے۔ اگر کھانا کھاتے ہوئے کوئی چیز اُن کے سامنے پیش کی جائے اگر کھانی ہوتی ہے، تو خاموشی سے لے لیتے ہیں۔ اور نہیں کھانی ہوتی تو خاموشی سے انکاری گردن ہلا دیتے ہیں۔ ذراسی گردن ہلا دینا بالکل کافی سمجھا جاتا ہے۔ ہماری تہذیب میں یہ بات داخل ہے کہ میزبان یا صاحب خانہ کو زور دے دے کر کہنا چاہیئے۔ ایک چمچہ اور، ڈیڑھ چمچہ اور ـــــ دو نوالے اور ـــــ چار نوالے اور ـــــ اور اور ـــــ اور ـــــ اور من چاہے مُنڈیا ہلائے۔ باوجود بھوکے ہونے کے، مہمان کو اتنے ہی زور سے دو ہاتھ نچا نچا کر منع کرنا چاہیئے اور یہ کہنا چاہیئے کہ میرا پیٹ بھر گیا ہے۔

اگر مسٹر یولس، سلطان بابو، اور مسٹر ہیمن کو ایک چائے کی میز پر بٹھا دیا جائے، میز پر چائے کی کیتلی ہے اور تین پیالیاں ہیں اور چار اُبلے ہوئے انڈے اور چار کیلے ہیں۔ خیال رہے کہ چائے پینے والے تو تین ہیں اور کیلے اور انڈے چار چار ہیں۔ اُن سے یہ بھی کہا جائے کہ چائے پینے کے دوران میں اس ضروری مسئلہ پر تبادلہ خیالات کرنا۔ اور کچھ نہ کچھ طے کر کے اُٹھنا۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اس چائے کا تماشا دیکھئے ایک ایک انڈا اور ایک ایک کیلا تو یہ خاموشی سے کھالیں گے۔ اب ایک انڈا اور ایک کیلا بچا۔ ان کی تقسیم ناممکن ہے۔ دو سلطنتوں میں سرحدوں کے متعلق فیصلہ ہو سکتا ہے۔ مگر نہیں ہو سکتا تو اس بات کا فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ یہ انڈا اور کیلا کون کھائے۔ یہ انڈا آپ لیجئے ـــــ یہ کیلا آپ لیجئے ـــــ نہیں یہ آپ لیجئے۔ نہیں یہ آپ ـــــ آپ ـــــ آپ ـــــ یہ انڈا آپ ـــــ پھر نہیں تک

نہیں کہ زبانی انکار ہوں بلکہ خوب زور زور سے اور خوب ہاتھ نچا نچا کر۔ اگر جلین کے باہر کوئی صاحب کھڑے سن رہے ہوں، تو وہ یہ سمجھیں گے کہ لڑائی ہو رہی ہے۔

جب سے اناج مہنگا ہوا ہے میری بھوک بہت بڑھ گئی ہے۔ تھوڑے سے دن ہوئے، مجھے اپنی ہمشیرہ کے ہاں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ بھائی صاحب بھی شریک طعام تھے، اس لئے اور بھی زیادہ تکلف کی ضرورت تھی۔ اول تو میری خوراک زیادہ اور اس پر طرہ یہ کہ مزیدار کھانا۔ لذیذ کھانے دیکھ کر میری اور آپ کی بھوک اور بڑھ جاتی ہے۔

سوچتا تھا کہ تکلف کی کیا صورت ہونی چاہیئے۔ میں ان چیزوں کا عادی نہیں۔ اس لئے میں بھول جاؤنگا۔ آخر میں نے اپنے بھانجے مسٹر نور الدین سے انگریزی میں کہا کہ مناسب موقع پر مجھے یاد دلا دینا، تو میں باوجود بھوکا ہونے کے کہہ دونگا کہ میرا پیٹ بھر گیا ہے!

فرنگی لوگوں پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہے گا کہ آپ کا کام تیار کر کے ساڑھے چار بجے لاؤنگا۔ تو وہ آجائے گا۔ آپ اُس کی بات پر بھروسہ کر سکتے ہیں اس سے اشتراک عمل بنتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اشتراک عمل سے ہی ملک و قوم ترقی کر سکتی ہے۔

ہم یہ پورا بھروسہ کہاں کر سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کاتب کہہ گئے ہیں کہ پرسوں دو بجے آپ کا کام تیار کر کے لے آؤنگا۔ اس وعدے کی بنا پر ہم چھاپے خانے والے کو کہاں کہہ سکتے ہیں کہ پرسوں سوا دو بجے چھپائی کا کام بھیج دیا جائے گا۔ گمان غالب یہ ہے کہ کاتب وعدے پر ہرگز نہیں آئیں گے۔

ملکی اور قومی ترقی کا بہت بڑا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی بات پر بھروسا کریں اور اشتراک عمل کریں گھڑی کے ایک پہیے سے دوسرا پہیہ (Wheel) مل کر چلتا ہے۔ اگر ایک پہیہ نہیں چلتا تو ساری گھڑی بگڑ جاتی ہے۔ گھروں میں ہو، دفتروں میں ہو، کارخانوں میں، یا سلطنت کے معاملات میں، ایک دوسرے کی بات پر بھروسا اور اشتراک عمل بڑی چیز ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں، کاموں میں دیر لگتی ہے، رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ جھگڑے ہوتے ہیں، الجھنیں ہوتی ہیں، ایک سے دوسری خرابی، دوسری سے تیسری، اور تیسری سے چوتھی۔ یہاں تک کہ سارا معاملہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ آپ کیونکر یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، کہ کل آپ فلاں کام ختم کریں گے۔

جب آپ کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ آپ کو کھانا ٹھیک وقت پر مل سکے گا - یا آپ کے مددگار اور ساتھ کام کرنے والے، خود اپنے ضمیر کے مطابق، اپنے فرائض بالکل ٹھیک طرح انجام دیں گے۔

یورپ اور امریکہ میں صدر حکومت یا بادشاہ سے لے کر چپراسی تک۔ نہایت خوش دلی سے۔ اپنے فرائض انجام دیتے ہیں - ہمارے ہاں کام کرتے تو ہیں - مگر فرض ادا کرنے کا احساس اور خوش دلی دونوں مفقود ہیں۔ مارے باندھے کام کیا جیسے کوئی ہتیا ٹال دی!

فرنگن بیوی کے میاں جب اپنا دن کا کام ختم کر کے، گھر پر آتے ہیں، تو بیوی آگا تاگا لیتی ہیں۔ کوٹ اتارنے میں مدد دیتی ہیں۔ آرام سے بٹھاتی ہیں۔ منہ ہاتھ دھونے کے لئے صابون، پانی، تولیہ تیار رکھتی ہیں۔ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی چیز ضرور مرغوب ہوتی ہے، بیوی جانتی ہے کہ میاں کو ایس پرگیس (Aspragus) پسند ہے تلے ہوئے آلو، انڈے، مچھلی، یا مرغ کی ٹانگ - وہ ان چیزوں کا دھیان رکھتی ہیں، اور ان میں سے کچھ نہ کچھ ضرور تیار رکھتی ہیں۔

میاں کا سلیپر (Sleeper) اس کی کتاب، اخبار، اس کی چھوٹی سی گول میز، اُس کی آرام کرسی، تیار ملتی ہے۔ گھر میں پہننے کا لباس، پہلے ہی سے ٹھیک کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ گھڑی گھڑی میاں کو اُٹھنا، اور بات بات کے لئے کچھ کہنا نہیں پڑتا۔

گھر میں آنے کے بعد میاں کی ایسی خاطر تواضع ہوتی ہے کہ ضرور اُس کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ میں بہشت میں آگیا ہوں۔

ہمارے ہاں کے نئے دولہا، جن کی آج کل سسرال میں بڑی آؤ تواضع ہو رہی ہے، اس کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ یہ سسرال میں ہے، اور چند روزہ ہے، اور اُن کے ہاں گھر میں ہے اور ہمیشہ ہے۔ گھروں کی جب یہ کیفیت ہو تو دوسرے دن میاں کام پر شیر کی طرح کیوں نہ جائے اور خوب دل لگا کر ہنسی خوشی اپنا کام کیوں نہ کرے۔ یہی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف، خال خال مثالیں چھوڑ کر، ہمارے ہاں عموماً یہ کیفیت ہوتی ہے، کہ شام کو کام پر سے میاں مرتے کھپتے گھر پہنچے، تو دیکھتے کیا ہیں کہ بیوی اٹوائی کھٹوائی لئے پڑی ہیں۔ مُنہ تھتھنا ہے حاجت کرو تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔ گھر پہنچ کر میاں کے "فرائض" میں یہ بھی

شامل ہے کہ بیوی کو منائے، کھانا کھانے کے لئے سو پچاس دفعہ کہے۔ اور ہر مرتبہ جواب میں خاموشی، اور یا یہ سنے کہ "مجھے بھوک نہیں ہے"۔

گھر کی اس دل خراش فضا کی وجہ سے دوسرے دن، میاں گیدڑ کی طرح اپنے کام پر جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گھر کی پریشانی کی وجہ سے۔ اپنا کام دل لگا کر کیونکر کر سکتے ہیں، اور کیونکر موجودہ حالت سے ترقی کر سکتے ہیں؟

فرنگی لوگوں میں، آپس میں کوئی غلطی ہو جائے، یا اتفاق سے کوئی وعدہ خلافی ہو جائے، یا کوئی کسی کی توہین یا ہتک کرے تو "مجھے افسوس ہے" کہنے سے معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور دل صاف ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں برسوں ذرا ذرا سے معاملے کو بگاڑا جاتا ہے، اور ایک سے دوسری الجھن پیدا ہوتی ہی رہتی ہے۔

فرنگی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی نظر رکھتے ہیں اور اُن کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ مثلاً اگر جوان لوگ ضعیفوں کے یا عورتوں کے ساتھ جا رہے ہوں، تو اپنے قدم کو ہلکا کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ عورتوں کا، یا بڈھوں کا قدم اُن کے ساتھ ساتھ اُٹھ نہیں سکتا۔

میز پر اگر کوئی لکھ رہا ہو، تو لکھنے والے کے کاغذ پر نظر نہیں جاتے۔ کسی کے خطوط پڑھنا، بڑا بھاری عیب سمجھتے ہیں۔ اگر کسی سے ملاقات کرنے جاتے ہیں، اور وہ مصروف ہو، اور یہ کہدے کہ میں مصروف ہوں، اس وقت ملاقات نہیں کر سکتا۔ اور یہ خوش دلی سے واپس آجاتے ہیں۔ ہمارے ہاں گھر میں بیٹھے ہوتے ہیں، اور بیوی سے کہدیتے ہیں کہ "کہدو ہیں نہیں"، یہ بڑی اخلاقی کمزوری ہے۔ صاف صاف سچ سچ کہدینا چاہیئے کہ فرصت نہیں ہے، یا میں ملاقات کرنی نہیں چاہتا وغیرہ۔

فرنگی قوانین کی پابندی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ باغ کے کسی تختے کے پاس لکھا ہو کہ "گھاس پر نہ چلو" تو گھاس پر نہیں چلتے۔ ہمارے ہاں یہ کیفیت نہیں ہے۔ اگر کوئی صاحب تحصیلدار ہیں، تو اس جگہ گھاس پر نہ چلنے سے ان کی تحصیلداری میں فرق آتا ہے۔ ساتھیوں کی نظر میں سُبکی ہوتی ہے۔ اس لئے تحصیلدار صاحب تو ضرور ہی گھاس پر چلیں گے۔ اُن کے ہاں یہ بات بھی ہے کہ سنیماؤں اور ڈاک خانوں وغیرہ میں، جہاں عوام کو کام پڑتا ہے۔ اس اُصول کو مدنظر رکھا جاتا ہے کہ جو پہلے آئے تو اُس کا کام بھی پہلے ہو۔ ہمارے ہاں گاؤں کے پٹواری، یا نائب تحصیلدار صاحب اگر ڈاک خانے پہنچ جائیں تو یہ سب سے پہلے، باقی اور سب سے پیچھے۔

وہاں بڑے بڑے لارڈ، اور کروڑپتی خوش دلی اور صبر سے، لائن میں اپنے نمبر پر کھڑے رہیں گے۔

ہمارے ہاں راستے میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو عموماً، ...... اس قسم کے سوالات کرتے ہیں۔ "کہاں سے آئے اور کہاں چلے" یہ چیز خاطرداری میں شامل سمجھی جاتی ہے۔ اس قسم کے سوالات فرنگی تہذیب میں عیب میں داخل ہیں، وہ کسی کے پرائیویٹ معاملات میں دخل دینا۔ پسند نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں کسی سے ملاقات کرنے جاتے ہیں، تو مکان کا کرایہ اور بچوں کی تعداد بھی پوچھتے ہیں، بلکہ یہاں تک ہے کہ تانگے والے کو اس وقت تک کرایہ نہیں دیتے، جب تک اُس کے گھوڑے کا خرچ، بال بچوں کی تعداد، اور جائے پیدائش نہ معلوم کرلیں۔

فرنگی اور امریکی لوگ ٹیکس (Tax) بڑی خوشی خوشی دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر حکومت کو ٹیکس نہیں دیا جائے گا تو خزانہ خالی ہو جائے گا۔ اور حکومت کا نظام کیونکر چلے گا اور پھر ہماری اپنی حفاظت کیونکر ہوسکے گی۔

میونسپل کمیٹی کو بھی بڑی خوش دلی سے ٹیکس دیتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مدرسوں، لائبریریوں، صاف ستھری سڑکوں، بجلی کی روشنی، شہر کی صفائی، پانی وغیرہ سے ہم خود فائدے اٹھاتے ہیں۔ اگر کمیٹی کے پاس روپیہ نہ ہوگا، تو ہمارا اپنا کام درہم برہم ہو جائے گا۔

## مہمان اور مہمان نوازی

فرنگی لوگوں میں مہمان داری کا دستور بہت کم ہے۔ اکثر لوگ ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں۔ کہ کسی کے یہاں مہمان رہنے سے میزبان اور مہمان دونوں کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ اس پر بھی اگر کسی کے یہاں کوئی مہمان ہوتا ہے، تو وہ اس بات کا خیال رکھتا ہے، کہ میزبان کے گھر کے قوانین کی پابندی کرے۔ اس کے برخلاف ہمارے یہاں کوئی مہمان ہوتے ہیں۔ تو وہ یہ چاہتے ہیں، کہ اگر وہ دو بجے اپنے گاؤں میں کھانا کھایا کرتے ہیں، تو صاحب خانہ بھی اُن کے قاعدے کی پابندی کریں۔ وہ یہاں کا کارخانہ اپنے گھر کے حساب سے چلانا چاہتے ہیں۔ پھر بعض اوقات مہمان کئی کئی ہفتے تک ٹھہرے رہتے ہیں، اور زندگی اجیرن کردیتے ہیں۔ کام کے اوقات میں کھل کر آن بیٹھتے ہیں، اور عموماً لایعنی اور ٹھار ٹھار کر ایسی باتیں کرتے ہیں، گویا ان کو ہزار دو سال کی فرصت ہے۔ پھر مشہور مقامات کی سیر کرانی، اور بازار چل کر ان کو "سوئٹر" دلوانا، یا سینما اُن کے ہمراہ

جانا بھی میزبان کے فرائض میں شامل ہے۔

ایک اور بڑی مصیبت یہ ہے، کہ رات کے بارہ بارہ بجے، بغیر اطلاع کے مہمان صاحب نازل ہو کر کنڈی کھلواتے ہیں، یا اگر پہلے سے اطلاع بھی دیتے ہیں، تو مبہم الفاظ میں، جیسے کہ میں پرسوں یا اترسوں آؤں گا، یا پیر کی صبح کو پہنچوں گا۔ کسی کی صبح چھ بجے ہوتی ہے، کسی کی سات بجے، کسی کی آٹھ بجے، کسی کی نو بجے۔ تاریخ اور وقت کا تعیّن کرنا ازحد ضروری ہے۔ بے شک اتنا لکھا جا سکتا ہے، کہ اگر ریل اپنے وقت پہ صبح آٹھ بجے پہنچ گئی، تو میں ساڑھے آٹھ تک آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔

فرنگی لوگ تقریبوں، دعوتوں اور شادیوں میں، چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ نہیں لیجاتے۔ بچے ضد کرتے ہیں، روتے ہیں، نہیں کھاتے، اس سے تقریبوں میں رنگ میں بھنگ پڑجاتی ہے ہمارے یہاں جب تک چھوٹے بچوں کو ساتھ نہ لے کر جائیں، تو بیوی کا منہ پھول جاتا ہے، اور گھر میں بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔

سلطان بابو: جناب ہم نے یہ بھی دیکھا ہے، کہ کسی محفل میں بیٹھ کر ایک صاحب اس طرح زور، زور سے باتیں کرنے لگتے ہیں، گویا وہ ساری محفل کے اجارے دار ہیں، اور کسی کو بولنے یا بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔"

حاجی اشفاق۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے، کہ محفل میں بیٹھ کر خود اپنی تعریف و توصیف بھی بیان کرتے ہیں، اور حاضرین سے اپنی داد چاہتے ہیں۔"

مسٹر میمن۔" میں بھی حاجی جی کی بات پر صاد کرتا ہوں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے، کہ محفل میں کوئی نہ کوئی صاحب ایسے بھی ہوتے ہیں، جو اپنی دولت کا اظہار کرتے ہیں، اپنے علم کا اظہار کرتے ہیں، اور اپنے اثر و رسوخ کو لوگوں پر جتاتے ہیں۔"

سلطان بابو۔ "کیا مطلب؟ ذرا اس کو واضح کیجیے۔"

مسٹر میمن۔ "مثلاً (قارئین کرام نوٹ کرلیں، کہ یہ مثال بالکل فرضی ہے) میں یہ کہوں کہ ۱۹۳۶ء میں دلی کے امپیریل ہوٹل میں ایک پارٹی تھی۔ جیسے ہی میں اس میں پہنچا، تو میں نے دیکھا، کہ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ تشریف رکھتے ہیں، اور نواب لیاقت علی خاں صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔

مجھے دیکھتے ہی حضرت خواجہ صاحب قبلہ بڑے تپاک سے پیش آئے۔ اور میرا نواب لیاقت علی خاں صاحب سے تعارف کرانا چاہا۔ نواب صاحب نے اسی وقت فرمایا۔ میں تو مسٹر میمن سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ کیوں مسٹر میمن۔ آپ کو یاد ہو گا کہ چار پانچ مہینے ہوئے آپ مسٹر جناح کے خاص کمرے میں بیٹھے ہوئے اُن سے باتیں کر رہے تھے، تو مسٹر جناح نے میرا آپ سے تعارف کرایا تھا۔"

اس قسم کی لن ترانی اثر و رسوخ محفلوں میں بیٹھ کر فرنگی لوگ نہیں جتایا کرتے۔

(کاپی رائٹ بحق مضمون نگار محفوظ ہے) ایس۔ اے۔ خالق (اڈیٹر رسالہ روپیہ۔ دہلی)

## گلدستۂ فردوس

سنہ ۱۹۲۱ء

کل جا کے وہ فردوس میں کیا عیش کریں گے — جو تجربۂ عشرتِ دُنیا نہیں رکھتے

سنہ ۱۹۳۴ء

ہے دوست کے ہمراہ تو پردیس بھی فردوس — ہمدم نہ ہو کوئی تو جہنم ہے وطن بھی

سنہ ۱۹۳۶ء

چند سجدے کر کے زاہد کو ہوئی اُن کی اُمید — نعمتیں فردوس کی اس درجہ ارزاں ہو گئیں

سنہ ۱۹۳۸ء

ہمت ہے تو کر پیدا فردوسِ حیات اپنا — بخشی ہوئی جنت سے دوزخ کا عذاب اچھا

سنہ ۱۹۴۴ء (کراچی کے بالاخانے)

ہیں ریڈیو سیٹ جیسے رہنے کے مکاں اونچے — فردوسِ نظر باہر، زندانِ خراب اندر

سنہ ۱۹۴۸ء (جناح و اقبال)

قائدِ اعظم جونہی فردوس میں داخل ہوئے — حضرتِ اقبال آئے اُن کے استقبال کو

اسد ملتانی

# عالمِ خیال

(کا)

# دُوسرا رُخ

فردوس میں دو تین نظمیں ایسی شائع ہوئی ہیں، جو آج کل نہیں لکھی گئیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک زمانہ میں بہت مقبول تھیں اور اب لوگ انہیں بھول چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسی نظمیں پھر سامنے آجائیں اور کچھ روز کے لیے اور محفوظ ہو جائیں۔ ایسی ہی نظموں میں یہ عالمِ خیال بھی ہے جس کا ایک رُخ فروری کے فردوس میں چھپا تھا، اور دوسرا رخ درج ذیل ہے۔

محمد واحدی

عورت اپنے شوہر کے آنے کی امید میں ہے، شوہر کا خط عذر لیے ساتھ پردیس سے آیا، وہ ابھی نہیں آسکتا ہے، عورت بے چین ہو کے شوہر کو خط لکھ رہی ہے، اور اپنے خیالات ظاہر کرتی ہے۔

پا کے تمہارے خط کو آج، دل کی تڑپ بڑھی کچھ اور
دل میں بھڑک کے غم کی آگ، جسم پہ تپ چڑھی کچھ اور

آنے کا آسرا کہاں، یاس سے وہ بدل چلا
دل مرا آنسوؤں کے ساتھ بن کے لہو نکل چلا

در کی طرف تھی جو نگاہ، یاس سے اب زمیں پہ ہے
ہاتھ کبھی جگر پہ ہے، اور کبھی جبیں پہ ہے

ضعف سے جسم لٹ چلا، روح بدن سے ہٹ چلی
چہرے کا رنگ کٹ چلا، نبض کی چال گھٹ چلی

خط سے بڑی جگر پہ چوٹ، داغ ہرے ہوئے ہیں آج
تم سے ہزار ہا گلے دل میں بھرے ہوئے ہیں آج

خط ہے تمہارے ہاتھ کا، پڑھتی ہوں اس کو بار بار
کھولتی ہوں ہزار بار، چومتی ہوں ہزار بار

جن سے لکھا گیا یہ خط، کاش وہ انگلیاں ملیں
میرا خیال چوم لے، جائے وہیں جہاں ملیں

خود بھی گئے تم، اور چین، چھین کے مجھ سی لیگئے　　مجھ کو ہٹرن بنا گئے، مجھ کو جنون دے گئے

سب کے جگر میں خون ہے، میرے جگر میں درد ہے　　سب کا شباب لال ہے میرا شباب زرد ہے

ایک تمہیں تھے میرا عیش، بن گئے غم، تو کیا کروں　　پہلے تمہیں تھے میرا چین، اب ہو ستم، تو کیا کروں

عیش کو کھو گئے ہو تم، آؤ تمہیں تو پھر سے ملے　　چین کو لے گئے ہو تم، لاؤ تمہیں تو پھر سے ملے

تم نہ ستم کرو تو کیوں دل مرا بے قرار ہو　　میں نہیں چاہتی، کہ تم، میرے گناہ گار ہو

کیا میں خدا کے سامنے، تم کو سزا دلاؤں گی　　اپنی وفا کے نام کو، خاک میں کیوں ملاؤں گی

چھپ گئے پتلیوں سے تم، ان کو نظر نہ آؤ گے　　یہ تو کہو، کہ کس طرح، دل سے نکل کے جاؤ گے

دل میں چھپے ہو تم، مگر، چوس رہے ہو خون کو　　سر میں خیال بن کے تم، دیتے ہو شہ جنون کو

بن کے لہو، تمہاری یاد، دوڑ رہی ہے جسم میں　　جان یہی ہے جسم میں روح یہی ہے جسم میں

دم مرا لُو سے بڑھ کے گرم، دل مرا جو اس سے ہے　　جسم میں جل گیا لہو، اور ابھی تب کو پیاس ہے

مانگتی ہوں میں تم سے بھیک، دو تو کوئی قرض نہیں　　چاہتی ہوں میں تم سے رحم، مال نہیں یہ زر نہیں

رحم سے میرے دل کو چین، دوگے تو دے سکو گے تم　　اپنے خدا سے یہ ثواب، لوگے تو لے سکو گے تم

اپنا خیال تک نہیں، چاہ کے جوش میں مجھے　　ایک تمہاری یاد، ہاں، لاتی ہے ہوش میں مجھے

آئینہ میں ہے ایک چیز، چین مجھے اسی سے ہے　　اُنس ہے، تو اسی سے سب، اور نہیں کسی سے ہے

دیکھتی رہتی ہوں اِسے، پیار کے ساتھ، بار بار　　اس کی بلائیں لینے کو، بڑھتے ہیں ہاتھ، بار بار

ہے یہ تمہاری ہی شبیہ، اور یہ میری جان ہے　　اس میں تمہارا حُسن ہے، اس میں تمہاری شان ہے

جان تو ہے مری مگر، کچھ نہیں بولتی، تو کیوں　　دیکھتی ہے مجھے ضرور، منہ نہیں کھولتی، تو کیوں

شکل ہے یہ تمہاری ہی، تم ہو خفا، تو یہ بھی ہے　　دور تم، اور چپ شبیہ، وہ ہے جفا، تو یہ بھی ہے

تم نظر آ ہی جاتے ہو، اے، وہ خیال ہی سہی　　کچھ نہیں، تو شبیہ سے، صرف جمال ہی سہی

تم سے، مرے نصیب میں، شاید ابھی کرم نہیں　　وہ ہیں بڑی ہی خوش نصیب، ہجر کا جن کو غم نہیں

رہتی ہیں شوہروں کے ساتھ، خوب سنگار کرکے وہ　　ہنستی ہیں کھل کھلا کے وہ، تنتی ہیں بن سنور کے وہ

رُخ پہ شباب کی بہار، رنگ سے دونوں گال لال
مانگ پہ موتیوں کا حُسن، پان سے ہونٹھ لال لال

وہ جو لچک کے بل پڑیں، شاخ گلوں کی بل پڑی
ہونٹھ جو ہنس کے کھل پڑے، گُل کی کلی سی کھل پڑی

بال کھلے تو کھا کے بل، دل کو لپیٹ لے گئے
دل میں تھے جتنے ولولے، سب کو سمیٹ لے گئے

کچھ تو ہے خود بدن میں کس، تنتی ہیں کچھ ادا کے ساتھ
کچھ تو ہے حُسن قدرتی، بنتی ہیں کچھ ادا کے ساتھ

لینے کو شوہروں کے دل، لطف ہے بات بات میں
حسن ہے اپنی گھات میں، ناز ہے اپنی گھات میں

مجھ کو ہے غم، تو پھر سنگار، کون کرے، تمہیں کہو
دیکھ کے حُسن، مجھ کو پیار، کون کرے، تمہیں کہو

رکھتے نہیں یہ ہونٹھ رنگ، رکھتے نہیں یہ گال رنگ
تم نہیں تو نظر میں ہے، خون کا رنگ، لال رنگ

کاجل اُڑے، کروں نہ اب، اُس کی طرف نگاہ میں
بہتا ہے آنسوؤں کے ساتھ، ہوتی ہوں رُوسیاہ میں

خاک میں چوڑیاں ملیں، جی کو جلا رہی ہیں یہ
بھاڑ میں جائیں بجلیاں، آگ لگا رہی ہیں یہ

بار ہیں پتّے بالیاں، خار ہیں چوہے دنتیاں
کس کو دکھاؤں اپنے کان، اب میں پہن کے انتیاں

دیتی ہے داغ آرسی، میں نہ چھوؤں گی اب اسے
آتی ہے زرد رُو نظر، دیکھتی ہوں میں جب اسے

بس اسے میں پہن چکی، دل پہ گراں ہے زیور اب
تم نہیں دیکھتے سنگار، خاک پھبے یہ مجھ پر اب

بکس میں اس کو کرکے بند، سب میں تمہیں کو بھیجدوں
تھا یہ تمہارے ہی لئے، اب میں تمہیں کو بھیجدوں

مجھ کو تو چاہتے نہیں، شوق سے آکے دیکھنا
چاہتے ہو جسے وہاں، اُس کو پہنا کے دیکھنا

طنز سے کیا یہ کہہ اُٹھی، شوخ مری زبان ہوئی
ہے یہ زباں گناہگار، میں نہیں بدگماں ہوئی

تم میں وفا ہو، یا نہ ہو، میں یہ کہوں گی، ہے ضرور
ہاں، یہ کہوں گی، راہ کو، روکے ہے کوئی شے ضرور

آؤ نہ آؤ، میں شباب، تم پہ نثار کر چکی
تم مجھے پیار کر چکے ہو، میں تمہیں پیار کر چکی

کس سے کہوں میں دل کا بھید، سوچ میں ہوں گھٹی ہوئی
لیٹ گئی تو آیا سوچ، بیٹھ گئی، کھڑی ہوئی

ہوتی ہوں تنگ کروٹیں غم سے بدل بدل کے میں
کاٹتی ہوں، سٹرن کی طرح، رات ٹہل ٹہل کے میں

پھوڑ کے منہ، جو کوئی چیز، مانگ اُٹھی، تو زک ملی
آئے پسند، ایسی چیز، مجھ کو نہ آج تک ملی

تیل کو میں ترس گئی، بال مرے چکٹ گئے
میں ہی لُٹی تو بال کیا، اُونہہ، وہ بلا سے لٹ گئے

جیسی پھنسی بلا میں اب ، اور کبھی پھنسی نہیں　　دل میں کبھی خوشی نہیں، مُنہ پہ کبھی ہنسی نہیں

میری خوشی کی زندگی، عہد سے پیشتر رہی　　ساتھ تمہارا کیا ہوا، چھوٹ کے تم سے مر رہی

جذب کے ولولے ہزار، یہ مجھے سب عذاب ہیں　　سب مرے دل کا جوش ہیں، سب مرا اضطراب ہیں

کیوں میں عذاب کہہ اٹھی، چُوک ہے یہ، قصور ہے　　ہجر میں جذب ہی سے ہے، درد کو جو سرور ہے

جذب میں کاش ہو یہ زور، جو تمہیں لائے کھینچ کر　　گھر مری پتلیوں کے ہیں، اِن میں بٹھائے کھینچ کر

چاہ کے رُخ کھنچی ہوں میں۔ کاہ رُبا سے جیسے گھاس　　دل ہے تپش سے بیقرار، تیز ہوا سے جیسے گھاس

کاہ ربا سے گھاس کو، کھینچتی ہوں ہزار بار　　جذب کو میں دکھاتی ہوں، زورِ کشش کا بار بار

اب بھی نہ یہ کرے کشش، تو اسے کوئی کیا کرے　　جذب کا نام، جذب ہی، پھر نہ رہے، خدا کرے

دل مرا لیگئے ہو تم، اُس کو نہ چھوڑ دوں گی میں　　توڑ چکے جو تم، تو خیر، لاؤ تو ۔ جوڑ لوں گی میں

کانپ کے، دل میں، لاؤ خوف ، اپنے خدا کا، تم کبھی　　اپنی وفا سے دو جواب، میری وفا کا ۔ تم کبھی

صرف تمہاری دید کی، تم سے ہوں طالب، اور بس　　صرف تمہاری آرزو، مجھ پہ ہے غالب ، اور بس

پھر کے تمہاری شکل سے، دل نہ ہٹا، نہ ہٹ سکے　　اور کسی طرف، کبھی، دھیان بٹا۔ نہ بٹ سکے

جھوٹ جو میں ذرا لکھوں ، تو ہو خفا مرا خدا　　چاہ کو مجھ سے چھین لے، دے یہ مجھے سزا خدا

توبہ! یہ کیا میں بک اُٹھی۔ توبہ! یہ کیا میں کہہ گئی　　چاہ تمہاری جب چھٹی، پھر تو میں کچھ نہ رہ گئی

چاہ کا نام سحر ہے، تم پہ اثر کرے یہ کاش　　جذب سے کھینچ کر تمہیں، رُخ کو ادھر کرے یہ کاش

غم سے دبی خوشی۔ مگر، چاہ کی یہ خطا نہیں　　ہجر ہے جس کی، چوٹ سے۔ درد کی انتہا نہیں

ضبط کی کوئی حد بھی ہے، چاہ کو میں چھپا تھکی　　غم کی تو کوئی حد نہیں، کم ہوا۔ میں کھا تھکی

اشک تو بہتے ہیں ۔ مگر، اشک نہیں نگاہ میں　　بڑھ کے یہ موتیوں سے ہیں، مجھ کو، تمہاری چاہ میں

آنچل اگر ہو تر، تو میں، خشک کروں نچوڑ کر　　ساس کے پاس جاؤں تو، منہ کو ادھر سے موڑ کر

رہتی ہوں سب سے میں الگ. تاکہ نہ تاڑ جائیں لوگ　　روتی ہوں سب سے چھپ کے میں، تاکہ نہ دیکھ پائیں لوگ

آتی ہیں ہم سنیں، مگر، مجھ میں نہیں ہنسی مری　　شرم سے کیا کہوں، کہ " وہ " بیکنے دل لگی مری

میں نہ کہوں زباں سے کچھ، کھلتا ہے درد، رنگ سے　　دیکھتی ہیں وہ، غم کی شکل، چہرے کے زرد رنگ سے

پوچھتی ہیں، تو کیا کہوں، چھیڑتی ہیں، تو کیا کروں　　سادھ کے چپ، لہو کے گھونٹ، بیٹھی ہوئی پیا کروں

جھولنے کو جو وہ کہیں، جاؤں میں اٹھ کے جبر سے　　گائیں تو گاؤں ان کے ساتھ. غم کو چھپا کے صبر سے

ساون اگر میں گاؤں بھی، تو وہی، جس میں درد ہو　　راگ میں کھینچے عورت آہ، دور جب اس کا مرد ہو

گانے کا دم ہی کس میں ہے، تان نکلتی ہی نہیں　　سانس میں زور ہی نہیں، کھل کے یہ چلتی ہی نہیں

پہلے لچک کے ناز سے، کھاتی تھی میں ہزار بل　　تم نہیں اب، تو ضعف سے، کھاتی ہوں بار بار بل

ضعف کا حال کیا کہوں، زور کو رنج کھا گیا　　آہ کے ساتھ بار ہا. دل مرا منہ تک آ گیا

پال گئے ہو تم چکور، ہوتی ہوں اس سے شاد میں　　لے کے اسی کو گود میں، کرتی ہوں تم کو یاد میں

چاندنی رات میں مگر، دیتے ہو غم ضرور تم　　اس کی نظر میں چاند ہے، میری نظر سے دور تم

چاندنی رات سرد ہے، کرتی ہے دل کو سرد وہ　　تم مرے چاند، مجھ سے دور، کیسے لئے ہے درد وہ

شب کو پتنگے آتے ہیں، گرتے ہیں وہ چراغ پر　　اور جلاتے ہیں مجھے، دیتے ہیں داغ، داغ پر

پاؤں تمہیں، تو ہوں نثار، گرد پھروں اسی طرح　　تم سے ملوں اسی طرح، تم پہ گروں اسی طرح

تم مجھے کیوں نہ لے گئے، چل دیئے منہ کو موڑ کر　　چل دیئے مجھ کو چھوڑ کر، چل دیئے دل کو توڑ کر

ساس کو مجھ پہ رحم کیا، ورنہ یہ روکتیں تمہیں　　نند کو مجھ پہ کیا ترس، ورنہ یہ ٹوکتیں تمہیں

پاک محبت اور میں، ملنے کی فکر کیوں نہ ہو　　جوش وفا کا اور دل، چاہ کا ذکر کیوں نہ ہو

جن کے دلوں میں کھوٹ ہو، ان کو کہاں وفا سے کام　　مجھ میں وفا ہے، اس لئے، غم میں پڑا خدا سے کام

ہجر کو گذرے پانچ سال، ملکے رہی میں سات دن　　مجھ کو سزا یہ کیوں ملی، سوچ یہی ہے رات دن

کی نہیں میں نے کچھ خطا، کی ہو، تو بھول جاؤ تم — مجھ کو نہ دیکھنا، مگر، خیر سے گھر کو آؤ تم

آؤ جو تم، تو رُخ پہ میں، آنچل اٹھا کے ڈال لوں — اس میں تو ہرج کچھ نہیں، جھانک کے دیکھ بھال لوں

ابر امنڈ کے آگیا، روؤں گی اس کے ساتھ میں — اپنے جگر کے خون سے، دھوؤں گی رُت کے ہاتھ میں

بول اٹھا وہ میرا مور، ہاتھ سے اب تو دل گیا — مجھ کو نہ مل سکو گے تم، اس کو تو ابر مل گیا

گھر میں ہے پیڑ انار کا، اس پہ پپیہے آتے ہیں — دیکھ کے میری بیکسی، مجھ پہ ترس وہ کھاتے ہیں

وہ نہیں بیٹھتے کبھی، پیڑ کے اوپر آ کے، چپ — تم کو پکارتے ہیں روز، شرم سے مجھ کو لگے چپ

ابر اُٹھے تو سُن کے شور، دبتی ہوں خوف کھا کے میں — دیکھ کے بجلیوں کی آگ، گرتی ہوں تلملا کے میں

تم مرے پاس ہو تو پھر، خوف مجھے ذرا نہ ہو — وہم سے ڈر ہے، ڈر سے وہم، جب کوئی دوسرا نہ ہو

عورت اگر میں ہو پڑی، اس میں مری خطا نہیں — یہ تو کہو، کہ تم پہ کچھ، میرا بھی حق ہے، یا نہیں

پاؤں خدا نے کیوں دیئے، کیا اسی صحن کیلئے — سب مرے دل کے حوصلے، مجھ سے حیا نے لے لئے

پردہ میں رہ کے، عورتیں، مرتی ہیں، گو قضا نہ ہو — شرم کا حق ادا کریں، چاہ کا حق ادا نہ ہو

اشک مرے ٹپک پڑے، خط ہوا تر، میں کیا کروں — بھیگ کے کچھ بگڑ گئے، حرف، مگر میں کیا کروں

بندھ گیا آنسوؤں کا تار، خوش ہوں میں دیکھ کر جسے — بن گیا موتیوں کا ہار، پہنے تمہاری یاد اسے

صبر سے گذری، موت پر، اب تو جگر کروں گی میں — اپنے بدن کی آگ سے، آپ ہی جل مروں گی میں

مجھ کو یقین ہے کہ تم، آ کے مجھے نہ پاؤ گے — آ کے نہ پاؤ گے، تو کیا، میری لحد پہ آؤ گے

فاتحہ بھی پڑھو گے تم، ہاتھ اُٹھا کے، یا نہیں — روح کو خوش کرو گے تم، پھول چڑھا کے، یا نہیں

سبزے کو دیکھنا ضرور، مجھ پہ وہ بار ہو نہ جائے — نرم رہے، ہرا رہے، سوکھ کے خار ہو نہ جائے

جان لبوں سے دے چکی، تم کو پیام، اور بس،
سنتی ہوں، شوق ہیں وہیں، اُن کو سلام، اور بس۔

احمد علی شوق قدوائی مرحوم

# عمارات فتح پور سیکری

(اس کی دو قسطیں جنوری اور فروری کے "فردوس" میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ تیسری قسط ہے۔)

## ریلوے اسٹیشن

یہ اسٹیشن ایک شاہی عمارت ہی میں ۱۹۱۳ء میں قایم ہوا ہے آگرہ بیانہ ریلوے کا قایم کیا ہوا ہے۔ اس عمارت میں ایک بڑا کمرہ ہے جو کہ عہد مغلیہ کی یادگار ہے۔ چینی کی اینٹیں لگا کر تعمیر کیا گیا ہے۔

## مسجد خلیل

مسجد خلیل احاطہ کے اندر مسجد شاہ قلی کے قریب ہی واقع ہے تین در کی سرخ مسجد ہے۔ مسجد کے اندرونی حصہ میں بیچ کی محراب پر یہ عبارت کندہ ہے۔

"بتاریخ بیست وہشتم شہر ذیقعدہ یک ہزار و یک صد و نود و پنج ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بنائے این مسجد باہتمام میر اسماعیل ولد میر حسن علی"

اس مسجد کے احاطہ کے قریب ایک اور احاطہ ہے اس میں بھی ایک مسجد اور ایک مختصر قبرستان ہے۔ مسجد خلیل کے صحن میں چند تعویذ دار قبریں ہیں۔

## بارہ دری راجہ ٹوڈرمل

گوآلیار اور تیرہ دروازہ کے درمیان میں ایک بارہ دری ہے جو کہ راجہ ٹوڈرمل کی بارہ دری کہلاتی ہے۔ یہ فتح پور بازار سے دو تین فرلانگ فاصلہ پر واقع ہے۔ راجہ ٹوڈرمل اودھ کے رہنے والے تھے اور ذات کے کھتری تھے مغلیہ عہد میں بالکل معمولی کاموں پر معین کئے گئے تھے مگر اپنی خداداد لیاقت کا ایسا سکہ جمایا کہ دیوان مقرر ہوئے۔ اس کے بعد متعدد جنگوں میں سپاہ گری کے وہ جوہر دکھائے کہ اب تک ان کا نام زندہ ہے۔ اسی بارہ دری میں اکبر کو سنہ ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء میں راجہ ٹوڈرمل نے ایک پُرتکلف دعوت دی۔ ان کی وفات لاہور میں

۱۵۹۲ء کو ہوئی۔

بارہ دری میں ایک کمرہ آٹھ پہلو کا ہے۔ چاروں طرف بڑے چھوٹے دروازے ہیں۔ دروازوں کی بغلوں میں کوٹھریاں بھی ہیں کمرہ کے آگے ایک برآمدہ ہے جس کے تین در ہیں۔ اوپر کی منزل پر برآمدے اور کوٹھریوں کی چھت پر بھی برآمدہ اور کوٹھریاں تعمیر کی گئی ہیں۔ چاروں طرف چار زینے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عمارت کے چاروں طرف باغ تھا مگر اب اس کے کوئی خاص نشانات نہیں پائے جاتے۔

## مقبرہ بہاء الدین

ایک احاطہ چھوٹی سی چہار دیواری میں محصور ہے اس میں یہ مقبرہ ہے ایک طرف طاق اور مصلّوں کے نشان ہیں، جس سے شبہ ہوتا ہے کہ مسجد ہوگی۔ اس مقبرہ کے اندر پختہ فرش ہے۔ بیچ میں ایک گنبد ہے گنبد کے نیچے سنگ مرمر کی دو پختہ قبریں ہیں ایک بہاء الدین صاحب کی دوسری ان کی بیوی کی۔ چاروں طرف دروازے ہیں صرف ایک دروازہ کھلا ہوا ہے، باقی سنگ مرمر کی جالی لگا کر بند کر دیئے گئے ہیں۔ ان کے مقبرہ کے برابر ایک مسجد بھی ہے۔ یہ مسجد "بہاء الدین کی مسجد" کہلاتی ہے۔ بہاء الدین جہانگیر کے زمانہ میں کسی معماری کے کام کے سلسلہ میں ملازم تھے۔ بہت ہی بلند اور عالی حوصلہ انسان تھے۔

---

# آس پاس کی عمارتیں

## عیدگاہ

یہ عیدگاہ فتحپور کی فصیل سے باہر بنی ہوئی ہے ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ یہ حصہ آبادی سے کافی فاصلہ پر ہے۔ اکبر کے زمانہ کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ اتنی چھوٹی سی جگہ پر عیدگاہ کیسے ہو سکتی ہے۔ مسجد کے صحن کے چبوترہ میں تین قبریں بھی ہیں بہت خوبصورت طور سے بنائی گئی ہیں ان میں دو زنانی اور ایک مردانی ہے۔ مسجد تین ستون قائم کر کے بنائی گئی ہے چہار دیواری کے برابر ایک کوٹھری ہے جو کہ زمین دوز ہے۔ پہلے اس کوٹھری کے متعلق تحقیق نہیں تھا بلکہ ایک مرتبہ زمین کھدی تو معلوم ہوا کہ یہاں

ایک کوٹھری ہے۔ اس کوٹھری کی تعمیر کی علت تو معلوم نہیں ہوتی ممکن ہے خزانوں وغیرہ کے لئے مخصوص تھی

## مزار بی بی عائشہ و بی بی زیبا

یہ مزار حضرت سلیم چشتی علیہ الرحمۃ کی دو صاحبزادیوں عائشہ و زیبا کا ہے۔ موضع جوتانہ کے قریب ایک پرانا قبرستان ہے قبروں پر سفید رنگ کے پتھر کے تعویذ کندہ ہیں۔ مغربی حصہ میں بی بی عائشہ و بی بی زیبا کی قبریں ہیں۔ اس قبرستان میں ایک گنبد میں کچھ قبریں اور بھی ہیں مگر نہ معلوم کس کی ہیں کیونکہ ان پر کتبے آویزاں نہیں ہیں۔ اس گنبد کے نیچے ایک کمرہ اور آگے ایک برآمدہ ہے۔ اس گنبد سے کچھ فاصلہ پر دو گنبد اور بھی ہیں۔ دوسرے کے نیچے بھی کمرہ اور چاروں طرف برآمدہ ہے، تیسرا گنبد جو کچھ فاصلہ پر ہے اس کا رقبہ ۲۰×۲۰ فیٹ ہے لیکن افسوس اس کے تعویذ بھی مارے مارے پھر رہے ہیں۔ پہاڑ کے نیچے پیمانہ کی منزل پر آخرالذکر دو گنبدوں کے درمیان میں ایک باؤلی بھی ہے اس کے کناروں پر پختہ نالیاں بنی ہوئی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کوئی باغ ہوگا اور ان نالیوں کے ذریعہ باغ میں پانی پہنچتا ہوگا۔

## مرزا آدم شہید

رسول پور سے پت سال کو جو راستہ گیا ہے اُسی راہ میں ایک جگہ بہت سے شہیدوں کے مزار ہیں۔ یہ سب مزار ایک چبوترہ پر ہیں۔ یہ ان شہدا کے مزار ہیں جو کہ سکرواروں کی لڑائی میں شہید ہوئے۔ ان ہی مزاروں میں ایک مزار خصوصی درجہ رکھتا ہے، وہ مزار ایک حجرہ کے اندر ہے جس کو آدم شہید کا مزار کہتے ہیں۔ آدم شہید سے دیہات والوں کو بے انتہا عقیدت ہے۔ مزار پر میٹھی چیزیں چڑھائی جاتی ہیں۔ یہ مزار سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے۔

## پون چکی

ایک منہدم عمارت کے کچھ نشانات باقی ہیں۔ اس عمارت کو پون چکی کہا جاتا ہے۔ موضع "چرپاری" میں پہاڑی کی ایک اونچی چوٹی پر یہ عمارت ہے۔ ایک آٹھ پہلو کا مکان ہے اور پہلو میں ایک دروازہ ہے۔ ایک چبوترہ بھی ہے جو ۳ فیٹ ۴ انچ اونچا ہے مضبوط اور نقش و نگار سے آراستہ کچھ ستون بھی ہیں۔ تاریخوں میں

بعد تلاش ایک فارسی تاریخ کے دیکھنے سے یہ پتہ چلا کہ اس کی تعمیر میر فتح اللہ شیرازی نے کرائی تھی۔ یوں چکی نام اس لئے رکھا گیا کہ چکّی خود بخود چلتی تھی۔ فارسی تاریخوں میں اس چکّی کا نام " بادآسیا " لکھا ہوا ہے۔ یعنی ہوا کی چکّی۔ چنانچہ " مآثرالامرا " کے مصنف میر فتح اللہ شیرازی کے حالات میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

" آسیائے ساختہ کہ خود حرکت می کرد و آرد شد "

## گنگ محل

یہ محل " گونگا محل " کے نام سے مشہور ہے۔ اکبر کے دور میں اس کا نام " گنگ محل " ہی تھا۔ اس محل کی وجہ تعمیر یہ بتائی جاتی ہے کہ اکبر کے دربار میں ایک مرتبہ یہ موضوع معرض بحث میں تھا کہ انسان کی فطری ومادری زبان کون سی اور کیا ہے؟ اور یہ سوال اس لئے طویل ہوتا چلا گیا کہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے " کہ بچّے دائرہ اسلامی میں پیدا ہوتے ہیں یعنی ان کی پیدائش اسلامی جامہ میں ہوتی ہے " چنانچہ اس سوال کو حل کرنے کے لئے بیس ہزار دودھ پیتے بچّے اُن کے والدین کو کافی معاوضہ دے کر حاصل کئے گئے۔ یہ واقعہ ۹۸۸ھ ۱۵۸۰ء کا ہے۔ ان بچوں کی رہائش کے لئے یہ عمارت فتحپور میں آبادی سے کچھ فاصلہ پر تیار کرائی گئی اور اس میں ان بچّوں کو رکھا گیا۔ اناؤں کو ہدایت کی گئی کہ ان بچوں کے سامنے گونگی بنی رہیں اور ان کے سامنے آپس میں کسی قسم کی گفت وشنید نہ کریں۔ بچّوں اور ان کی خدمت گاروں کے لئے وہیں جملہ انتظامات رہائش خوردونوش کردیئے گئے۔ تین چار سال کے عرصہ میں کچھ بچّے تو فوت ہوگئے کچھ باقی رہ گئے۔ ایک دن بادشاہ ان بچّوں کو دیکھنے آئے۔ یہ بچّے خوب کھیل کود رہے تھے کچھ بولتے بھی تھے مگر ان کی زبان سے جو لفظ نکلتے تھے وہ سمجھ میں نہ آتے تھے یعنی ادھوری باتیں زبان سے نکالتے تھے۔ بولی جانوروں کی بولی سے مشابہ تھی۔ چنانچہ شاید اسی وجہ سے اس محل کا نام " گنگ محل " رکھا گیا۔

اخلاق انصاری اکبرآبادی

---

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی | ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا | جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

# شاید جہاں میں کوئی مسلماں نہیں رہا

احوالِ رنگِ گردشِ دوراں نہ پوچھیے — وجہ تغیراتِ گلستاں نہ پوچھیے
اسبابِ اضطرابِ رگِ جاں نہ پوچھیے — کیونکر ہوا ہے چاک یہ داماں نہ پوچھیے
اس درجہ آنسوؤں کی روانی کا جوش ہے
قبضے میں اب نہ دل ہے نہ قابو میں ہوش ہے

اب واقفِ فغاں نہ کوئی اہلِ راز ہے — عالم اسیرِ حلقۂ نغمات و ساز ہے
گوشِ جہاں ہے اور لبِ نَے نواز ہے — سجدوں سے آج اپنی جبیں بے نیاز ہے
ارض و سماں پہ چھائی ہے کچھ ایسی بے خودی
لیتا نہیں ہے بھول کے نامِ خدا کوئی !!

کانٹوں کو ہو رہی ہے گُلِ تر کی آرزو — قطرے بھی کر رہے ہیں سمندر کی آرزو
ذرّوں کو ہے بلندیٔ اختر کی آرزو — لیکن نہیں کسی کو پیمبر کی آرزو
سامانِ صد نشاط ہے ساقی ہے جام ہے
اللہ سے ہے کام نہ مذہب سے کام ہے

دنیا میں ہو رہی ہے ہر اک سمت روشنی — اور خانۂ خدا کی ہے شمع بجھی بجھی
کلبوں میں جلوہ ریز ہیں نغماتِ صد خوشی — ویران مسجدوں پہ برستی ہے بے کسی
عظمت شناسِ آیتِ قرآں نہیں رہا
شاید جہاں میں کوئی مسلماں نہیں رہا

کیفؔ بنارسی

(گذشتہ سے پیوستہ)

حضرت اکبر کے خطوط کا طویل ترین مجموعہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ابھی تھوڑے دن ہوئے خطوط مشاہیر حصہ اول میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی ''اکبر نامہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں ۲۰۰ خطوط ہیں۔ پہلا ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۳ء کا ہے اور آخری ۱۳ اگست ۱۹۲۱ء کا۔ اس کے چند خط ابتدا حضرت اکبر نے بعد احباب فرمایا۔ شروع کے خطوط میں اُن مباحثہ ادبی کا ذکر ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد مدیر الہلال اور مولانا دریابادی کے فلسفیانہ مضامین کی وضع کردہ اصطلاحات کے بارہ میں بڑے زور شور سے چھیڑا گیا تھا۔ لفظ انگریزی الفاظ ہیں Pain اور پلیزر Pleasure کے لئے مولانا دریابادی نے حظ و کرب کی اصطلاحات، اور دوسرے ان جملے لے ہم نے مشق کی تھیں، مولانا آزاد کے نزدیک ان کے بجائے لذت و الم کے الفاظ موزوں تر تھے۔ حضرت اکبر کے خط کا بہت بڑا حصہ اس بحث سے متعلق ہے لیکن اس میں بھی نہایت لطیف انداز میں وہ تبلیغ موجود ہے جو حضرت اکبر کی زندگی کا جزو اعظم بن گئی تھی، فرماتے ہیں:-

"یہ تو خیر کچھ الفاظ کا مذہب اور تجویز کرنا ہے، انشاء اللہ آپ کا علم اور آپ کی عمر زیادہ ہو گی۔
امید تو رکھنی چاہئے کہ عالم معانی میں آپ کے ذریعہ سے جنس انسانی کو فائدہ ہوگا، اور
بالآخر آپ کسی بڑے اور مفید نتیجہ پر پہنچ کر اس کو اپنی صفائی بیان سے روشن کریں گے۔"

دوسرا خط یکم ستمبر ۱۹۱۳ء کا ہے جس میں پہلی بار اکبر صاحب نے یہ لکھ کر کہ "آپ فلاسفر ہیں، شعر کی قدر زیادہ نہ ہوگی، لیکن واقعات موجودہ کے لحاظ سے شاید ان اشعار کو ناپسند نہ کیجئے" اپنے تین شعر لکھے ہیں ؎

بھائی صاحب تو ادھر فکرِ مساوات میں ہیں		شیخ صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں

قوم کے حق میں تو الجھن کے سوا کچھ بھی نہیں　　صرف آنر کے مزے انکی ملاقات میں ہیں

سرِ سجدہ ہے کوئی اور کوئی تیغ بکف　　بس ہمیں اس رزولیوشن کی حرافات بساہیں

نوجوان و ہونہار صاحبزادہ ہاشم کے انتقال کا ذکر، دوسرے مجموعہ خطوط کی طرح اس مجموعہ میں بھی موجود ہے، عبارت سیدھی سادی ہونے پر بھی غایت درجہ موثر ہے :۔

"میرا لڑکا سید ہاشم جو نہایت ذہین، ہونہار، توانا، بالا بلند، موزوں طبع، عاقل، خدا پرست، شعر فہم، میرا خادم، مشیر و مطیع تھا، اور جس نے چودھویں سال میں قدم رکھا تھا، یکایک سرسام میں مبتلا ہو کر مجھ سے ہمیشہ کو جدا ہو گیا۔ بی بی پہلے مر چکی تھیں۔ وہی لڑکا دنیاوی زندگی کا سہارا تھا، مذہب اور فلسفہ تصوف نے دیوانگی سے محفوظ رکھا لیکن بے حد افسردہ اور دنیا سے بے تعلق ہو گیا ہوں، ہوش و حواس سے مجبوری ہے۔"

اخبار الہلال کی ضمانت ۱۹۱۳ء میں گورنمنٹ نے ضبط کی تھی۔ اس پر حضرت اکبر نے اپنے ایک خط میں یہ شعر لکھ بھیجا ؎

مغرب کی برق ٹوٹ پڑی اس غریب پر　　دورِ فلک ہلال کو لایا صلیب پر

اس شعر پر مولانا دریابادی نے حسب ذیل حاشیہ دیا ہے :۔

"اکبر مضمون کے بھی بادشاہ تھے، مغرب اور غریب کی اور مغرب اور ہلال کی، اور برق، ہلال اور فلک کی مناسبتیں بالکل ظاہر ہیں۔"

اس کے بعد ایک خط میں، ایک فلسفیانہ اصطلاح کے اردو ترجمہ کے بارہ میں مشورہ دیتے دیتے پھر تبلیغ پر آجاتے ہیں، فرماتے ہیں :۔

"خدا کرے آپ جلد الفاظ کے پھندے سے رہائی پائیں۔ آپ کے ذہن کو عالم معانی کے بالاتر درجوں میں مصروف ہونا چاہئے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ بغیر الفاظ کے کام نہیں چلتا۔"

مولانا عبدالماجد کا خط بہت خفی ہے جس کا پڑھنا ہر شخص کے لئے آسان نہیں۔ حضرت اکبر اس کی طرف لطیف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"الحمد للہ کہ آپ صرف تحریر میں خطِ اقلیدس ہیں، برتاؤ میں شاخِ گُل ہیں۔"

مولانا عبدالماجد کے والد مولوی عبدالقادر صاحب ڈپٹی کلکٹر کا سفرِ حج کے سلسلہ میں حج سے فراغت کے معًا بعد وہیں مکہ معظمہ میں انتقال ہوگیا۔ حضرت اکبر عام طور سے تاریخ بہت کم کہتے تھے۔ لیکن اس موقع پر ایک قطعہ ارشاد فرمایا اور اس میں صرف لفظ "شغل" سے تاریخ وفات ۱۳۳۰ھ نکالی۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

اُن کے ذکر و شغل کا تھا یہ اثر — شغل ہی میں نکلی تاریخ وفات

۱۹۱۴ء میں مولانا عبدالماجد صاحب نے غزل گوئی پر بھی توجہ کی تھی، پہلی غزل حضرت اکبر کے پاس بغرض اصلاح ارسال کی۔ اس پر انھوں نے جو لکھا وہ عام استادی کے دعویدار شعرا سے کس درجہ مختلف اور نوعمر شاعر کی کتنی زیادہ ہمت افزائی کرنے والا ہے، اور اس کے آخر میں ٹیپ کا بند، وہی باطنی ترقی کا۔ لکھتے ہیں:۔

"مجھ کو حیرت ہوئی کہ آپ ایسے شعر کہہ سکتے ہیں، جو رنگ سخن ظاہر ہوتا ہے، وہ بہت پختہ ہے۔ کیا کہنا چاہیئے اور کیونکر کہنا چاہیئے،...... بہرکیف میں آپ کی غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ شعر تو ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے ؎

رہی ہر چند عقل صبر آموز — نہ گئیں، بے قراریاں نہ گئیں

کیا خوب کہا ہے۔ آپ انشاء اللہ بڑی باطنی ترقیاں حاصل کریں گے۔"

اس کے بعد ایک دوسری غزل پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آپ کی غزل کو دیکھ کر کم تعجب ہوا اور زیادہ خوشی ہوئی، تعجب اس بات کا کہ ابتدا ہی میں ایسے کھرے شعر آپ کہنے لگے۔ تعجب میں کمی اس لئے کہ اچھی فطرتی سمجھ اور علم نے آپ کی طبیعت کو معنی کا عمدہ سانچہ بنا دیا ہے۔ نقص و زیادت کو دخل نہیں۔ خوشی اس بات کی کہ ان خیالات کو میں نے پسند کیا، طریقہ اظہار بھی خوب ہے۔ تماعری، پالیٹکس، اخلاق، علمی فلسفہ، سب کی جھلک ہے، رکاکت سے خالی ہے۔"

۱۹۱۶ء میں مولانا عبدالماجد صاحب کی کتاب فلسفۂ اجتماع شائع ہوئی، جس کو اب انھوں نے اپنی

تصانیف کے زمرہ سے خارج کردیا ہے۔ اس کتاب پر اس زمانے میں ان کی تکفیر کے فتوے دئے گئے تھے۔ حضرت اکبر کو یہ کتاب، انھوں نے ہدیتہً بھیجی۔ اکبر صاحب نے اس پر ذیل کی رائے لکھ بھیجی:۔

"فلسفہ اجتماع کا شکر گذار رہوں، جب ملاقات ہوگی، تو اس کی نسبت کچھ کہوں گا۔

آخری فقرے خوب ہیں، ان کو دیکھ کر میں نے یہ مطلع کہا ہے

زبان پہ کیسا ہو نہری حمد و ثنا کے سوا

مجھے تو کچھ نظر آتا نہیں فنا کے سوا

مولانا نے اس تحریر پر یہ حاشیہ دیا ہے:۔

"کتاب ملحدانہ فلسفہ کے رنگ میں تھی، لیکن بالکل آخر میں یہ مضمون درج تھا کہ

تحفظ بقاء سطوت کی ساری تدبیروں کے بعد بھی بالآخر فنا ہر بڑے سے بڑے ایلڈ

کو ہے۔ بقا و ثبات کسی کو بھی نہیں۔"

جس زمانہ میں یہ کتاب مصنف نے حضرت اکبر کو بھیجی، اس زمانہ میں ان کی شادی ہونے والی تھی۔ حضرت اکبر نے اپنے خط میں اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے:۔

"قرب شادی میں فلسفہ اجتماع کی تصنیف بہت موزوں ہے"

اس کے بعد کے دوسرے خط میں بھی اس کتاب کا ذکر ہے اور اس کے مختلف نیہ پہلوؤں سے چشم پوشی کر کے صرف اس آخری مضمون ثنا کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آپ نے مضمون فنا پر خوب خاتمہ کیا ہے۔ یہ رنگ طبیعت بہت خوب ہے، اللہ آپ کو اطمینان دے۔ امید ہے کہ سیدھی سمجھ بہت بلندی پر پہنچائے"

اس کے بعد کے دوسرے خط میں بھی اس کتاب کا ذکر ہے:۔

"میں نہیں جانتا کہ آپ کی کل کتاب کا مجموعی اثر مجھ پر کیا ہے، لیکن چند فقرات کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے اپنی عمر سے زیادہ پختگی کر دکھائی ہے، میرا ایک مصرع ہے،

ع تجھے یہ ڈگریاں بوڑھوں کا ہم سن کر نہیں سکتیں

یہ صحیح ہے، آپ بی ڈگری کی برکت نہیں ہے، بلکہ فطرتی نقطۂ ہستی کا ظہور ہے، ہم آپکو اور آپ ہم کو اس کے سوا کیا دُعا دے سکتے ہیں کہ اللہ اطمینان قلب عطا فرمائے آخر نما، آخر فنا سہ

ہم اظہار خودی سے کوئی دم ساکت نہیں ہوتے
مگر جب غور کرتے ہیں تو خود ثابت نہیں ہوتے

۱۱ فروری ۱۹۱۶ء کے خط میں، قرآن پڑھنے کی طرف کتنے والہانہ انداز میں رغبت دلائی ہے:-

"برادرم، قرآن شوق سے دیکھئے، خوب دیکھئے، یہاں تک کہ بلا مدد ترجمہ اسکے ظاہری معنی سمجھنے لگئے گا۔ تفسیر کی تو کوئی حد نہیں، مذاق مفسرین کی بوقلمونی حیرت انگیز ہے۔ قرآن مجید کو بطور تلاوت پڑھا کیجئے۔ ایک سرے سے پڑھ جائیے اور پھر پڑھئے، اور پھر پڑھئے، زیادہ تر رکئے۔ پڑھتے جائیے، ثواب کا عقیدہ نہ سہی۔ لٹریری لطف و ذوق کا خیال کیجئے۔ ہر وقت طبیعت یکساں نہیں رہتی۔ کسی وقت کوئی آیت دل کو متوجہ کرلے گی۔ مزا آئے گا یا کوئی مسئلہ منکشف ہوگا، ۔۔۔ کسی وقت کوئی اور آیت دامن دل کو کھینچے گی۔"

اسی خط کی اگلی عبارت پڑھنے سے قبل توضیح مطلب کے لئے مکتوب الیہ کا دیا ہوا حاشیہ پڑھ لیا جائے۔

"میں نے الحاد کی ترنگ میں ایک بار یہ لکھ مارا تھا کہ ارسطو کے خیال کے مطابق تو خدا کو محض علت العلل یا علت اولیٰ ماننے پر کیوں نہ اکتفا کی جائے اور قرآن سے غالباً یہ پہلو نکل آئے۔ یہ مکتوب اور اس کے بعد کا اس لغو خیال کی تردید میں ہیں"

تردید مناظرانہ رنگ میں نہیں، سیدھے سادے روزمرہ کے دلنشین الفاظ میں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت اکبر کتنے بڑے پایہ کے موحد تھے:-

"خدا قرآن کی رو سے قادر مطلق اور خالق کائنات ہے، ارسطو کے خدا سے کیا واسطہ

ارسطو میں Generalization اور classification
کی بے حد قوت تھی لیکن میں نے کسی فلاسفر کو نہیں دیکھا کہ اس کے معاصرین نے
یا پیچھے آنے والوں نے اس کی تردید نہ کی ہو ؎

صدیوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

میں خدا کا نام تو جانتا ہوں۔ خدا کا خیال ناممکن پاتا ہوں۔ ماسوا پیش نظر
ہے۔ جہاں اس کا خیال آیا، خیال خدا غائب ہوگیا۔ عبرت، فنا، اسی سے دل کو
ایک مزا ہے۔ مزہ حسب دستور بہت بڑھ جاتا ہے۔ مُقر چپ ہے۔ منکر کو
خبر نہیں ہے۔"

حضرت اکبر بڑے ہی ذی مروّت تھے، کسی کی دل شکنی روا نہ رکھتے۔ سچ سے سچ بات کہنے
کے باوجود مخاطب سے ایسا طرز اختیار کرتے کہ اس کے دل پر کسی قسم کا بار نہ ہو، چنانچہ اس خط کے
بعد ہی دوسرے خط میں لکھتے ہیں، اور سچ بات پر قائم رہتے ہوئے اور اس کا اعادہ کرتے ہوئے
لکھتے ہیں:۔

"کل میں نے بہت بے تکلفانہ آپ کو خط لکھا، لیکن معافی چاہتا ہوں، بہت
کچھ غیر متعلق ہے۔ آپ اپنا کورس خود خوب سمجھتے ہیں، جو لکھا وہ سب واپس
لیتا ہوں۔ بجز اس کے کہ قرآن مجید میں صرف Prime mover
(یعنی محرک اوّل یا علّت اولیٰ) نہیں بلکہ خدا قادر مطلق ہے۔ سورہ رحمٰن میں
کل یوم هو فی شان ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے سوا صدہا آئتیں ہیں۔"

۱۹۱۶ء میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد نے اردو انسائیکلوپیڈیا کی تدوین
کی تحریک اٹھائی تھی، راجہ صاحب محمود آباد (سر علی محمد خاں مرحوم) نے اس کام میں شاہانہ امداد کا
وعدہ کیا تھا۔ حضرت اکبر نے یہ چرچا اخبارات میں پڑھ کر یہ خط تحریر فرمایا:۔

" لٹریری محفل کی پہل پہل مبارک ہو۔ انسائیکلوپیڈیا کی خبر اخباروں میں چھپ گئی۔ خدا راست لائے۔ پہلے مجھ کو اپنا مصرعہ یاد آیا تھا۔ ؏

فرنیچر ہم لے رہے ہیں اور گھر کوئی نہیں

لیکن پھر میں نے اپنا مطلع یاد کیا ؎

دنیا کی طوالت بے حد ہے، خلقت کا تو لمبا قصہ ہے
ہر شخص نقطۂ غور کرے اس کل میں مرا کیا حصہ ہے

اس لحاظ سے آپ اور سید سلیمان صاحب ٹھیک راہ پر ہیں۔ سب کچھ ہو جائے یہ خدا ہی کے ہاتھ ہے، دو شعر بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے ؎

| | |
|---|---|
| خدا نے جو غیرت عطا کی ہو تم کو | تو ملّت کے اعلیٰ مقاصد کو دیکھو |
| اولوالعزمیٔ راجہ صاحب کو سمجھو | مذاقِ سلیمان و ماجد کو دیکھو" |

رسالہ معارف میں ایک فلسفیانہ مضمون دیکھ کر، حضرت اکبر لکھتے ہیں:۔

" ایسی بحثیں کہ خدا اپنا مثل پیدا کر سکتا ہے کہ نہیں، مجھے ہمیشہ تعجب میں ڈالتی ہیں، کیوں نہ یہ بھی پوچھا جائے کہ اللہ میاں خودکشی کر سکتے ہیں یا نہیں۔ ان غریبوں کو اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ نے چکّر میں پھنسا دیا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ کل شئی کے مفہوم کو نہیں سمجھا۔ خدا غیر مخلوق مان لیا گیا تو وہ جس کو پیدا کرے گا وہ مخلوق ہوا یا غیر مخلوق ؟

مولانا عبدالماجد صاحب نے ۱۹۱۷ء میں اکبر صاحب کو لکھا کہ میں مکالات برکلے کا اردو ترجمہ کر رہا ہوں۔ اکبر صاحب نے داد دی، لیکن بالکل نئے پہلو سے، یعنی بجائے مادّی پہلو کے اس کے روحانی پہلو سے:۔

" میں خوش ہوں کہ آپ برکلے کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ آپ کو خود انشاء اللہ بہت فائدہ پہنچے گا۔ بشرطیکہ آپ کو اس کی پرواہ ہو۔ میرا مطلب باطنی فائدے سے ہے "

اس خط میں گرمی کی شدت کا ذکر کس بے ساختہ پن سے رعایت لفظی کے ساتھ فرمایا ہے:۔

" جون نے جان چھوڑ دی تو جولائی میں شاید ملتا ہو "

اکبر صاحب، دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اپنے خطوط میں بھی کثرت سے کھینچتے تھے۔ چنانچہ ۲۸ راگست ۱۹۱۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"میں کیا، میری زندگی کیا ہے

فلک مشاق ہے، پیہم نیا جلوہ دکھانے میں
زمیں کو دیر کیا گزرے ہوؤں کو بھول جانے میں

۔۔۔۔ راجہ غلام حسین صاحب کا انتقال عبرت انگیز ہے، وہ مجھ سے بھی ملے تھے، لیکن بھول جانے میں دنیا کو دیر نہ لگے گی۔ کیا راز ہستی ہے۔ خدا غور کی فرصت دے"

حضرت اکبر کو دنیا محض شاعر اور ظریف شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے، لیکن ان کی زندگی کے واقعات اور کلام کے نمونے اُن کے عارف باللہ اور روشن ضمیر ہونے کی بھی بخوبی شہادت دیتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی بعض فلسفیانہ تصانیف کی اس زمانہ میں حیدر آباد وغیرہ میں بہت شدید مخالفت جاری تھی، اور متعدد علماء نے بڑے سخت فتاوی تکفیر شائع کئے تھے۔ حضرت اکبر نے اس زمانہ (۱۰ جون ۱۹۱۸ء) کے ایک خط میں حسب ذیل اشعار کہے، ان میں جو پیشین گوئی یا حضرت اکبر کی دعا تھی، وہ اُن کی زندگی ہی میں پوری ہو کر رہی ؎

"ماجد کو آپ کہئیے بیگانۂ طریقت　　　دل میں مرے تو ہے اک امید کا قصیدہ
ہیں غالباً وہ مصداق اس شعر پُر اثر کے　　　ارشاد کر گیا ہے اک عبد برگزیدہ
من پاک باز عشقم ذوق فنا چشیدہ　　　آہوئے وحشت ہویم از ماسوا رسیدہ"

اکبر صاحب نے فلاسفۂ یورپ کی کتابوں کا مطالعہ بھی گہری نظر سے کیا تھا، لیکن ہمیشہ اس نتیجہ پر پہنچے جس پر ایک پختہ مرد مومن کو پہنچنا چاہیئے۔ لکھتے ہیں:-

"۱۹۱۳ء میں برگسان (مشہور فرنچ فلسفی) کا اکسپوزیشن شائع ہوا ہے۔ میرا دل تو اب نہیں لگتا۔ کہاں تک ذہن کو قلابازیاں کھلاؤں۔ افلاطون سے لے کر کانٹ، ہیگل اور بکسلے تک سب کا عروج و زوال دیکھا۔ لفاظیاں اور خیال آرائیاں ہیں۔ برگسان کی بھی عمر کیا ہے

جو دل نشین ہو جائے، وہی سب کچھ ہے۔ میں نے تو کہہ دیا ہے ؎

صدیوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی"

ایک اور خط میں فنا کا ذکر ہے:-

"دنیائے فانی پر نظر کرتا ہوں تو سب ہیچ نظر آتا ہے۔ آپ کو میں نے اسی سبب سے موافق پایا کہ فنا پر آپ کی نظر ہے۔ اسی میں سب کچھ ہے۔ آپ کے سوا کسی نے مجھ کو ان اشعار کی داد نہ دی ؎

دنیا میں جسے جو پیش آیا اکبرؔ
بس اس کے مطابق اس کی حالت بھی ہوئی"

اوپر کی سطروں میں حضرت اکبرؔ کا ایک خط درج ہو چکا ہے، جس میں انہوں نے مولانا عبدالماجد کے ضمن زمانہ الحاد میں اُن کے بارے میں بہت خوش آیند پیش گوئی فرمائی تھی، اس سلسلہ میں ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

"دوستوں نے آپ کو مسلمان ثابت کرنے کو قلم اٹھایا، میں نے عاشقانِ الہٰی میں داخل کر دیا۔ بناہ اللہ کے ہاتھ ہے"

مکتوب الیہ نے ایک بار حضرت اکبرؔ سے سفر حیدرآباد دکن کی استدعا کی۔ جواب میں یہ شعر مرحمت ہوا ؎

مشتاق ترا اکبرِ رنجور بہت ہے
افسوس یہی ہے کہ دکن دور بہت ہے

اخبار اسلامیہ میل بمبئی کے سابق ایڈیٹر نے لکھنؤ سے ۱۹۱۰ء میں ایک روزنامہ "اخوت" کے نام سے نکالا تھا، اس کے ایڈیٹر کو کسی مضمون کے سلسلہ میں جیل جانا پڑا۔ حضرت اکبرؔ نے برجستہ یہ شعر کہا ؎

"خبر آئی اسلامیہ میل میں اخوت کو جانا پڑا جیل میں"

۱۹۱۰ء میں جب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی میں فلسفیت کے بجائے اسلامیت کے آثار نمایاں ہوئے۔ حضرت اکبرؔ دل سے مسرور ہوئے، ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"میں نے بے ساختہ آپ کی نسبت لکھ دیا تھا ع

آہوئے دشت ہو یم از ما سوا رمیدہ

میں خوش ہوں کہ اس کی صداقت کے آثار آپ کی صاف اور بلند طبیعت سے نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے مکرم ڈپٹی صاحب مرحوم کو شاید شبہ و افسوس تھا کہ لڑکا دین سے بیگانہ ہوتا جاتا تھا۔ اب فرشتوں سے یہ سن کر ان کی روح خوش ہو گی کہ وہ لڑکا حقیقت آشنا ہوتا جارہا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد کہدے گا کہ "بیقلمے رسیدہ ام کہ مپرس" یہ فلسفہ کہ وجود در حقیقت ذہن ہی میں ہے علم باری میں ہے، اور علم باری ہی سب کچھ ہے؛ ایسا صحیح فلسفہ ہے کہ میں اس کو کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام کی ایک صوفیانہ تفسیر سمجھ سکتا ہوں۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان میں لفظ فنا سے ظاہراً، یہی سمجھا جاتا ہے کہ بالآخر ہر شئے کو فنا ہے۔ لیکن ذہن کہتا ہے کہ بالآخر کیسا۔ جب غور کرو اور حقیقت پر نظر ڈالو تو کل پر فنا حاوی ہو جاتی ہے۔ صرف علم باری رہ جاتا ہے۔ ہمہ اوست یہیں سے ہے"

اس کے بعد ایک اور خط میں اپنے دو خاص اشعار پیش کئے ہیں ؎

موت سے وحشت بشر کا اک خیالِ خام ہے اصلِ فطرت میں فقط آرام ہی آرام ہے

غم میں بھی قانونِ فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے دشمن نہیں

اکبر کی صحت پیرانہ سالی میں بہت خراب ہوگئی تھی۔ اکثر خطوں میں اس کا ذکر ہے۔ مثلاً ۱۹۱۱ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ناتندرستی زندگی تلخ کر دیتی ہے، میں تو اس کی نذر ہو گیا ہوں ؎

خلق مجھ سے طالبِ پابندیٔ اخلاق ہے

میری یہ حالت کہ مجھ پر چھینک بھی شاق ہے

اس سے قبل کے ایک خط میں مرقوم ہے:۔

"میں ہنوز معذور اور قریباً صاحبِ فراش ہوں۔ ۲۶ دن سے معمولی غذا بھی نہیں۔ ساگو، حریرہ وغیرہ بے رغبتی سے پی لیتا ہوں۔ کسی خلطِ فاسد کا ہیجان ہے، اور ضعف کے

سبب سے تفتیش کامل نہیں ہو سکتا۔ شدید دوران سر کی تکلیف میں مبتلا رہتا ہوں"
ایک خط میں اپنا یہ پُر عبرت شعر تحریر فرمایا ہے۔

"زندہ ہوں تو مجھ پہ ہنسنے والے ہیں بہت
مرجاؤں تو کوئی رونے والا نہ رہے"

اور ۱۹۲۰ء کے ایک خط میں اپنی حالت، ضعف پیری، اور علالت کا کتنا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔

"عمر و آلام نے کیا پامال — کوئی رگ دل میں اب جہندہ نہیں
سانس لینا ہی زندگی ہے اگر — تو ہے زندہ ہوں ورنہ زندہ نہیں"

اسی خط میں اپنے تین متفرق شعر اور تحریر فرمائے ہیں۔

"نہ عدوں کا یاں ہے نشاں نہ محل حرف و بیاں کہیں
مرا عشق ہے ترا حسن ہے، مری آنکھ ہے تری شان ہے"

میرے اس مصرعہ پر سب کی واہ ہے — ہوش میں ہوں۔ زندگی اللہ ہے

یہ جتنے ذرے جہان فانی کے اپنی شکلوں میں جلوہ گر ہیں
خدا کی ہستی کے سب ہیں شاہد اور اپنی ہستی سے بے خبر ہیں

اس زمانہ میں تحریک خلافت و ترک موالات شروع تھی۔ علی برادران تازہ تازہ رہا ہوئے تھے۔ حضرت اکبر سیاست سے الگ بلکہ لادینی سیاست پر خاصے معترض رہتے تھے۔ ان حضرات کی رہائی پر اظہار مسرت کے ساتھ ساتھ لکھتے ہیں

"لیکن میں تو صرف اسی امید سے خوش ہو سکتا ہوں کہ برادران ممدوح، مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی ترقی میں بدل توجہ فرمائیں گے"

۲۴ جنوری ۱۹۲۰ء کے تحریر کردہ ایک خط میں مکتوب الیہ کے ایک خط کے جذبہ مذہبی سے متاثر اور مسرور ہو کر لکھتے ہیں، اور بڑھاپے میں بھی جوانوں سے بڑھ کر جوش ایمانی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ماشاء اللہ چشم بد دور۔ میں ہرگز گمان نہ کر سکتا تھا کہ آپ اس بلندی پر پہنچ گئے ہیں۔ آپ

علواً فی الارض مدت سے میرے پیش نظر ہے۔ خاموشی کے ساتھ باطنی ترقی میں مصروف رہیے لقد جئتمونا فرادیٰ کما خلقناکم اوّل مرّۃ یاد رکھئے ...... آئیے ہم لوگ اللہ کے واسطے، حق کے واسطے، روحانیت کے واسطے عقل سلیم کے واسطے، متانت و وقار کے واسطے، ایک جماعت ہوں، لیسے لوگ کم ہیں۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ابتدا ہی میں اس نے آپ کی نسبت مجھ کو اس مصرعہ کو متعلق کرنے کا الہام فرمایا۔

آہوئے وحشت ہوئیم از ماسوا رمیدہ

آپ بوڑھے نہیں ہفسر نہیں۔ آیۂ علواً فی الارض پر نظر پہونچ جانا حیرت انگیز ہے"۔

اپنی حد سے بڑھی ہوئی خرابیِ صحت اور معذوریوں کا ذکر ایک اور خط میں:۔

"ہوائے سرد نے اعضا کو بہت مضمحل کر دیا تھا۔ احساس فنا اور یہ نوبت عمر۔ اس خیال سے عملی زندگی میں بہت حرج ہوتا ہے کہ معلوم نہیں کس وقت شمع حیات گل ہو جائے۔ جب کبھی تجیر کم ہوتی ہے تو البتہ پھر حواس دنیا سے مانوس ہو جاتے ہیں"۔

مولانا سید سلیمان ندوی، وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے یورپ گئے تھے، اسی سلسلہ میں اُن کا جانا پیرس بھی ہوا وہاں سے وہ اپنے خطوط مولانا عبد الماجد دریابادی کے نام بھیجتے تھے، اور اُن کی اشاعت اخبار ہمدم لکھنؤ میں ہوتی تھی۔ حضرت اکبر نے ایک اسی قسم کا مکتوب پڑھ کر ذیل کا شعر تحریر فرمایا ؎

"دعائیں کر رہے ہیں ہم یہاں مسجد کی دریوں پہ
مبارک ہو، سلیمانی نظر پیرس کی پریوں پر"

پروفیسر سید نواب علی کا ایک مطلع حضرت اکبر کو بہت پسند آیا۔ اس پر چند مصرعے لگا کر اس ہدایت کے ساتھ مولانا دریابادی کو بھیجے کہ رسالہ معارف اعظم گڑھ میں طبع کرا دیجئے۔

"نواب اور علی سے ترکیب نام کی ہے  مقبول بلکہ خوبی ان کے کلام کی ہے
کیا لاجواب مطلع کل آپ نے سنایا  سالک نے راہ پائی عارف کو وجد آیا
اترے ہیں جو زمیں پر روشن دماغ لے کر  وہ ڈھونڈتے ہیں مجھ کو دل کا چراغ لیکر"

ایک یورپین مدعی فلسفہ کا مضمون حضرت اکبر کی نگاہ سے گزرا، مضمون مع اپنے اس شعر کے مولانا دریابادی کو

ارسال کیا۔ ؎

"وحیرت میں ختم ہوگئی انشائے زندگی

حل ہو سکا نہ ہم سے معمائے زندگی"

انتقال سے چند ماہ قبل والے خطوط خرابی صحت اور دوسرے مصائب اور ترددات کے ذکر سے لبریز ہیں۔

مثلاً ایک خط میں ارقام ہوتا ہے:

"شدید مصائب اور ترددات میں مبتلا ہوں، خانہ ویرانی، بے سامانی، بے کسی الاقارب کالعقارب، اس پر امراض لاحقہ ایسے کہ قریباً حالت نزع میں ہوں۔ ضعف کی حد نہیں عمر اتنی ہو چکی کہ ہر نفس کو نفس آخر سمجھتا ہوں۔ حوادث نے اس حلقہ میں رہنے پر مجبور کیا ہے جو ہم سے مذاق و خیال میں تباین کلی ہے"

اس کے معاً بعد دوسرے خط میں:۔

"مجھ پر اب زندگی بار ہے، کیونکہ لذت زندگی اور ذوق فردا سے مایوس ہوتا جاتا ہوں"

۱۰ر جولائی ۱۹۲۱ء کے خط میں اور زیادہ صراحت ہے۔

"اپنا حال کیا لکھوں ؎

خیال مرگ نے اس عمر میں زائل کیا اس کو

حلاوت زندگی کی تھی فقط امید فردا سے "

عبدالقوی دریابادی

---

# سلام

قلب مومن پہ ابھرتے نہیں باطل کے نقوش

تیری تلوار نے توڑا ہے طلسم اصنام

منتظر ہے ترے اجلاس کا اورنگ جہاں

خاک یثرب کو نے مسلم تجھے بھیجا ہے سلام

شوکت جونپوری

ایک عالم متبحر تھے وحید دوراں
حامل شرع متیں، واقف اسرار قرآں

منطقی فلسفی معقول میں منقول میں فرد
اور تھیں جملہ احادیث نبی ورد زباں

نیک خو نیک نفس نیک سیر نیک نہاد
نیکیاں آپ کی تھیں چہرۂ اقدس سے عیاں

ایک صد ذہن میں رکھتے تھے براہین ساطع
بہر اثبات وجود ملک کون و مکاں

اپنی تحقیق پہ تدقیق پہ تھا ناز انہیں
اس تفحص پہ وہ رکھتے تھے بہت زعم گماں

ایک دن ان کا گذر ہو گیا سوئے صحرا
کاٹتا گھاس نظر آیا وہاں اک دہقاں

آپ نے اس سے کہا یہ تو بتا مرد ضعیف
حق کو تو مانتا دل سے تو ہے خلاق جہاں

اس یقیں کے لئے ہے پاس ترے کوئی دلیل
یا یونہی رکھتا ہے اَن دیکھے خدا پر ایماں

اس بچارے نے کہا مجھ کو نہیں کچھ معلوم
میں فقط جانتا اتنا ہوں کہ ہے اللہ سبحاں

سارے جانداروں کا دنیا میں وہ تنہا ہے کفیل
اور پتھر کے بھی کیڑے کا ہے وہ رزق رساں

بات گھسیارہ کی سن کر لگے کہنے دل میں
[illegible] آباد ہیں کیسے ناداں

پاس جن کے نہ سبب ہے نہ وجہ ہے نہ دلیل
پھر بھی اللہ کی ہستی پہ ہے ان کو ایقاں

آخر اک روز وہ وقت آپ کا آیا جبکہ
نفس عنصری سے اڑنے کو تھا طائر جاں

حمد و تہلیل میں مشغول تھے وہ مرد خدا
دفعۃً سامنے ظاہر ہوا ان کے شیطاں

لگا کہنے کہ ہے بے سود یہ ذکر [illegible]
[illegible] کس کی خدائی ہی کہاں

آپ نے پیش کئے اس وقت دلائل ساری
ان میں ہر ایک تھی اپنی جگہ قاطع برہاں

قطع ابلیس نے یوں کر دیں براہین انکی
کاٹے فولاد کو جس طرح سے تیغ براں

سخت چکر میں پھنسے کچھ بچاتے نہ بنی
آخری وقت میں زائل لگا ہونے ایماں

بات دہقاں کی جو یاد آئی تو جھٹ سے بولے
مانتا ہوں میں خدا کو بے دلیل و برہاں

تب کہیں جا کے رہا آپ کا ایمان قائم
اور اللہ نے کی آپ کی مشکل آساں

بندہ کو چاہئے اللہ کے کرم پر ہو نظر
ورنہ ہو علم و ہنر پہ کبھی اپنے نازاں

تیرے اشعار میں کیف اب وجیہہ کچھ بھی نہیں
نہ غزل ہے نہ قصیدہ نہ نوا ہے نہ فغاں

وجیہہ دہلوی

# "گالیاں"

دشنام طرازی ایسا مذموم فعل ہے جسے ہر زمانے میں قابل ترک اور ناستحسن قرار دیا جاتا رہا۔ اقوام عالم نے اس سے نفرت کی۔ اور مذہبوں نے اسے بُرا سمجھا۔ سوسائٹی بیزار رہی اور تہذیب و شائستگی نے منہ لگانا پسند نہ کیا۔ اخلاق کو کاوش رہی اور انسانیت نے تو اس کے تصور ہی کو معصیت گردانا!

نفرت و بیزاری کے اس امنڈتے ہوئے سیلاب کے باوجود گالیوں میں نجانے کس بلا کی کہربائی جاذبیت ہے کہ ابنائے زمانہ کے قلوب کاہ کے مانند اس کی جانب کھنچتے گئے اور وہ گھس پل کر بزم انسانی میں جگہ حاصل کرتی رہی۔ جس حد تک قیاس کی رسائی ممکن ہے یہ گمان مبالغہ نہ سمجھا جائے گا کہ حضرت انسان کی تخلیق کے ساتھ ساتھ گالیوں نے بھی جنم لیا اور ارتقائے آدمیت کے پہلو بہ پہلو عروج کی منزلیں قطع کرتی رہیں۔

چشم جویا کو صحن ہستی میں کوئی دور ایسا دستیاب نہ ہوگا جب انواع و اقسام کی حسین و کریہہ گالیاں سمع خراشی کرتے سنائی نہ دیں۔ ماضی ہی پر موقوف نہیں عصر حاضرہ میں بھی اگر ایک محلے سے دوسرے محلے میں جانے کا اتفاق پیش آجائے تو قدم قدم پر طرح طرح کی رنگین و خاطر نواز گالیاں آویزۂ گوش بنتی چلی جائیں گی جو اختراع قدیم و جدید کا مجموعہ ہوں گی۔

گالیوں کی دل چسپ بہاریں تقریبوں کے موقعوں پر بھرپور جوان نظر آتی ہیں۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ وہ تقریب ..... تقریب کہلانے کی شایاں نہیں جس میں گالیوں کے خاطر پذیر راگ الاپے نہ جائیں۔ وہ منظر جنت نگاہ و فردوس گوش ہوتا ہے جب مہندی رچے ہاتھوں سے پائینچے سنبھالے منتظمہ خواتین اہتمام کے سلسلے میں ادھر سے ادھر پھدکتی اور ہزار داستاں کی طرح چہکتی پھرتی ہیں .......

لیکن تقریبوں کا وہ حصہ بھی دید نی اور یادگار کی حیثیت رکھتا ہے جب میراثنیں ساز کی سریلی جھنکار پر

سمدھی، سمدھنوں اور نوشاہ کے خاندان والوں کی خدمت میں میٹھی میٹھی نشاط افزا گالیوں کے تحفے پیش کرتے ہوئے صلہ و انعام سے جھولیاں بھرتی ہیں۔

دراصل دشنام طرازی ایک فن ہے۔ اس کو قاعدے اور قرینے سے برتنے کے لئے شعور اور سلیقے کی ضرورت ناگزیر ہے۔ ہر کس و ناکس میں گالیاں استعمال کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ جو نافہم افراد آنکھیں بند کر کے زبان کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ مرزا نوشہ کے اس شعر کا مصداق ہوتے ہیں ۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

کہا جاتا ہے مرزا غالب مغفور نے ایک دفعہ اس فن لطیف پر ہلکی سی فلسفیانہ روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا تھا کہ :- "جو احمق مجھ ستر برس کے بوڑھے کو 'ماں' کی گالیوں سے سرفراز کرتے ہیں وہ حضرات گالیوں کے آرٹ سے قطعی بے نصیب معلوم ہوتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک منطقی اُصول محض مہمل اور بے معنی ہیں! ہونا تو یہ چاہیئے کہ بُڈھوں کو جوش دلانے کے لئے 'بیٹی' کی گالی دی جائے جو سن و سال کے اعتبار سے اُن کے حسب حال ہے جوانوں کو 'جورو' اور 'بہن' کی گالیاں سنانا بہتر ہوگا کہ یہ اُن کی فطری غیرت و حمیّت پر تازیانہ ثابت ہوں گی۔ اور بچوں کے واسطے 'ماں' کی گالی مناسب و موزوں ہے کیونکہ اُن کے واسطے 'ماں' سے بڑی کوئی نعمت یا محبت کا مرکز نہیں ہوتا۔"

گالیوں کے آرٹ پر مرزا صاحب کی یہ رائے حرف بحرف بجا و درست۔ لیکن گالم گلوچ کے شیدائی بر وقت اس منطقی اصول کو یک لخت نظر انداز کر دینے کے خوگر ہوتے ہیں اور جوش و خروش کے عالم میں ایسی ایسی بے نقط سنانے لگتے ہیں کہ خدا کی پناہ!

گالیوں کے اقسام تو بے شمار ہیں لیکن جو گالیاں اکثر کانوں میں پڑا کرتی ہیں اُن کی مختصر فہرست وسعت معلومات کے لئے حاضر ہے۔

۱:- تفریحی گالیاں — یہ از رہِ مذاق و بے تکلفی استعمال کی جاتی ہیں۔ ان میں لطیف و نازک گالیاں بھی ہوتی ہیں، بھدی اور گھناؤنی بھی۔ اِن گالیوں سے فریقِ ثانی کو ذلیل و حقیر کرنے کا مقصد پورا نہیں

کیا جاتا بلکہ افراطِ محبت اور بے تکلفی کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

۲:- جلالی گالیاں۔ گالیوں کی یہ قسم بڑی خطرناک و بلا آفریں ہوتی ہے! جذبات کی برافروختگی اور قلبی غیظ و غضب کی آئینہ داری انہیں گالیوں کا مفروضہ ہے۔ اس کی افراط و تفریط کے ہولناک و تباہ کن نتائج اکثر و بیشتر مار پیٹ، خون خرابہ، عدالتی عدالتہ اور ترکم ترکا کی صورت میں رونما ہو کر جسمانی اور اقتصادی خسارے کا موجب قرار پاتے ہیں۔

۳:- مظلومانہ گالیاں۔ گالیوں کی اس صنف پر "کھسیانی بلی کھمبا نوچے!" والی مثل صادق آتی ہے۔ جب کوئی کمزور کسی شہزور کے مقابلے میں غلبہ حاصل کرنے سے ناکام رہتا ہے تو بے چارہ اپنی بے بسی پر تسبور تے ہوئے سڑی سڑی گالیاں دے کر جی ہلکا کرتا اور دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ چاہے اس سلسلے میں فریقِ غالب کے لات گھونسے ہڈیوں پسلیوں کا چورہ ہی کیوں نہ کر ڈالیں! علی الخصوص اس قماش کی گالیوں میں کلّہ دراز عورت کی حیثیت ایکسپرٹ کی سی ہوتی ہے کہ جسم کی تکا بوٹی ہو جائے مگر زبان کا طوفان میں کہیں لمحہ بھر قیام نہیں کرتا!

۴:- مردانہ گالیاں۔ یہ گالیاں دل چسپ بھی ہوتی ہیں اور طرفہ تر بھی۔ ان کے استعمال سے شجاعت و بسالت کا اظہار مقصود ہوتا ہے خواہ ان اوصاف سے متکلم کو دور کا علاقہ بھی نہ ہو! کبھی مردانہ ساکھ قائم رکھنے اور مخاطب کو مرعوب کرنے کے واسطے بھی مردانہ گالیوں کی نمود و نمائش اہم مقصود ہوتی ہے۔ ان گالیوں کے استعمال کا کوئی وقت مقرر ہوتا ہے نہ مقام! کلام کے آغاز، درمیان اور انجام پر ان کی دُرافشانیاں بصیرت نوازی کرتی رہتی ہیں۔

۵:- زنانہ گالیاں۔ ان کی حقیقی ترجمانی کے لئے صحیح تمثیل دریافت کرنا امرِ محال ہے! البتہ تھوڑی بہت مشابہت بیسویں صدی کی پیداوار "ایٹم بم" سے حاصل ہو سکتی ہے جس کی تباہ کاریوں نے جاپان کا کس بل نکال کر طوقِ غلامی سے جکڑ دیا۔ ان لطیف و نازک گالیوں کا فیضان عام ہے۔ ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

ان گالیوں کی خاطر نواز گھما گھمیوں سے کوئی گھر محفوظ ہے نہ کوئی رستہ! وہ جب باران کی طرح برسنا

شروع ہوتی ہیں تو جھڑی لگ جاتی ہے اور تھمنے کا امکان مفقود ہو جاتا ہے۔ اُن کی چاندماری سے ماضی کی تاریکیوں میں مخفی ہو جانے والے اسلاف محفوظ رہ سکتے ہیں نہ مستقبل کے اُفق پر تاروں کے مانند جگمگ کرتے ہوئے اخلاف کا دامن بچ سکتا ہے۔ اُن کی مثال کانٹے کی سی ہے جو بس وطلا کو ایک ہی پلڑے پر وزن کر دیتا ہے! وہ ایک اشت کیا معنی؟ ہزار پشت کو آن کی آن میں پُن کے رکھ دیتی ہیں۔

۶:۔ معشوقانہ گالیاں۔ یہ گالیاں مقام معشوق ناز میں سامعہ نوازی کرتی ہیں اور اس درجہ لطیف وکیف پرور ہوتی ہیں کہ نثار نثار ہو جانے کو جی تڑپنے لگتا ہے! ان گالیوں سے انقباض طبیعت کے بدلے سرور نفس حاصل ہوتا ہے۔ یہ شریف زادیوں میں شاذ شاذ اور مال زادیوں میں بکثرت رائج ہیں۔

۷:۔ ادبی گالیاں۔ اِن گالیوں کو زینت بزم ورونق قرطاس بنانے والے ماشاءاللہ ہمارے ادیب وشاعر ہیں جو کمال فصاحت وبلاغت کے ساتھ آرٹ کی دل آویزیوں میں پیش کرتے ہوئے جوہر شناس و نکتہ داں سامعین کی نیاضانہ تعریف وستائش کے حوصلہ افزا پھولوں سے دامن دل بھر لیتے ہیں۔ ان میں اکثر گالیاں تو ہنگامی جوش انبساط پیدا کرنے کے بعد صدا بصحرا ہو کے رہ جاتی ہیں۔ ذہنوں میں اُن کا تصور تک باقی نہیں رہتا لیکن بعض گالیاں شاعرانہ لطافتوں کے باعث سدا بہار پھول بن کر ہمیشہ ہمیشہ مشام جاں کی بالیدگی کا سبب بنتی رہتی ہیں۔

ادب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خلاقِ تہذیب وشائستگی ہے۔ لیکن یہی خالق اخلاق محسنہ جب عرصۂ دشنام طرازی میں تگ و دو جاری کرتا ہے تو آندھی بھونچال کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے! مثال کے طور پر سوداؔ، میرؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ، مکینؔ، فداؔ اور صدہا نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان کی ہجو نگاری سے انکار کی مجال نہیں۔ یہ ہجویں ایسا گنجان جنگل ہیں جو دنیائے شعر وسخن میں پھیلتی چلی گئی ہیں۔ بے شک چند شاعروں نے ایسی گندگی اچھالنے سے اجتناب کیا ہے۔ لیکن ادبی معشوق کی میٹھی میٹھی گالیوں کی آلودگی سے اُن کا دامن بھی پاک نہیں رہ سکا۔ اُن گالیوں میں کچھ ایسی حلاوتیں مضمر تھیں کہ اُن کا بیان شاعرانہ رنگ آمیزیوں کے ساتھ کمال شد ومد سے کیا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ اشرف علی خاں فغاں ؎

ہر بات بیچ روٹھنا ہر دم ہیں ناخوشی　　ہر آن دو کھتا مجھے ہر آن گالیاں

شاید حضرت فغاں کو کسی آتش خو محبوب سے واسطہ پڑ گیا ہوگا جو ہمہ دم طعن و تشنیع ۔ جھڑکیوں گالیوں کے سر تیز نشتروں سے بے چارے کی خاطر محزوں کو مجروح کرنے میں لذت حاصل کرتا ہوگا ۔ آخر کب تک؟ صبر کا پیمانہ چھلکا اور یہ راز طشت از بام ہوگیا ۔ میر تقی میر کی روداد عبرت آموز ملاحظہ ہو ؎

بات کہنے میں گالیاں دے ہے
سنتے ہو میرے بد زباں کی زباں

میر صاحب کی مسکینی اور خوئے صبر و تحمل ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ مسرتوں کو اُن کی ذات سے ساری عمر بیر رہا ۔ اُن کے معشوق نے کبھی نگاہ سیدھی نہیں کی ۔ عرض و معروض پر ناسزا کہنا جائز رکھا ۔ ناچار میر سے صابر و شاکر کو بھی صدائے احتجاج بلند کرنے کی ضرورت لاحق ہوگئی اور دل کا جذبہ شعر کے قالب میں ڈھل کر زبان پہ جاری ہوگیا ۔ میر محمدی سوز ؎

اگر وہ خفا ہو کے کچھ گالیاں دے
تو دم کھا رہو کچھ نہ بولو نہ چالو

میر سوز خود تو معشوق کی نشاط آفریں گالیوں کی لطیف ترین لذتوں سے آگاہ تھے ہی لیکن ندیمان خاص کو بھی اس کیف و سرور سے محروم رکھنا گوارا نہ کر سکے ۔ انہیں پیام دے کر اس ہدایت کے ساتھ روانہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ ناگواری محسوس کرتے ہوئے سخت و سست کہے تو الامر فوق الادب پر عمل پیرا ہو کر دل ہی دل میں لذت یاب ہوا جائے ۔ مصحفی ؎

بسوال بوسہ اُس نے مجھے ٹک کے دی جو گالی
میں ادب کے مارے اس کو نہ دیا جواب اُلٹا

شیخ صاحب ادب شناسی کے باوجود عرض مدعا کے لئے مجبور واقع ہوئے تھے ۔ موقعہ حاصل ہوتے پر دل کی باتیں زبان پر لانے میں جھجکتے نہ تھے ۔ خدا جانے اُن کی یہ جسارت و بیباکی قلبی مُراد حاصل کر سکی یا نہیں ؟ اس راز کو تو وہی خوب سمجھ سکتے ہیں ۔ البتہ اس ضمن میں جن معشوقانہ گالیوں سے سربلندی نصیب ہوئی اُس کا بیان اُن کے شعر میں موجود ہے ۔ انشا ؎

خیال کیجئے کیا آج کام میں نے کیا
جب اُس نے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا

سید صاحب کی طرفگی اور طراری معرکہ راز و نیاز میں بھی سپر انداختہ ہونا نہیں جانتی! اُن کے تیور ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اہم سے اہم موقعوں پر بھی مات کھانے والے اسامی نہیں اور سچ پوچھئے تو ہے بھی یونہیں کہ جو حسن چلا گالیوں کو الطافِ پیہم تصور کرتے ہوئے ہر دشنام پر مجرا بجالانے کے سریع الاثر گُر جانتا ہو اُسے مات دی ہی کیسے جا سکتی ہے؟ آتشؔ ؎

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا

خواجہ صاحب سپاہی منش اور آزاد روش شاعر واقع ہوئے تھے۔ اُن کا بانکپن محبوب کو بھی طرح دینے کا روادار نہ ہو سکا۔ منہ چڑانے سے جمیل چہرے میں جو نقص رونما ہوا اسے بغیر کسی لگی لپٹی کے صاف صاف کہہ گذرے۔ اِس صاف گوئی کا نتیجہ جو کچھ برآمد ہوا ہوگا اُسے تو وہی جان سکتے ہیں لیکن سامعین اس ایک نقص میں سو سو حسن ملاحظہ فرمائیں گے۔ مرزا غالبؔ ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

مرزا صاحب کو عمومیت سے سخت اجتناب تھا۔ اُن کی وضع قطع، رفتار، گفتار، نشست برخاست۔ طور طریقے ہمیشہ سب سے جداگانہ رہے۔ وہ بانکے پکارے کہا کرتے تھے۔ ؎

ہر کہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

ایک مرتبہ اُنہوں نے عالم برخستگی میں اپنے مرنے کا زمانہ معین فرماتے ہوئے تاریخ وفات بھی تصنیف کر لی تھی مگر قدرت کو اُن کی شخصیت سے تفریح منظور تھی کہ انہیں مخصوص ایام میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی اور اُس میں مبتلا ہو ہو کر عوام الناس کے قافلے ملک عدم کو روانہ ہونے لگے۔ بھلا مرزا صاحب کی انفرادیت اس مرگ انبوہ میں مرنا کیسے گوارا کر سکتی تھی؟ مرزا صاحب کو مجبوراً اپنے ارتحال کا لائحہ عمل

تبدیل کر دینا پڑا۔ اس صورت میں ممکن نہ تھا کہ وہ بھی پیش رو یا معاصرین کی طرح محبوبانہ گالیوں کی لطافت و شیرینی کا تذکرہ فرماتے۔ اُن کی معنی آفریں طبعیت نے نئی راہ تلاش کی اور انہوں نے کمال سیر چشمی و دریا دلی سے یہ سعادت رقیب کو بخش دی چوں کہ فلسفیانہ تلوّن دماغ کے مالک تھے۔ اس لئے رقیب کی پرچہ آرا ئیوں سے بہائے جاں فزا کی حلاوتوں کا اندازہ کرتے ہوئے حقائق محسوسہ کا اعلان فرما دیا۔ دوسری جگہ پھر ارشاد ہوتا ہے ؎

میں گیا بھی واں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب؟
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

مرزا صاحب اس موقعہ پر بھی چوٹ بچا گئے۔ جس قدر چھوٹی بڑی دعائیں از بر تھیں اُن سب کو دربان و دل دار کی خوشامد میں اس لئے صرف کر دیا کہ وہ حضوری حاصل کرنے کا موقع عنایت کر دے۔ بارے مراد بر آئی دربان نے راستہ چھوڑ دیا تو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ سامنے حاضر ہو کر اُن کی گالیوں کے جواب میں کیا گزارش کیا جائے گا؟ کیونکہ دعاؤں کا ذخیرہ تو باہر ہی ختم ہو چکا۔ اُن کو دُہرانا آداب عشق کے خلاف ہے اور گالیوں کا واحد جواب دعاؤں کے علاوہ ممکن نہیں۔ تیسرے مقام پر پھر فرماتے ہیں ؎

بوسہ نہیں، نہ دیجیئے، دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں

گالیوں کا چٹخارہ کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ چھیڑ چھیڑ کر گالیاں کھانے کی لذت وہی خوش نصیب عشاق بیان کر سکتے ہیں جنہیں قسمت کی میمونی سے ایسے محل فراہم ہوئے ہیں۔ ایسے ہی بختاور افراد میں مرزا صاحب بھی داخل ہیں۔ کبھی لب محبوب سکوت آشنا ہوتے ہیں تو انہیں طنزیہ ٹھوکوں سے گویا کرنے کی سعی کی جاتی ہے ؎

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھے وہ لذت دشنام

یہاں بھی مرزا صاحب کی انفرادیت جلوہ طراز ہے۔ بوسہ دلدار تو ایسا خواب شیریں ہے جس کی تعبیر کو کالعدم تصور کرنا چاہیئے۔ اس لئے دشنام کی حلاوتیں ہی نشاط روح کے لئے بسا غنیمت ہیں۔ موتی ؎

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نشیں نزاکت آواز دیکھنا

کیا کہنا؟ حکیم صاحب آخر حکیم ہی تو ہیں! اُن کی نباض نگاہیں ہمیشہ علتِ غائی پر مرکوز رہتی ہیں۔ ماہیت دریافت ہونے پر جو نسخہ تجویز فرماتے ہیں وہ پٹ نہیں پڑتا۔ وہ اکثر حُسن و عشق اور راز و نیاز کے رنگین معرکوں سے گزر چکے ہیں۔ وہ اُسی علم و تجربے کی بصیرت افروز روشنی سے گالیوں کی تلخی میں صدائے محبوب کی شیرینی محسوس فرماتے ہیں پھر اُس سے تنہا لطف اندوز نہیں ہوتے بلکہ پہلو نشینوں کی توجہ بھی اُس لطافت و نزاکت کی طرف مبذول کرتے ہوئے داد خواہ ہوتے ہیں۔ امیر مینائی ؎

تری تصویر میں یہ بات تجھ سے بھی نرالی ہے
کہ جتنا چاہیے لپٹا لو نہ جھڑکی ہے نہ گالی ہے

منشی صاحب صوفی صافی بزرگ تھے۔ انہیں ساری عمر میں ایک دفعہ بھی رندی و شاہد بازی کا طرب آگیں اتفاق نہ ہوا ہوگا۔ پھر بھلا وہ غریب ان روح پرور گالیوں کے کیف و لطف کو کیا سمجھ سکتے تھے۔ وہ تو ہوا کا رُخ دیکھتے ہوئے کہنہ مشقی اور شاعرانہ قابلیت کے بل بوتے پر کان پڑی باتوں کی تصویر کشی کر دیا کرتے تھے۔ شاید یہی راز ہوگا کہ انہوں نے اصل سے درگزر فرماتے ہوئے نقل سے لطف اندوزی کو ترجیح دینا مناسب جانا۔ البتہ مطلع کی لطافتیں اُن کی معنی آفریں طبیعت کی منت پذیر ہیں۔ مرزا داغ ؎

اے داغ بُرا مان نہ کچھ اس کے کہے کا
معشوق کی گالی سے تو عزت نہیں جاتی

نواب فصیح الملک رموز دانِ محبت تھے۔ مے نوشی اور عشق بازی کا کوئی گُر ایسا نہ تھا جو اُن کے علم و تجربے سے خارج ہو۔ اُن کی شاعری ابتدا سے انتہا تک حقائق و واقعات کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اُن کی طراوشِ طبع کا دار و مدار کلیتہً ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔ وہ خلوت و جلوت میں خدا جانے کتنی چھوٹی بڑی تُرش و شیریں گالیوں کا مزا لوٹ کر پختگی حاصل کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی زبان سے جو چھچے تلے الفاظ نکلتے ہیں وہ فی الفور ضرب المثل بن جاتے ہیں اور۔ ان سے صاحبانِ ذوق اپنی رنگین و طرب آگیں محفلوں کو زینت

دیتے ہیں پس وپیش نہیں کرتے۔

یہ نمونے تھے اس عہد کے جب ہندوستان میں ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کا دیا روشن تھا اور مغربی تہذیب کے آفتاب کی شعاعیں ہندی دماغوں میں جگمگاہٹ پیدا نہ کرسکی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں تاریکی کا دور تھا لیکن چلتے چلاتے تہذیب جدیدہ سے اکتساب نور کرنے والے دماغ کا خیال بھی سن لیجئے کہ ان دل پسند گالیوں کی ہمہ گیری میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ڈاکٹر تاثیر "ماہ نو" کراچی کے آزادی نمبر ۱۹۴۸ء میں ارشاد فرماتے ہیں ؎

وہ گالیاں مجھے دیتے ہیں، اور کیا دیتے ؟
یہ اقتضائے طبیعت ہے بس کی بات نہیں
زندہ باد گالیاں! پائندہ باد گالیاں!

فدا علی خنجر لکھنوی

## محسوسات ؟

یہی زندگی کی ہیں منزلیں یہی زندگی کا نظام ہے　　کبھی کچھ سکون خفیف ہے کبھی اضطراب تمام ہے
نہ وہ بادہ ہے نہ وہ کیف ہے نہ وہ دور ہے نہ وہ جام ہے　　نہ وہ رند ہے نہ وہ میکدہ نہ وہ میکدے کا نظام ہے
جو نظر نظر سے دیا گیا نہ کہا گیا نہ سنا گیا　　وہ بڑا حسین سندیس ہے وہ بڑا لطیف پیام ہے
وہ بکھیر دیتی ہے مستیاں وہ تمام نشہ و کیف ہے　　مجھے جام دے سے غرض نہیں تیری چشم مست سے کام ہے
وہی زندگی میں ہیں تلخیاں جو ترے بغیر ہوں لازمی　　نہ مرے لئے ہے کوئی سحر نہ مرے لئے کوئی شام ہے
نہ یہاں فریب خلوص، کہا کہ غرض پرست ہے یہ جہاں　　یہ تمام مکر کی ہے جگہ یہ نمائشوں کا مقام ہے
مری لغزشیں ہیں وہ لغزشیں، میں تمام ہوش ہوں جنہیں　　یہ اسی نگاہ کا فیض ہے یہ اسی نگاہ کا کام ہے
مری کائنات پہ چھائے گا مجھے زندگی سے ملائیگا　　کوئی مجھ کو اپنا بنائے گا یہ خیال وہ ہے جو خام ہے
مرے رخ پہ جس نے نگاہ کی ترا جلوہ اس کو نظر پڑا　　تری ذات کا میں ہوں آئنہ مری وجہ سے ترا نام ہے
تری رائے نیک ہے ناصحا ترا مشورہ ہے بجا مگر　　جو رہے نشیب و فراز پر وہ بڑی نگاہ کا کام ہے

وہ نہالؔ سے ہیں کھنچے کھنچے وہ نہال سے ہیں خفا خفا
ہمہ اضطراب ہے زندگی نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے

نہالؔ رضوی

# بادۂ سخن

رات جب پہروں خون روتی ہے
تب کہیں صبح پیدا ہوتی ہے

شبنمی اشک بے سبب تو نہیں
کچھ تو ہے جس کو رات روتی ہے

لاکھ تاروں کا سرد خوں پی کے
اک حسیں صبح پیدا ہوتی ہے

دل میں اب تیری یاد بھی تو نہیں
زندگی جانے کس کو روتی ہے

تیری یادوں کی نرم چھاؤں میں
میری بیتاب روح سوتی ہے

تم نہیں ہو تو پھر یہ راتوں کو
کس کے قدموں کی چاپ ہوتی ہے

یہ خموشی حقیقتاً صہبا
آمد انقلاب ہوتی ہے

صہبا اختر (علیگ)

# خادمہ

رچرڈ ہیئر نگر ایک خوش باش اور خوش گذران انسان تھا۔ مذہب کے علمبرداروں کے اس قول کے باوجود بھی کہ دنیا دارالمحن ہے۔ دنیا ہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ مگن رہتے ہیں۔ رچرڈ ہیئر نگر بھی اس حقیقت سے واقف تھا۔ اور یہ ایسی بات ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہوتے ہیں۔ "خیرالامور اوسطہا" جس پر پرانے زمانے کے لوگ اعتقاد رکھتے ہیں، آج کل فیشن کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اور موجودہ زمانے میں جو لوگ اس مقولہ پر عامل ہیں انہیں ایسے لوگوں کے طعنوں اور تمسخر کا نشانہ بننا پڑتا ہے، جو اعتدال اور اپنی خواہشات کو دبانے میں کوئی بھلائی نہیں دیکھتے۔ رچرڈ ہیئر نگر بھی وقتاً فوقتاً اپنے شانے سکیڑ لیا کرتا تھا۔ مگر خوش طبعی کی بنا پر کسی کا دل دکھانے کے لئے نہیں۔ دوسرے لوگ اگر خطرناک طرح سے زندگی بسر کرتے ہیں، آگ سے کھیلتے ہیں۔ صرف چند لمحوں کی لذت کشی کیلئے اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔ اس تنی ہوئی معلق رسی پر چلتے ہیں جو یا تو شہرت اور عزت تک پہنچاتی ہے یا قبر کی گہرائی میں گرا دیتی ہے۔ یا کسی مقصد کے حصول کی خاطر یا کسی مخصوص جذبے کی تسکین کیلئے اپنی جان خطرہ میں ڈالتے ہیں تو اپنا شوق پورا کیا کریں ——— رچرڈ ہیئر نگر ان کی کامیابیوں پر رشک کرتا تھا۔ نہ ان کی ناکامیوں پر اظہار افسوس۔

مگر اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ رچرڈ ہیئر نگر خودغرض یا سخت دل واقع ہوا تھا۔ وہ بہت نرم دل اور بڑی سوجھ بوجھ کا انسان تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے دوستوں کی مدد کرنے کے لئے تیار رہتا تھا اور اس کی مالی حالت اتنی اچھی تھی کہ وہ دوسروں کی تکالیف دور کرنے کی لذت سے بہرہ ور ہو سکتا تھا۔ اس کے پاس کچھ تو اپنا (آبائی ترکہ کا) روپیہ تھا اور اس کے علاوہ وہ ہوم آفس میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھا اور معقول تنخواہ پاتا تھا۔ اسے جو کام کرنا پڑتا تھا وہ اس کی طبیعت اور مزاج کے موافق تھا۔ ہر روز دفتر کا کام ختم کرنے کے بعد وہ کلب میں گھنٹے دو گھنٹے برج کھیلتا تھا۔ اور ہر اتوار کو گولف اس کا معمول تھا۔ چھٹیوں میں وہ ہمیشہ سیر و سیاحت کیلئے دوسرے شہروں میں جایا کرتا تھا۔ وہاں وہ اچھے ہوٹلوں میں ٹھیرتا اور پرانے تاریخی مقامات، آرٹ گیلریاں اور میوزیم وغیرہ دیکھا

کرتا تھا۔ وہ اکثر گھر کے باہر ہوٹلوں وغیرہ میں کھانا کھایا کرتا تھا۔ اس کے دوست اس کے گرویدہ تھے اور اُسے بہت پسند کرتے تھے۔ اسکی گفتگو بہت دلچسپ ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ کافی پڑھا لکھا آدمی تھا اور اسکی معلومات اچھی تھیں۔ الغرض وہ ایک نہایت دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ اسکی ظاہری شکل و صورت بُری نہ تھی۔ گو وہ غیر معمولی طور پر حسین بھی نہ کہا جا سکتا تھا۔ مگر وہ لمبی قامت، تندرست اور مضبوط تھا۔ اس کا چہرہ لانبا تھا اور اس سے زیرکی جھلکتی تھی۔ اس کے بال زیادہ گھنے نہ رہے تھے کیونکہ اب وہ پچاس برس کی عمر کو پہنچ رہا تھا یا اسی کے لگ بھگ تھا۔ مگر اسکی بھوری آنکھیں ابھی تک متبسم تھیں اور اس کے سب دانت مضبوط تھے۔ فطرت نے اُسے مضبوط قویٰ عطا کئے تھے اور اس نے خود بھی اپنی صحت کا بہت خیال رکھا تھا۔ دنیا میں کوئی وجہ ایسی نہ تھی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ وہ خوش نہیں۔ اور اگر اسکے انداز میں کوئی جھلک بے پروائی یا تفکرات سے آزاد ہونیکی نظر آتی تھی تو وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کا مستحق ہے۔

خوش قسمتی سے وہ ازدواجی زندگی کے پُرخطر سمندر سے بھی صحیح سلامت نکل آیا تھا۔ گو بہت سے عقلمند اور نیک لوگ اسی میں عمر بھر ڈبکیاں کھاتے رہتے ہیں۔ آغاز شباب میں اپنی اپنی رومانی محبت کی تکمیل کرنے کیلئے شادی کرنے کے بعد وہ اور اس کی بیوی چند سال نہایت مسرت بھری زندگی بسر کر کے رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے لگے تھے۔ ان میں سے کسی کا بھی یہ خیال نہ تھا کہ کسی اور سے شادی کی جائے۔ اس لئے طلاق کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھا۔ (اور طلاق رچرڈ ہیرنگر جیسے معزز انسان کیلئے مناسب بھی نہ تھی) مگر فریقین کی آسانی اور سہولت کیلئے اپنے قانونی مشیروں کی مدد سے اُنہوں نے اس قسم کی علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ جس میں ایک دوسرے کی زندگی میں مزاحم ہوئے بغیر وہ اپنی اپنی زندگیاں اپنی مرضی کے مطابق آزادی سے بسر کر سکتے تھے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے جُدا ہوئے مگر دل میں ایک دوسرے کی نسبت اچھا خیال لئے ہوئے۔

اس نے اپنا پرانا مکان فروخت کر دیا اور ذاتی رہائش کیلئے ایک چھوٹا مگر آرام دہ "فلیٹ" لے لیا۔ اس میں ایک نشست کا کمرہ تھا جس میں اس کی کتابوں کی الماریاں سجا دی گئی تھیں۔ ایک کھانے کا کمرہ تھا جس میں اس کا عمدہ فرنیچر قرینہ سے رکھ دیا گیا تھا۔ اور ایک اسکے سونے کا کمرہ تھا۔ ان تین کمروں کے علاوہ اس فلیٹ میں ایک باورچی خانہ تھا اور دو کمرے نوکروں کی رہائش کیلئے تھے۔ وہ اپنی کھانا پکانے والی کو ساتھ لے آیا۔ مگر چونکہ اب اُسے زیادہ نوکروں کی ضرورت نہ رہی تھی اس لئے اس نے اپنے سب پرانے نوکروں کو برخاست کر دیا تھا۔ اور رجسٹری آفس میں ایک ہاؤس پارلر میڈ (خادمہ)

کیلئے درخواست دیدی تھی ۔ وہ خوب واقف تھا کہ کس قسم کی خادمہ اُس کیلئے مناسب ہوگی ۔ اور یہ اس نے رجسٹری آفس والوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اُسے ایک ایسی خادمہ کی ضرورت ہے جو کم عمر نہ ہو کیونکہ (۱) اکثر دیکھا گیا ہے کہ جوان عورتیں ایک جگہ مشکل سے ٹھہرتی ہیں اور (۲) گو وہ خود عمر رسیدہ اور با اصول انسان تھا مگر لوگوں کو چہ میگوئیاں کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا ۔ خصوصاً سبزی فروش اور دھوبی کا منہ بند نہیں کیا جاسکتا ۔ اس لئے اپنی اور ایک نوجوان عورت کی عزت کے خیال سے اسکی خواہش تھی کہ اس کے یہاں ملازمت کیلئے جو عورت درخواست دے وہ تیس سال سے زیادہ عمر کی ہو اور اُس نے چاندی کے ظروف صاف کرسکے ۔ اُسے اپنے پرانے زمانے کے چاندی کے برتنوں کا شوق تھا ۔ اور اسکی یہ خواہش بجا تھی کہ وہ چھری ، اور کانٹے اور ظروف جو ملکہ این کے زمانہ میں ایک امیرزادی کے استعمال میں رہ چکے تھے احتیاط اور توقیر کے ساتھ استعمال کئے جائیں ۔ وہ بڑا مہمان نواز تھا اور ہفتہ میں ایک بار تو ضرور ہی چار سے آٹھ تک آدمیوں کو اپنے یہاں کھانے پر بلاتا تھا ۔ اُسے اپنی کھانا پکانے والی پر پورا اعتماد تھا کہ وہ ایسا کھانا تیار کرے گی جو اسکے مہمانوں کو مرغوب ہوگا ۔ اور اسکی خواہش تھی کہ اس کی خادمہ میز پر کھانا سلیقہ سے چننے اور کھانے کے دوران میں مہمانوں کی دیکھ بھال کرنے میں طاق ہو ۔ اس کے پاس کوئی Valet (ذاتی ملازم) نہ تھا اور چونکہ وہ خوش پوشاک بھی تھا اس لئے اسکی یہ خواہش بھی تھی کہ اسکے کپڑوں کی اچھی طرح نگہداشت کی جائے ۔ وہ اس قسم کی خادمہ چاہتا تھا جو اُس کے پتلونوں اور ٹائیوں پر استری کرسکے اور جسے اسکے جوتوں پر پالش کرنے سے انکار نہ ہو ۔ اس کے پاؤں چھوٹے تھے اور وہ اپنے لئے عمدہ شکل کے آرام دہ جوتے بنوانے کا خاص اہتمام کیا کرتا تھا ۔ اُس کے پاس بہت سے جوتے تھے اور وہ اس بات پر زور دیتا تھا کہ جوں ہی وہ اپنا کوئی جوتہ اُتارے ، فوراً اُسے "شوٹری" پر چڑھا کر رکھدیا جائے ۔ اور فلیٹ کو صاف ستھرا رکھنا تو اُسکے نزدیک خادمہ کا فرض اولین تھا ۔ اور یہ کہنے کی تو گویا ضرورت ہی نہ تھی کہ خادمہ کا چال چلن بے داغ ہو ۔ اور وہ متین ایماندار اور قابل اعتبار ہونے کے علاوہ ہنس مکھ بھی ہو ۔ ان سب خوبیوں کے عوض وہ اچھی تنخواہ ، معقول حد تک آزادی اور بوقت ضرورت چھٹی دینے پر تیار تھا ۔ رجسٹری آفس کے سپرنٹنڈنٹ نے اسکی ضروریات اور شرائط بلا پلک جھپکائے ہوئے سُنیں اور (بلا یہ بتائے ہوئے کہ اسکے مطالب کی کوئی خادمہ اس کی نگاہ میں ہے) ایک لمبی فہرست اُن تمام عورتوں کی اسکے سامنے رکھدی جو ملازمت کی متلاشی تھیں ۔ اس کا گویا یہ مطلب تھا کہ جو کچھ رچرڈ ہیرنگر نے کہا تھا اس پر سپرنٹنڈنٹ نے غور کرنیکی زحمت گوارا نہیں کی تھی ۔ رچرڈ ہیرنگر نے ان سب خادماؤں سے انٹرویو کیا ۔ ان میں سے کچھ تو پہلی نظر میں ملازمت

کے ناقابل معلوم ہوئیں۔ بہت کچھ تنگئی اور رنگین مزاج تھیں۔ بہت کچھ بوڑھی تھیں۔ کچھ بہت کم سن اور کچھ کا چہرہ مہرہ اور انداز اُسے پسند نہ آیا۔ اُس کے نزدیک ان سب میں ایک بھی اس قابل نہ تھی کہ جسکو ملازمت کا موقع دیا جاسکے۔ مگر وہ ایک نرم دل اور خوش اخلاق انسان تھا۔ اس نے خندہ پیشانی کے ساتھ اظہار افسوس کرتے ہوئے ان سب سے اپنی معذوری ظاہر کی اور ان کو اپنے یہاں ملازمت دینے سے انکار کردیا۔

زندگی کی ایک عجیب ادا یہ بھی ہے کہ اگر آپ سوائے بہترین اور ہر اعتبار سے مکمل چیز کے کوئی اور کمتر شے لینے سے برابر انکار کرتے رہیں تو آپ کو وہی چیز مل جاتی ہے جس کے آپ خواہشمند ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنے نصب العین سے کم درجہ کی چیز رد کردیں تو اس کا امکان ہے کہ جو آپ چاہتے ہیں وہی آپ کو مل جائے۔ ایسے موقعوں پر شاید قسمت یہ کہتی ہے کہ یہ آدمی، بالکل ہی احمق معلوم ہوتا ہے جو کمال کا جویا ہے۔ اور اپنے نسائی پندار کے زیر اثر ایک سنیت پرست کی خواہش پوری کردیتی ہے۔

ایک دن فلیٹ کے چوکیدار نے رچرڈ ہیرنگر سے کہا "حضور میں نے سنا ہے کہ آپ کو ایک اچھی خادمہ کی ضرورت ہے۔ میں ایک ایسی عورت کو جانتا ہوں جو ملازمت کی خواہاں ہے۔"

"کیا تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو؟"

رچرڈ ہیرنگر بخوبی جانتا تھا کہ مالک کی رائے کے مقابلہ میں ایک دوسرے کے بارے میں خود نوکروں کی رائے کہیں وقیع ہوتی ہے۔

"حضور، میں اُس کی شرافت اور ایمانداری کا ذمہ لیتا ہوں۔ اور وہ بہت بڑے گھروں میں کام کرچکی ہے۔"

"ہم سات بجے شام کپڑے بدلنے کیلئے آئیں گے اگر وہ اس وقت آسکے تو ہم اسے مل سکتے ہیں۔"

شام کو اس کو گھر واپس آئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ اسکی کھانا پکانے والی آئی اور خبر دی کہ جس عورت کے بارے میں صبح چوکیدار نے ذکر کیا تھا وہ آگئی ہے۔

"بلاؤ!" رچرڈ ہیرنگر نے کہا۔

اُس نے کمرے کے اندر بجلی کا دوسرا بلب بھی روشن کردیا تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ سکے کہ یہ نووارد کیسی معلوم

ہوتی ہے۔ اور خود اٹھکر آتش دان کی طرف پشت کرکے کھڑا ہو گیا۔ ایک عورت اندر آئی اور ادب سے دروازے کے پاس ہی ٹھیر گئی۔

"گڈ ایوننگ۔ تمہارا کیا نام ہے؟"

"بیسی پچرڈ"

"اور عمر؟"

"پینتیس سال"

"ٹھیک"

رچرڈ ہیرنگر نے سگریٹ کا ایک لمبا لمبا کش لگایا اور کچھ سوچتے ہوئے اسکی طرف دیکھا۔ وہ دراز قد معلوم ہوئی۔ مگر اس کا خیال ہوا کہ شاید یہ اونچی ایڑی کا جوتہ پہننے کے باعث ہو۔ اس کا سیاہ لباس بھی مناسب تھا اور اسکی چال ڈھال موزوں تھی۔ چہرہ کی وضع قطع بھی اچھی تھی اور رنگ صاف تھا۔

"ذرا اپنی ہیٹ اُتارنا۔"

اُس نے اپنی ہیٹ اُتاری تو ہیرنگر نے دیکھا کہ اُس کے بال ہلکے بھورے رنگ کے تھے۔ جن میں اچھی طرح کنگھی کی گئی تھی۔ وہ نہ موٹی تھی نہ دبلی۔ گو وہ زیادہ خوبصورت نہ کہی جا سکتی تھی مگر اس کے خدوخال میں جاذبیت تھی اور اگر وہ اونچے طبقہ سے تعلق رکھتی ہوتی تو پسندیدہ شمائل کہی جاتی۔ رچرڈ ہیرنگر نے اُس سے متعدد سوالات کئے۔ جن کے اطمینان بخش جواب ملے۔

اُس نے اپنی آخری ملازمت معقول وجوہ کی بنا پر چھوڑی تھی۔ وہ ایک "بٹلر" کی ماتحتی میں کام کر چکی تھی۔ اور اپنے جملہ فرائض سے بخوبی واقف تھی اور تنہا ایک فلیٹ کا کام سنبھال لینے پر تیار تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی مردانے کپڑوں کی دیکھ بھال کر چکی تھی۔ اور ان پر استری کرنا جانتی تھی۔ وہ ذرا شرمیلی اور کم سخن ضرور معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس کے انداز میں بے ڈھنگاپن نہ تھا۔ اس کا طرز گفتگو پسندیدہ تھا۔ رچرڈ ہیرنگر پر اس کا اچھا اثر پڑا۔ اُس نے اُس کے سرٹیفکیٹ دیکھے۔ وہ سب تعریفی جملوں سے پُر تھے۔

"اچھا سنو!" اُس نے کہا۔ "میں تم کو اپنے یہاں ملازمت دینا چاہتا ہوں۔ مگر میں آئے دن کی تبدیلیاں

کو ناپسند کرتا ہوں ۔ میری کھانا پکانے والی بارہ برس سے میرے یہاں کام کر رہی ہے ۔ اگر تم اچھی طرح کام کرو گی اور اگر یہ جگہ تم کو پسند آئیگی تو مجھے اُمید ہے کہ تم کام چھوڑ کر نہ چلی جاؤ گی ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ تین چار مہینے کام کرنے کے بعد تم ایک دن میرے پاس آکر یہ کہو کہ صاحب میں جا رہی ہوں ۔ کیونکہ میری شادی ہونے والی ہے ۔"

' اس کا کوئی اندیشہ نہیں ۔ میں بیوہ ہو چکی ہوں اور میرے لئے شادی اور ازدواجی زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے ۔ کیونکہ میرے مرحوم شوہر نے شادی کے بعد ایک دن بھی کوئی کام کر کے نہ دیا اور مجھ ہی کو اُس کے مصارف برداشت کرنے پڑے ۔ اب مجھے ایک ایسے گھر کی تلاش ہے جہاں میں ملازمت کر کے اپنی زندگی کے باقی دن گزار سکوں ۔ '

"میں بھی اس بارے میں تم سے اتفاق کرتا ہوں ۔ شادی اچھی چیز ہے مگر میری رائے میں اس کی عادت ڈال لینا غلطی ہے ۔"

اس کے جواب میں وہ خاموش رہی اور فیصلہ کا انتظار کرنے لگی ۔

رچرڈ ہیرنگر نے سوچا کہ اگر وہ واقعی ان خوبیوں کی حامل ہے جو اس کے سرٹیفکٹوں میں درج تھیں تو اُسے ہر جگہ آسانی سے ملازمت مل جائیگی ۔ اس لئے اس نے ایسی معقول تنخواہ دینے کا فیصلہ کر لیا جسے وہ خوشی سے منظور کر لے ۔ اسکے بارے میں گفتگو شروع کی ہی تھی کہ پریچرڈ نے یہ کہکر اُسے روک دیا ۔ مجھے سب معلوم ہے ۔" اُس کا یہ کہنا رچرڈ ہیرنگر کو ناگوار معلوم نہیں ہوا ۔ بلکہ اس کی سوجھ بوجھ کا اور بھی قائل ہو گیا ۔ وہ خود بھی ملازمت کی خواہشمند عورت کے بارے میں مفصل حالات جاننے کی کوشش کیا کرتا تھا مگر یہ معلوم کر کے کہ نوکری کے لئے درخواست دینے سے پہلے اس عورت نے بھی خود اُس کے بارے میں تحقیقات کر کے اپنا اطمینان کر لیا تھا اُسے خوشی ہوئی اور اُس نے پریچرڈ کے بارے میں اچھی رائے قائم کی ۔

اگر میں تم کو اپنے یہاں ملازمت دیدوں تو تم کب سے کام کرنے لگو گی ؟ میرے پاس اس وقت کوئی ملازم نہیں ہے ۔ فی الحال میری کھانا پکانے والی کسی نہ کسی طرح کام چلا رہی ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد گھر کا انتظام ٹھیک ہو جائے ۔

"میرا ارادہ تھا کہ ایک ہفتہ بعد کام شروع کردوں۔ عرصہ سے مجھے چھٹی لینے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن میں اپنا ارادہ ترک کردوں گی۔ کیونکہ خادمہ کے نہ ہونے سے آپ کو تکلیف ہے۔ آپ فرمائیں تو میں کل ہی سے کام شروع کردوں گی۔"

رچرڈ ہیرنگر اس کی طرف دیکھکر اپنے مخصوص دلکش انداز میں مسکرا دیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں تم سے تمہاری چھٹی نہیں چھیننا چاہتا۔ میرا خیال ہے کہ تم عرصہ سے اس چھٹی کی منتظر تھیں۔ ایک ہفتہ تک موجودہ حالت میں کام چل سکتا ہے۔ جاؤ خوشی سے اپنی چھٹی مناؤ۔ ایک ہفتہ بعد آکر کام سنبھال لینا۔"

"میں آپ کی بہت ممنون ہوں ——— میں اگلے ہفتہ میں حاضر ہو جاؤنگی۔ یہ ٹھیک ہوگا؟"

"بالکل ٹھیک۔"

جب وہ چلی گئی تو رچرڈ ہیرنگر کو ایسا محسوس ہوا گویا اس نے دن بھر کا کام پورا کرلیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنی مرضی کے مطابق خادمہ مل گئی تھی۔ اس نے گھنٹی بجا کر اپنی کھانا پکانے والی کو بلایا اور اس سے کہا کہ اس نے نئی خادمہ رکھ لی۔

"میرا خیال ہے آپ اس کے کام سے ضرور خوش ہونگے۔" کھانا پکانے والی نے کہا۔ "وہ آج دوپہر میرے پاس آئی تھی اور مجھ سے اس گھر اور آپ کے بارے میں کل حالات معلوم کئے تھے۔ اسی وقت مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ معقول اور قابل اعتبار عورت ہے۔ اور اس قسم کی بھگوڑی عورتوں سے مختلف ہے جو ایک جگہ ٹکتی نہیں۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں!"

"ہاں میرا بھی اس کے بارے میں کچھ ایسا ہی خیال ہے۔ مگر دیکھو مسز جیفڈی! ابھی کوئی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہوگا۔ وہ کچھ دن کام کرلے تو معلوم ہو۔ تم نے مجھے اسکے سامنے بہت ٹھوٹو نابنا کر تو پیش نہیں کیا؟"

"میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ آپ بہت نفاست پسند ہیں اور ہر کام وقت پر چاہتے ہیں۔ اور یہ بھی کہدیا کہ آپ بہت شریف اور رحم دل انسان ہیں۔ مگر اپنے ملازموں سے کام لیتے ہیں۔ کاہلی پسند نہیں کرتے۔"

"ہاں! یہ بات تو ہے!!"

"اُس نے میری باتوں کے جواب میں کہا تھا کہ جتنا کام اُس کے ذمّہ ڈالا جائیگا وہ سب کرلے گی۔ وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اگر مالک ملازم کے کام کا صحیح طور پر اندازہ کرسکے تو بڑی خوشی ہوتی ہے اور ساری محنت وصول ہوجاتی ہے۔ ورنہ یوں کام کرتے کرتے مرے جانے سے کیا فائدہ۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ نئی خادمہ اتنا اچھا کام کریگی کہ اُس پر آپ خود بھی بجا طور پر فخر کرنے کا موقع ہوگا۔"

"یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔ مگر ڈر یہ ہے کہ کہیں یہ فخر "غرور اور ناز نخرے" میں نہ بدل جائے۔"

"اب یوں تو کسی کے بارے میں کچھ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا۔ مگر حلوہ کھائے بغیر کوئی کیسے بتائے کہ میٹھا ہے یا پھیکا۔ لیکن اگر آپ میری رائے پوچھتے ہیں تو میں کہونگی کہ میرے خیال میں یہ خادمہ ہیرا ہے ہیرا۔"

اور پرچرڈ واقعی بالکل ہیرا ہی نکلی۔ وہ جوتوں کی پالش کرکے اتنا چمکدار بنادیتی تھی کہ چلتے وقت پہننے والے کا پورا جسم اُن میں منعکس ہوتا تھا۔ اور کپڑوں کی نگہداشت تو اتنی اچھی کرتی تھی کہ رچرڈ ہیرنگ کے دوست اُسے یہ کہکر تنگ کرنے لگے کہ سول سروس میں وہ سب سے زیادہ خوش پوشاک آدمی ہے۔ اب رچرڈ ہیرنگ کو اتنا آرام اور اطمینان حاصل تھا جو شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ ایک دن وہ معمول سے پہلے گھر آیا تو اُس نے رومالوں اور موزوں کی ایک قطار کی قطار غسلخانے میں الگنی پر ٹنگی ہوئی سُوکھتے دیکھی۔ اس نے پرچرڈ کو بُلا کر پوچھا:۔

"پرچرڈ! کیا تم خود میرے موزے اور رومال بھی دھوتی ہو؟ میرے خیال میں تو اس کے علاوہ ہی جو کام تمہارے ذمّہ ہے وہی بہت زیادہ ہے۔"

"دھوبی موزوں اور رومالوں کا ستیاناس کردیتے ہیں۔ اس لئے میں اُنہیں گھر پر ہی دھونا پسند کرتی ہوں —— کیا آپ کو اس پر اعتراض ہے؟"

پرچرڈ کو نہ جانے یہ کیسے معلوم ہوجاتا تھا کہ وہ فلاں وقت کیا پہنے گا اور وہ وہی کپڑے نکالکر اسکے لئے تیار رکھتی تھی۔ بلا پوچھے ہوئے اُسے نہ جانے کیونکر یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ وہ ڈنر جیکٹ اور کالی ٹائی نکالے۔ یا ڈریس کوٹ اور سفید ٹائی —— کچھ عرصہ کے بعد تو رچرڈ ہیرنگ نے اپنے "وارڈروب" سے ٹائی کا انتخاب کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ اُسے معلوم ہوگیا تھا کہ پرچرڈ وہی ٹائی نکالکر باہر رکھے گی جو وہ خود پسند کرتا۔ کپڑوں کے

بارے میں وہ اتنی خوش مذاق تھی کہ بعض اوقات تو دل ہی دل میں وہ بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اُس کے خطوط پڑھ لیتی ہے۔ کیونکہ اُسے معلوم رہتا تھا کہ وہ کہاں کہاں جانے والا ہے۔ اگر وہ کبھی بھول جاتا کہ اُسے کہیں جانا ہے تو اُسے اپنی "اینگیج منٹ بک" دیکھنی نہ پڑتی تھی۔ کیونکہ پریچرڈ اُسے بتا سکتی تھی۔ وہ بخوبی واقف تھی کہ ٹیلیفون پر لوگوں سے بات کرتے وقت اس کا لہجہ کیسا ہونا چاہیئے۔ دکانداروں سے بات چیت کے وقت اس کا لہجہ تحکمانہ ہو جاتا۔ مگر اور لوگوں سے بات کرتے ہوئے اس میں از خود نرمی اور خوش اخلاقی پیدا ہو جاتی۔ اور مسٹر ہیرنگر کے کسی ادیب دوست یا کسی پارلیمنٹ کے ممبر کی بیوی سے گفتگو کرتے وقت اُس کا لہجہ کچھ اور ہی ہو جاتا۔ کبھی نشست کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے رچرڈ ہیرنگر اُسے ٹیلیفون پر کسی کو تصنع سے خالی لہجہ میں یہ کہتے سنتا کہ "مسٹر ہیرنگر گھر پر موجود نہیں ہیں" اس کے بعد وہ اُس کے پاس آتی اور بتاتی کہ فلاں آدمی نے ٹیلیفون کیا تھا۔" اور کہتی "مگر میں نے خیال کیا کہ آپ اس وقت اس کی خواہ مخواہ کی بکواس سے پریشان ہونا پسند نہ کریں گے۔"

"تم نے ٹھیک کیا پریچرڈ!" اور وہ مسکرا دیتا۔

رچرڈ ہیرنگر کے دوست پریچرڈ کے ذریعہ اُس سے ملنے کے اوقات کا تعین کرتے اور شام کو جب وہ لوٹ کر آتا تو وہ اُسے بتا دیتی کہ اُس نے کیا طے کر رکھا ہے۔ مثلاً:۔

"مسز سومرز نے ٹیلیفون کیا تھا اور پوچھا تھا کہ کیا آپ اگلی جمعرات کو اُن کے ساتھ لنچ کھا سکیں گے؟ میں نے اُن سے کہدیا کہ آپ کو اپنی مجبوری کا سخت افسوس ہے کیونکہ اُس دن آپ لیڈی ورسینڈ کے ساتھ لنچ کھا رہے ہیں۔"

---

مسٹر اوکلے نے ٹیلیفون پر پوچھا کہ کیا آپ اگلے منگل کو شام کے چھ بجے "سیوئے ہوٹل" میں اُن کی "کوک ٹیل پارٹی" میں شریک ہونگے؟ میں نے اُن سے کہدیا کہ ممکن ہوا تو ضرور ہونگے۔ لیکن شاید اُس دن آپ کو رندان سانز کے یہاں جانا ہے۔

اور رچرڈ ہیرنگر کے پاس اُن تمام باتوں کا صرف ایک جواب ہوا کرتا تھا۔ "بالکل ٹھیک"

فلیٹ کی صفائی کا وہ خاص طور پر خیال رکھتی تھی۔ کیا مجال جو کہیں ذرا سی بھی گرد باقی رہ جائے۔ پریچرڈ کو نوکر رکھ لینے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد رچرڈ ہیرنگر چھٹی لیکر باہر چلا گیا چھٹی ختم ہوجانے پر جب وہ لوٹا تو اس نے اپنی الماری سے ایک کتاب نکالی۔ اُسے فوراً معلوم ہوگیا کہ وہ جھاڑ پونچھ کر رکھی گئی ہے۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔

"پریچرڈ! جاتے وقت میں تم سے یہ کہتا ہوں گیا تھا کہ میری کتابوں کو نہ چھونا۔ خواہ وہ کتنی ہی گرد آلود کیوں نہ ہو جائیں۔ کیونکہ جب کتابیں جھاڑنے کیلئے باہر نکالی جاتی ہیں تو پھر پُرانی جگہ پر نہیں رکھی جاتیں۔ مجھے اپنی کتابوں کا گرد آلود رہنا گوارا ہے۔ مگر مجھے اس سے بڑی کوفت ہوتی ہے کہ وقت پر کوئی کتاب اُسی جگہ نہ ملے جہاں میں نے اُسے رکھا ہو۔"

"میں معافی چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کچھ صاحبان اس بات پر بہت زور دیتے ہیں۔ لیکن میں نے آپ کی کتابوں کو جھاڑتے وقت یہ احتیاط کرلی تھی کہ جو کتاب جہاں سے اُٹھائی جائے وہیں واپس رکھدی جائے۔"

رچرڈ ہیرنگر نے اپنی کتابوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ ہر کتاب اپنی پُرانی جگہ پہ رکھی ہوئی تھی۔ وہ مسکرادیا۔

"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

اور چاندی کے برتنوں کو تو وہ اتنی اچھی طرح رکھتی تھی کہ ایک مرتبہ وہ اس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ سب برتن ملکہ این اور جارج اوّل کے زمانہ کے ہیں۔"

"جی ہاں۔ میں جانتی ہوں۔ جب کسی کو ایسی نادر چیزیں سونپ دی جائیں تو اُسے بھی انکو اچھی طرح رکھنے میں لطف آتا ہے۔"

"تم تو اس کام میں بالکل ماہر ہو۔ تم کو اس کام کا ملکہ ہے۔ میں نے آج تک کسی بٹلر کو بھی چاندی کے برتن ایسی اچھی حالت میں رکھتے نہیں دیکھا جیسے تم رکھتی ہو۔"

"مردوں کے مقابلہ میں عورتیں یہ کام زیادہ اچھا کرلیتی ہیں کیونکہ انہیں اس سے لگاؤ ہوتا ہے۔" پریچرڈ نے انکساری کے لہجہ میں جواب دیا۔

رچرڈ ہیرنگر کو جب اس بات کا احساس ہوگیا کہ پریچرڈ کل کام اچھی طرح سمجھ گئی ہے تو اس نے ہر ہفتے اپنے دوستوں کو ڈنر پر بلانا شروع کردیا۔ اُس نے پہلے دن ہی دیکھ لیا تھا کہ پریچرڈ کو کھانے کے دوران میں

خدمت کرنے کا اچھا تجربہ ہے۔ وہ نہایت مستعد۔ خاموش طبع۔ اور تیز نظر تھی۔ جوں ہی کسی مہمان کو کسی چیز کی ضرورت یا خواہش ہوتی وہ فوراً وہی چیز لئے ہوئے اسکے پاس پہنچ جاتی۔ اُسے بہت جلد رچرڈ ہیرنگ کے کل دوستوں کی عادات اور مزاج کا اندازہ ہوگیا۔ اُسے یاد رہتا تھا کہ اُن میں سے کون "وہسکی" کے ساتھ بجائے سوڈے کے پانی ملا کر پینا پسند کرتا ہے۔ اور کسے بکری کا بھنا ہوا گوشت پسند تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ "ہاک" (سفید شراب) کو کتنا ٹھنڈا کیا جائے تاکہ زیادہ سرد ہو کر اُس کا مزا نہ بگڑے۔ اور کلیرٹ" (سرخ شراب) کو کتنی دیر تک کھلا رکھا جائے جس سے کمرے میں اس کی خوشبو پھیل جائے۔ جب وہ کمال احتیاط کے ساتھ اس طرح "برانڈی" کی بوتل گلاس میں اُنڈیلتی کہ تہہ نہ ہلنے پائے تو بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ایک موقع پر اُس نے وہ شراب پیش کی جو رچرڈ ہیرنگ چاہتا تھا۔ اس پر وہ ذرا ترش رو ہوا تو بیٹریچرڈ نے اُسے بتایا۔

"میں نے وہی بوتل کھولی تھی جو آپ چاہتے ہیں۔ مگر اس کا کاگ ٹھیک نہ لگا تھا اس لئے میں یہ بیٹا نگ برتنگ (سرخ برانڈی) لے آئی۔"

"اچھی بات ہے بیٹریچرڈ!"

کچھ دن بعد اُس نے ہر کام بیٹریچرڈ ہی کے اُوپر چھوڑ دیا۔ کیونکہ اُسے معلوم ہوگیا تھا کہ بیٹریچرڈ اُسکے دوستوں کے مزاج سے بخوبی واقف ہوگئی تھی۔ اگر وہ سمجھتی کہ پینے والے اچھی اور بُری شراب میں تمیز کر سکتے ہیں تو وہ تہہ خانہ سے بہترین شراب اور سب سے زیادہ پُرانی برانڈی نکال کر لاتی تھی۔ اُسے عورتوں کے ذوق کا اعتبار نہ تھا۔ اور جب کسی پارٹی میں عورتیں مدعو ہوتیں تو اُن کے لئے وہ "شامپین" لاتی۔ جسے اس خیال سے جلدی سے پی لینا پڑتا ہے کہ رکھے رہنے سے اس کا زور کم نہ ہو جائے۔ ایک اچھے انگریز نوکر کی طرح اُسے بھی مردم شناسی کا قدرتی ملکہ حاصل تھا۔ کوئی کتنا ہی مالدار یا کتنا ہی بڑا عہدہ دار کیوں نہ ہو اُسے صاف معلوم ہو جاتا کہ کون شریف ہے اور کون نودولتا اور چھچھورا ہے۔ رچرڈ ہیرنگ کے دوستوں میں سے کچھ کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتی تھی اور جب اُن میں سے کوئی مدعو کیا جاتا تو وہ اچھی شراب کی ایسی بوتل نکال کر لاتی جسے رچرڈ نے خاص خاص موقعوں کے لئے اُٹھا کر رکھ چھوڑا تھا۔ رچرڈ اس بات کو دیکھکر کافی محظوظ ہوتا اور اپنے دوستوں سے کہتا:-

"یار! تم سے بیٹریچرڈ خفا نہیں معلوم ہوتی۔ یہ شراب وہ بہت کم لوگوں کو دیتی ہے۔"

پر یچرڈ ہر جگہ "بہترین خادمہ" کی حیثیت سے مشہور ہوگئی ۔ لوگ رچرڈ پر رشک کرنے لگے تھے کہ اس کے پاس اتنی اچھی خادمہ ہے ۔ وہ تو سونے میں تولنے کے لائق تھی ۔ ہیرے جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی !

جب اُس کے دوست پریچرڈ کی تعریف کرتے تو رچرڈ ہیرنگر کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھتا ۔

" اچھے مالکوں ہی کے اچھے نوکر ہوتے ہیں ۔" وہ خوش ہو کر کہتا ۔

ایک شام جب وہ کھانا کھا چکنے کے بعد "پوٹ" (پرتگالی شراب) پی رہے تھے اور پریچرڈ کمرے سے جا چکی تھی تو دفعتاً اُسی کے بارے میں گفتگو چھڑ گئی ۔

" رچرڈ ! اگر وہ تمہیں چھوڑ کر چلی جائے تو کیا کرو گے ؟ اس جیسی خادمہ ملنا ناممکن ہے ۔"

" وہ میرے یہاں کی ملازمت نہیں چھوڑ سکتی ۔ کئی آدمیوں نے اُسے بہلا پُھسلا کر اپنے یہاں نوکر رکھنا چاہا مگر اُس نے سب کو صاف جواب دیدیا ۔ وہ جانتی ہے کہ وہ کہاں خوش رہے گی ۔"

" ایک نہ ایک دن وہ شادی کرکے چلتی بنے گی ۔"

" میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس قسم کی عورت ہے ۔"

" صورت شکل بھی اچھی ہے ۔"

" ہاں ۔ کچھ ایسی بری بھی نہیں ۔"

" تم کیا کہتے ہو ؟ وہ بہت خوبصورت عورت ہے ۔ کسی اونچے طبقہ سے تعلق رکھتی تو سوسائٹی میں اس کی خوبصورتی کے چرچے ہوتے اور اخباروں میں اس کے فوٹو نکلا کرتے ۔

اُسی وقت پریچرڈ کافی (قہوہ) لیکر اندر آئی ۔ رچرڈ ہیرنگر نے اس کی طرف دیکھا ۔ چار سال اُسے متواتر ہر روز دیکھتے رہنے کے بعد ــــــــ اُف ! وقت کس تیزی سے گزر جاتا ہے ــــــــ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اُس کی شکل و صورت کیسی لگتی ہے ۔ جب سے اُس نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا اُس وقت سے اب تک اس میں کچھ زیادہ تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی ۔ نہ وہ پہلے کی نسبت موٹی ہوگئی تھی ۔ نہ اُس کی جلد کی تر و تازگی میں کوئی کمی واقع ہوئی تھی ــــ اس کے چہرہ پر وہی جھلک بدستور قائم تھی ۔ جو رچرڈ ہیرنگر کو پہلے دن نظر آئی تھی ــــ جذبات سے خالی مگر سنجیدگی اور ذہانت سے معمور ! سیاہ لباس واقعی اُس پر سجتا تھا ۔

پریچرڈ کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ گفتگو جو اُس کے آجانے کے باعث رک گئی تھی پھر جاری ہو گئی۔

"بلا کی حسین عورت ہے! اس میں کسی شک اور شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ بالکل درست ہے۔ اس میں سب خوبیاں موجود ہیں۔ اور اسکے بغیر مجھے سخت تکلیف ہو جائے گی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ میں اُسے زیادہ پسند نہیں کرتا۔"

"کیوں؟"

"میرا خیال ہے کہ مجھے اس سے کچھ وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ اس کے زبان نہیں۔ میں نے اکثر اس سے گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب میں اس سے کوئی بات کرتا ہوں تو وہ جواب دیتی ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔ چار برس میں اُس نے از خود مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں اس کے اور اسکی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے یا مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ یا پھر مجھے ان دونوں کے قابل بھی نہیں سمجھتی — وہ تو ایک زندہ مشین ہے — مشین! میں اس کی عزت کرتا ہوں۔ اسکی خوبیوں کا معترف ہوں۔ اس پر بھروسہ کرتا ہوں۔ اس میں دنیا بھر کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اور میں اکثر تعجب سے سوچتا ہوں کہ ان سب باتوں کے باوجود میں اس کی طرف سے اتنا زیادہ بے نیاز کیوں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی خامی ہے۔"

یہ گفتگو یہیں ختم ہو گئی۔

اس کے دو تین دن بعد چونکہ پریچرڈ کی رات کی چھٹی تھی اور ہیرنگر کا بھی کہیں باہر کا کھانا نہ تھا اس لئے تنہا کلب میں شام کا کھانا کھایا۔ وہ کھانا کھا ہی چکا تھا کہ بیرے نے اطلاع دی کہ اس کے فلیٹ سے ٹیلیفون آیا تھا اور کسی نے یہ کہلوایا تھا کہ وہ اپنی کنجیاں فلیٹ ہی میں چھوڑ آیا ہے۔ اور یہ بھی پوچھا تھا کہ آیا کنجیاں اُس کے پاس ٹیکسی کے ذریعہ کسی کے ہاتھ بھجوا دی جائیں یا نہیں۔ رچرڈ ہیرنگر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالکر ٹٹولا۔ یہ واقعہ تھا کہ وہ اپنی کنجیاں گھر پر بھول آیا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ جب کھانا کھانے کیلئے وہ اپنا نیلا سرج کا سوٹ پہن رہا تھا تو کنجیوں کو اُس کی جیب میں رکھنا بھول گیا تھا۔ اس کا ارادہ کلب میں برج کھیلنے کا تھا مگر آج کلب میں اس کے ساتھیوں میں سے کوئی نہ آیا تھا۔ اور اچھا کھیل ملنے کی اُمید کم تھی۔ اُسے خیال آیا کہ ایک

بہت اچھا فلم چل رہا ہے۔ جس کی اُس نے تعریف سنی ہے۔ اور جسے دیکھنے کا اُسے اشتیاق تھا۔ اُس نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ آج وہ اُسے ضرور دیکھے گا۔ چنانچہ اس نے بیرے سے کہکر اپنے فلیٹ میں ٹیلیفون کرایا کہ وہ آدھے گھنٹے میں خود ہی کنجیاں لینے وہاں آئیگا۔

فلیٹ پہنچ کر اُس نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ پریچرڈ نے دروازہ کھولا۔ وہ ہاتھ میں کنجیاں لیے ہوئے تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو پریچرڈ؟ آج رات تو تمہاری چھٹی ہے۔"

"جی ہاں۔ مگر باہر جانے کو میرا جی نہ چاہا۔ میں نے اپنے بیٹے مسٹر جیڈی کو بھیج دیا۔"

"جب کبھی موقعہ ملا کرے تو تم کو بھی باہر گھومنا پھرنا چاہیئے۔ ہر وقت ان کمروں کے اندر بند رہنا ٹھیک نہیں۔"

"میں اکثر کام کے سلسلہ سے باہر جاتی رہتی ہوں؛ بلکہ لیکن شام کو تو میں ایک مہینے سے کہیں نہیں گئی۔"

"آخر کیوں نہیں گئیں؟"

"اکیلے گھومنے پھرنا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اور میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتی جس کے ساتھ میں باہر جانا پسند کر سکوں۔"

"مگر تمہیں کبھی کبھی تھوڑی سی سیر تفریح ضرور کرنا چاہیئے۔ ورنہ تمہاری صحت بگڑ جائے گی۔"

"میری سیر کی عادت ہی چھوٹ گئی ہے۔"

"سنو! میں سنیما جا رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی؟"

کہنے کو تو رچرڈ ہیرنگر یہ الفاظ حقیقت میں انتہائی نرم دلی کے لہجہ میں کہہ گیا۔ مگر فوراً ہی اُسے افسوس ہوا کہ یہ الفاظ اُس کی زبان سے کیوں نکلے؟"

"جی ہاں! مجھے آپ کے ساتھ چلنے میں عذر نہیں۔" پریچرڈ نے جواب دیا۔

"تو پھر جلدی کرو۔ اپنی ہیٹ پہن آؤ۔"

"میں ابھی آئی۔"

یہ کہکر وہ اندر چلی گئی اور رچرڈ ہیرنگر اپنے نشست کے کمرے میں جا کر سگریٹ پینے لگا۔ یہ سوچ کر کہ

وہ کیا کر رہا ہے اُسے خود اپنے اوپر تعجب ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی اُسے ایک طرح کا اطمینان تھا۔ اپنے اوپر کسی قسم کی تکلیف اُٹھائے بغیر اگر کوئی شخص کسی کو تھوڑی دیر کیلئے خوش ہو جانے کا موقع دے تو ایک عجیب طرح کی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ پریچرڈ نے اُس کی دعوت قبول کرتے وقت اپنے مخصوص انداز میں نہ کسی تعجب کا اظہار کیا نہ ہچکچائی تھی۔ اس کا انداز بالکل فطری تھا۔ رچرڈ ہیرنگر کو قریباً پانچ منٹ تک اسکا انتظار کرنا پڑا۔ جب وہ آئی تو اُس نے اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اُس نے نیلے رنگ کی فراک پہن لی تھی۔ جو رچرڈ ہیرنگر کے خیال میں نقلی ریشم کی تھی۔ اس کی ہیٹ سیاہ رنگ کی تھی۔ جس پر نیلا بروچ لگا ہوا تھا۔ اور عمدہ لومڑی کی کھال اُس نے اپنے گلے میں لپیٹ رکھی تھی۔ رچرڈ ہیرنگر نے یہ دیکھکر اطمینان کا سانس لیا۔ کہ اس لباس میں نہ تو وہ بھدی معلوم ہوتی تھی نہ حد سے زیادہ بھڑکدار۔ اُس نے دل میں سوچا کہ پریچرڈ کو اسکے ساتھ دیکھکر کوئی بھی یہ نہ کہہ سکے گا کہ "ہوم آفس" کا ایک ممتاز افسر اپنی خادمہ کو سینما دکھانے لے جا رہا ہے۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنا زیادہ انتظار کرنا پڑا۔"

"کوئی حرج نہیں۔" رچرڈ ہیرنگر نے خندہ پیشانی سے جواب دیا اور اس کیلئے سامنے کا دروازہ کھولا۔ وہ اس کے آگے آگے باہر نکل آئی۔ رچرڈ ہیرنگر کو یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ پریچرڈ اُس سے پہلے اور اُسکے آگے چلنے سے نہ ہچکچائی تھی۔ جس سینما ہال میں وہ جا رہے تھے، وہ مسٹر ہیرنگر کے فلیٹ سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہ دونوں وہاں تک پیدل گئے۔ رچرڈ ہیرنگر موسم، سڑکوں کی حالت، اور اڈولف ہٹلر کے بارے میں باتیں کرتا گیا اور پریچرڈ مناسب جواب دیتی گئی۔ سینما ہال میں وہ اُس وقت پہنچے جب "ملکی ماؤس" دکھایا جا رہا تھا۔ اس کو دیکھکر وہ دونوں اچھے موڈ میں ہو گئے۔ چار برس سے پریچرڈ ہیرنگر کے یہاں نوکر تھی۔ مگر اُس نے اُسے مسکراتے ہوئے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اب وہ اسکے خوشی کے قہقہے سن سنکر بہت محظوظ ہوا۔ اُس کو خوش دیکھکر خود ہیرنگر کو خوشی حاصل ہوئی۔ آخر کار اصل تصویر شروع ہوئی۔ یہ واقعی بہت اچھی تصویر تھی۔ اور ان دونوں نے نہایت دلچسپی اور انہماک کے ساتھ اُسے دیکھا۔ اس تصویر کے دوران میں رچرڈ ہیرنگر نے سگرٹ پینے کیلئے اپنا سگرٹ کیس نکالا۔ اور محویت کے عالم میں پریچرڈ کے سامنے پیش کر دیا۔

"شکریہ، مسٹر"۔ کہکر اُس نے ایک سگرٹ لے لی۔

رچرڈ ہیرنگر نے دیا سلائی جلائی اور پریچرڈ کی سگریٹ جلا دی۔ پریچرڈ کی آنکھیں تو پردہ سیمیں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اُس نے رچرڈ کے اس فعل پر زیادہ توجہ نہ دی۔ فلم کے ختم ہو جانے پر وہ بھی دیگر تماشائیوں کے ساتھ باہر نکلے اور "فلیٹ" کی طرف پیدل ہی واپس آئے۔ یہ رات نہایت پُرسکون تاروں بھری رات تھی۔

"پریچرڈ! تمہیں یہ تصویر پسند آئی؟" رچرڈ ہیرنگر نے اُس سے راستہ میں پوچھا۔

"بہت زیادہ۔ واقعی یہ بہت عمدہ تصویر ہے۔"

رچرڈ ہیرنگر کو دفعتاً کچھ خیال آیا۔

"ہاں پریچرڈ! سنو تو۔ تم نے آج رات کچھ کھایا بھی ہے؟

"نہیں جناب! مجھے اتنا وقت نہ مل سکا۔"

"تب تو تمہیں اس وقت شدت کی بھوک لگ رہی ہوگی۔"

"گھر پہنچ کر میں تھوڑی سی پاؤ روٹی اور پنیر کھا لونگی۔ اور ایک پیالی قہوہ بنا لوں گی۔"

"یہ تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

فضا میں ہر طرف سرور و شادمانی کی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ اور جو لوگ اُن کے ساتھ سڑک پر چل رہے تھے یا سامنے سے آ رہے تھے وہ سب اس کیفیت سے مست نظر آ رہے تھے۔ رچرڈ ہیرنگر نے دل میں سوچا "جہاں سیر وہاں سوا سیر!"

"پریچرڈ! تم میرے ساتھ کہیں چل کر تھوڑا سا کھانا کھاؤ گی؟"

"اگر آپ پسند کریں۔"

"آؤ۔"

اُس نے ایک ٹیکسی والے کو پکارا۔ وہ اُس وقت کل بنی نوع انسان کیلئے ہمدردی کا جذبہ محسوس کر رہا تھا اور یہ ایسا احساس تھا جسے وہ پسند کرتا تھا۔ اُس نے ٹیکسی والے سے اُس ریسٹوران میں چلنے کو کہا جو "آکسفورڈ سٹریٹ" میں تھا۔ اور یہاں کافی چہل پہل رہتی تھی۔ مگر اُسے یقین تھا کہ وہاں اس کا کوئی واقف کار نہ ہوگا۔ یہاں ایک آرکیسٹرا بھی تھا اور رقص بھی ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پریچرڈ وہاں جا کر خوش ہوگی۔

*

جب وہ ایک میز کے پاس بیٹھ چکے تو ایک ویٹر (بیرا) اُن کے پاس آیا۔

"اِس ہوٹل میں ایک مقررہ کھانا ہوتا ہے"۔ رچرڈ ہیرنگر نے اس خیال سے کہا کہ پریچرڈ اُسے پسند کرےگی۔ "میری رائے تو یہی ہے کہ وہی کھایا جائے۔ تم کیا پیوگی ؟ سفید شراب ؟"

"مجھے جنجر بیئر بہت پسند ہے۔" پریچرڈ نے کہا۔

رچرڈ ہیرنگر نے اپنے لئے وہسکی اور سوڈے کا آرڈر دیا۔ پریچرڈ نے خوب اچھی طرح کھانا کھایا۔ ہیرنگر کو بھوک نہ تھی۔ مگر پریچرڈ کا ساتھ دینے کے لئے اُس نے بھی کھایا۔ جو تصویر وہ دونوں دیکھ کر آئے تھے اُس پر گفتگو ہوتی رہی۔ رچرڈ ہیرنگر نے محسوس کیا کہ اُس دن رات کو پریچرڈ کے بارے میں جو کچھ اُس کے دوست کہہ رہے تھے وہ غلط نہ تھا۔ پریچرڈ بدصورت عورت نہ تھی۔ اور اگر کوئی اُسے رچرڈ کے ساتھ دیکھ بھی لیتا تو اُس کا مضحکہ نہ اُڑاتا۔ وہ سوچنے لگا کہ جب وہ اپنے دوستوں کو یہ بتائیگا کہ کس طرح وہ اُن کی لاثانی پریچرڈ کو سنیما دکھانے اور اس کے بعد کھانا کھلانے ریسٹران لے گیا تھا تو کیا کیا چہ میگوئیاں ہونگی۔ ہال میں لوگ بینڈ کی گت پر رقص کر رہے تھے۔ اور اُن کو دیکھکر پریچرڈ کے لبوں پر ہلکا ہلکا سا تبسم نمودار ہو رہا تھا۔

"کیا تمہیں رقص پسند ہے ؟"

"جب میں چھوٹی سی تھی تو اچھا خاصا رقص کر لیتی تھی۔ مگر شادی کے بعد میں نے رقص کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میرے شوہر کا قد مجھ سے کچھ کم تھا۔ اور میرا خیال ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ جب تک شریک رقص عورت سے مرد قد میں زیادہ نہ ہو رقص اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہونگے۔ اور اب تو میرا خیال ہے کہ میری عمر رقص کرنے کی نہیں رہی۔"

رچرڈ ہیرنگر کا قد لانبا تھا۔ وہ دونوں ناچتے ہوئے اچھے معلوم ہونگے۔ رچرڈ کو ناچنے کا بہت شوق تھا۔ اور وہ بہت اچھا رقاص تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پریچرڈ کو اپنے ساتھ رقص کرنے کی دعوت دیکر اس کو پریشانی میں ڈالے۔ حد سے زیادہ تجاوز کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ لیکن آخر اس میں حرج ہی کیا ہے ؟ پریچرڈ کتنی پھیکی زندگی تھی۔ آخر اُس سے کہنے میں حرج ہی کیا ہے۔ اور پھر وہ اتنی سمجھدار تھی مگر اُس نے مناسب خیال نہ کیا تو ضرور کوئی عذر پیش کر دیگی۔ جب بینڈ پھر سے شروع ہوا تو اُس نے کہہ ہی دیا۔

"پریچرڈ! رقص کروگی؟"

"مجھے عرصہ سے مشق نہیں رہی۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"اگر آپ کی مرضی کے خلاف نہ ہو تو میں حاضر ہوں۔" اُس نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اُسے رقص کرنے سے انکار نہ تھا۔ صرف یہ ڈر تھا کہ وہ رچرڈ ہیر نگر کے قدم کا ساتھ نہ دے سکے گی۔ لیکن اب تو وہ کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں رقص کرنے لگے۔

"ارے پریچرڈ! تم تو بہت اچھا رقص کر لیتی ہو!"

"میں تو بھول چکی تھی۔ مگر مجھے پھر سے رقص کرنا آرہا ہے۔"

اگرچہ وہ بہت بلند بالا عورت تھی مگر اُس کے قدم ہلکے پڑتے تھے اور اس کی حرکات موسیقی کے زیر و بم سے ہم آہنگ تھیں۔ ہیر نگر نے دیواروں پر لگے ہوئے شیشوں پر نظر ڈالی اور سوچا کہ وہ دونوں ناچتے ہوئے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ شیشے ہی میں ان دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے دوچار ہوئیں۔ رچرڈ نے سوچا "کیا وہ بھی وہی سوچ رہی ہے جو وہ سوچ رہا تھا؟" دو تین رقص کر چکنے کے بعد رچرڈ نے واپس چلنے کو کہا۔ ہوٹل کا بل ادا کر کے وہ پریچرڈ کے ساتھ باہر نکلا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ دونوں دس منٹ میں گھر پہنچ گئے۔

"میں عقبی دروازے سے اُوپر چلی جاؤنگی۔" پریچرڈ نے کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم میرے ساتھ لفٹ میں چلی آؤ۔"

وہ اپنے ساتھ اُسے لفٹ میں لے گیا۔ اور لفٹ چلانے والے کو ایک برقیلی نگاہ سے دیکھا تاکہ وہ یہ خیال کر کے متعجب نہ ہو کہ وہ اتنی رات گئے اپنی خادمہ کے ساتھ کہاں گیا ہوا تھا۔

رچرڈ نے اپنی کنجی سے دروازہ کھول کر اُسے اپنے فلیٹ میں داخل کر دیا۔

"اچھا گڈ نائٹ سر۔" پریچرڈ نے کہا۔ "آپ کی عنایت کا بہت بہت شکریہ! میری یہ شام بہت اچھی گزری۔"

"شکریہ پریچرڈ! اگر میں اکیلا سنیما جاتا تو میری شام بھی بے لطف گزرتی۔ مجھے اُمید ہے کہ

آج باہر نکل کر تم خوش ہوئیں۔"

"جی ہاں! اتنی زیادہ کہ میں اپنی خوشی کا اظہار نہیں کر سکتی۔"

رچرڈ ہیرنگر بہت مسرور ہوا اور اپنے آپ سے مطمئن تھا۔ اُس نے واقعی بڑی ہی رحمدلی کا کام کیا تھا۔ کسی کے دل کو خوش کرنا بڑا ثواب کا کام ہے۔ اس کے دل میں کل بنی نوع انسان سے ہمدردی اور محبت کے جذبات اُمنڈ آئے۔

"گڈ نائٹ پریچرڈ!" اُس نے کہا۔ اور چونکہ وہ بہت خوش تھا اس لئے اُس نے اپنا ہاتھ پریچرڈ کی کمر میں حمائل کر کے اُس کے لبوں کو بوسہ لے دیا۔ اُس کے ہونٹ بہت شیریں اور نرم تھے۔ رچرڈ کے ہونٹ کچھ دیر تک اُن نرم لبوں سے پیوست رہے۔ پریچرڈ نے بھی بوسے کا جواب بوسے سے دیا۔ یہ ایک تندرست اور جوان عورت کا پرجوش اور نرم و گرم بوسہ تھا۔ اور رچرڈ اس کی لذت میں محو ہو گیا۔ اور اُس نے پریچرڈ کو اور زور سے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ پریچرڈ نے اپنی باہیں اسکے گلے میں ڈال دیں۔

---

عام طور پر صبح کو وہ اس وقت تک سوتا رہتا تھا۔ جب تک پریچرڈ اس کی ڈاک لیکر نہ آجاتی۔ مگر آج وہ ساڑھے سات بجے صبح ہی جاگ اُٹھا تھا۔ اُسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جسے وہ اچھی طرح سمجھ نہ سکا تھا اس کی عادت تھی کہ اپنے سر کے نیچے دو تکیے رکھکر سوئے۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اس کے سر کے نیچے ایک ہی تکیہ ہے۔ تب اُسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اور گھبرا کر اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ دوسرا تکیہ اُس تکیے کے برابر رکھا ہوا تھا۔ جو اُس کے سر کے نیچے تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ اس پر کسی کا سر نہ تھا۔ گو یہ بالکل ظاہر تھا کہ کسی کا سر اُس تکیے پر ضرور رہا ہے۔ اُس کا دل ڈوبنے سا لگا۔

"اوخدا میں نے یہ کیا حماقت کی۔" اُس نے اتنی زور سے کہا کہ اگر کوئی پاس ہوتا تو سن لیتا۔ "میں یہ کیا کر بیٹھا؟ مجھے یہ کیا ہو گیا تھا؟"

وہ تو اس قسم کا آدمی تھا ہی نہیں جو نوکرانیوں کے ساتھ اس قسم کی حرکت کرتے ہیں۔ پھر یہ کیا ہو گیا؟ اُس کی عمر اور پوزیشن کو دیکھتے ہوئے یہ کیسی شرم کی بات ہے۔ اُسے خبر نہ تھی کہ پریچرڈ کب اُس کے پاس سے اُٹھکر

گئی۔ وہ اُس وقت سو رہا ہوگا ـــــ یہ بھی تو نہ تھا کہ وہ پریچرڈ کو بہت زیادہ پسند کرتا ہو۔ وہ اس قسم کی عورت نہ تھی جو اس کے جنسی جذبات کو برانگیختہ کرتی ہو۔ وہ خود اپنے دوستوں سے کہہ چکا تھا کہ پریچرڈ سے اُسے کچھ وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ یہ اُس نے کیا پاگل پن کیا؟ اور اب کیا ہوگا؟ یہ تو ظاہر تھا کہ اب وہ اُسے اپنی ملازمت میں نہ رکھ سکے گا۔ اور پھر یہ بھی انصاف سے بعید معلوم ہوتا تھا کہ اس بیچاری کو ایسے قصور کی بنا پر نکال دیا جائے جس میں وہ خود بھی اتنا ہی شریک تھا جتنی وہ۔ یہ کتنی زبردست حماقت تھی کہ محض تھوڑی دیر کے لطف کے واسطے اپنی بہترین خادمہ کو اس طرح کھو دیا جائے۔

"یہ سب اُس کم بخت دل کا قصور ہے جو دوسروں کی خوشی میں اضافہ کرنے کے لئے تڑپا کرتا ہے۔"

اُس نے انتہائی درد و کرب کے لہجہ میں ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

اور اب اُسے کوئی دوسری خادمہ یا ملازم ایسا نہ ملیگا جو اس کے کپڑوں کو اتنی اچھی طرح رکھ سکے یا اسکے چاندی کے برتنوں کو اتنی احتیاط سے صاف کر سکے۔ پریچرڈ اس کے تمام دوستوں کے ٹیلیفون نمبر یاد رکھتی تھی۔ ہر قسم کی شراب کے بارے میں کافی واقفیت رکھتی تھی۔ مگر اب تو اُسے جانا ہی ہوگا۔ اُسے خود معلوم ہونا چاہیئے کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد پہلے کی طرح وہ اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ اب تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اُسے ایک معقول رقم بطور تحفہ کے دیدی جائے۔ اور اُس کے ساتھ ہی ایک اچھا سرٹیفکیٹ دیکر اُسے رخصت کر دیا جائے۔ اور اب تو وہ کمرے میں آتی ہی ہوگی۔ نہ معلوم اس کا طرزِ عمل کیسا ہو؟ نہ جانے وہ اپنے تعلقات اُس کے ساتھ بڑھانے کے لئے چھیڑ چھاڑ کرتی آئیگی یا ناز و انداز دکھائے گی۔ شاید آج وہ اسکی ڈاک لانے کی بھی زحمت گوارا نہ کرے۔ ہو سکتا ہے کہ اگر وہ گھنٹی بجائے تو اسکے جواب میں مسز جیبڈی آ دھمکا کر کہے۔ "پریچرڈ ابھی تک نہیں اُٹھی۔ وہ رات کو دیر تک تفریح کرنے کے بعد سوئی ہے۔" یہ کتنا بُرا ہوگا۔

"میں بھی کتنا کمینہ اور قابلِ نفرت انسان ہوں۔" اُس نے اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے کہا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ بہت زیادہ گھبرا گیا۔

"آجاؤ!" اُس نے بمشکل مری ہوئی آواز میں کہا۔ اس وقت سے بڑھکر دنیا میں شاید ہی کوئی اور مصیبت زدہ انسان ہوگا۔

پریچرڈ حسب معمول وقت پر اندر آئی۔ وہ اپنا وہی چھینٹ کا لباس پہنے ہوئے تھی جو وہ روزانہ صبح کو پہنا کرتی تھی۔

"گڈ مورننگ سر" اس نے کہا۔

"گڈ مورننگ"

پریچرڈ نے کھڑکیوں کے پردے سرکائے۔ اور رچرڈ کو اس کے خطوط دیئے۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے جذبات کے اثرات موجود نہ تھے۔ وہ بالکل ویسی ہی نظر آرہی تھی جیسی روز نظر آیا کرتی تھی۔ اسکی چال ڈھال اور حرکات ویسی ہی محتاط اور سنجیدہ تھیں جیسی ہر روز رہا کرتی تھیں۔ نہ اس نے رچرڈ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی کوشش کی نہ اس کی نگاہوں سے بچنے کی۔

"کیا آپ وہ فاختئی سوٹ پہنیں گے جو کل ہی درزی کے یہاں سے آیا ہے ؟"

"ہاں !"

رچرڈ نے اپنے خطوط پڑھنے کا بہانہ کیا۔ مگر وہ کنکھیوں سے اُسے دیکھتا جاتا تھا۔ پریچرڈ کی پشت اس کی طرف تھی۔ اس نے اس کی ویسٹ کوٹ اور پتلون اٹھا کر کرسی پر رکھے۔ پھر اس کی قمیص سے وہ بٹن نکالے جو وہ گذشتہ شب کو لگائے ہوئے تھا۔ اور اُن کے بجائے نئے "اسٹڈ" لگا دیئے۔ پھر اس نے صاف ستھرے موزوں کی ایک جوڑی نکالی اور اُن ہی کے ہم رنگ "سسپنڈر" (Suspenders) نکالے۔ اسکے بعد اس نے اس کا فاختئی سوٹ نکالا اور برلیسز (Braces) کو اس کے پتلون کے پیچھے کے بٹنوں میں لگا کر رکھ دیا۔ پھر اس نے اس کا "وارڈ روب" کھول کر ایک عمدہ سی ٹائی نکالی جو اس سوٹ کے ساتھ موزوں معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بعد اس نے رچرڈ کا پہنا ہوا سوٹ اٹھا کر اپنے بازو پر ڈال لیا۔ اور اسکے جوتے بھی اٹھا لئے۔

"آپ پہلے ناشتہ کریں گے یا غسل ؟"

"میں پہلے ناشتہ کروں گا۔"

"بہت اچھا۔"

اس کے بعد وہ اپنے خاموش اور سنجیدہ انداز میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر

چلی گئی۔ اُس کے چہرے سے کسی قسم کے جذبات مترشح نہ ہوتے تھے۔ اس کا لہجہ وہی تھا جو ایک خادمہ کا آقا کے سامنے ہونا چاہیئے۔ جو کچھ ہو گزرا تھا اُس کی حقیقت گویا کسی خواب یا افسانے سے زیادہ نہ تھی۔ پرتھچرڈ کے رویے سے بالکل ظاہر نہ ہوتا تھا کہ اُسے گذشتہ رات کی کوئی بات بھی یاد رہی تھی یا نہیں۔

رچرڈ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب سب کچھ ٹھیک رہے گا۔ پرتھچرڈ کے جانے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ وہ مثالی قسم کی خادمہ تھی۔ اُسے یقین تھا کہ پرتھچرڈ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی گفتگو یا حرکات سے کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیگی کہ ایک رات دن ان دونوں کے تعلقات مالک اور خادمہ کے تعلقات سے مختلف رہے تھے۔

رچرڈ ہیرنگر کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

(ترجمہ از ڈبلیو سومرسٹ ماؤم)

مظہر عزیز

# ہمایوں کا سالگرہ نمبر

"ہمایوں" لاہور کا مشہور و معروف ماہنامہ ہے جسے مسٹر بشیر احمد بیرسٹر پچیس چھبیس برس سے نہایت کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ مجھے عرصہ دراز کے بعد ہمایوں کے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہمایوں کے نئے ارادوں کی تفصیل جس پرچے میں چھپی ہوگی وہ پرچہ میرے پاس نہیں ہے لیکن ہمایوں کے جوائنٹ ایڈیٹر جناب مظہر انصاری صاحب دہلوی کے گرامی نامے سے میں یہ سمجھا ہوں کہ "نئے ارادوں کا مرکزی تصور یہ ہے کہ پاکستان کی قومی و ملکی زبان بننے کے بعد اُردو میں وطن اور ملت کی محبت کے جذبات کو ابھارا جائے اور ایسا ادب پیش کیا جائے جو اخلاق پر مبنی ہو" اس ارادے کی خوبی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ زبان کا یہی صحیح استعمال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمایوں کی تحریک اردو رسالوں ہی کا نہیں اردو اخباروں کا معیار بھی بلند کردے۔ اور اردو کے دامن سے مخرب ہنگامہ خیزی اور تعفن کو دھو کر اردو میں یہ پاکیزہ روح پھونک دے۔ ہمایوں کا سالگرہ نمبر ۱۹۴۹ء اس تحریک کا عملاً ترجمان ہے۔ ہمایوں کا سالگرہ نمبر ۲۰×۳۰/۸ سائز کے ۱۲۸ صفحات پر شائع ہوا ہے۔

سالانہ چندہ ؎ سالگرہ نمبر کی قیمت ؎

پتہ:- دفتر رسالہ "ہمایوں" ۳۲- لارنس روڈ۔ لاہور

ع۔ ح

(۱)

اُن کے پرتو سے ہیں تابندہ مرے دل کے چراغ
اسی احساس سے دل شاد کروں یا نہ کروں
وہ بھی آئے تھے کبھی آہ! شبستاں میں مرے
آج اس وقت کو پھر یاد کروں یا نہ کروں

(۲)

میری نظروں میں کوئی جیسے لگاتا ہو گرہ
اسطرح مجھ پہ گراں عشرتِ نظّارہ ہے
ہم نفس! دیکھ بہت دور افق کے اس پار
ایک معصوم تصوّر ابھی آوارہ ہے

(۳)

سسکیاں کس نے طربناک فضامیں بھر دیں
کتنی آوارہ بہاروں کا فسوں جاگ اٹھا
میری کھوئی ہوئی منزل نے پکارا تو نہیں
کیسی آواز ہے خوابیدہ جنوں جاگ اٹھا

(۴)

فنیٔ سرد کے لئے نورِ چراغ
یوں بھی روشن ہوئے اکثر اے دوست!
جیسے مہتاب "افق کے اُس پار"
ڈوب بھی جائے اُبھر کر اے دوست!

(۵)

قہقہے جن سے فضاؤں میں کھنک ہوتی تھی
ہائے اک شورشِ پیہم کے سوا کچھ بھی نہیں
چشمِ مخمور کہ تھی فتنۂ رنگیں کی امیں
آج اک دیدۂ پُرنم کے سوا کچھ بھی نہیں

(۶)

اب بھی ہیں یہ مری بے لوث محبت کے امیں
یہ ستارے کہ نظر آتے ہیں انگاروں سے
بھیگ جاتی ہے مری چشمِ تمنا اے دوست!
آج بھی بربطِ احساس کی جھنکاروں سے

(۷)

زندگی یاس کی تصویر ہوئی جاتی ہے
ہر دُعا دشمنِ تاثیر ہوئی جاتی ہے
تھا غلط جذبۂ تعمیرِ تمنا شوکتؔ
آج تخریب ہی تقدیر ہوئی جاتی ہے

شوکتؔ جونپوری

# قابل حفاظت خطوط

## شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کا خط ادیب الملک خواجہ محمد شفیع صاحب کے نام

پیارے بھائی خواجہ محمد شفیع صاحب۔ سلام علیکم۔ ابھی آپ کا خط آیا۔ باوجود بینائی کی کمزوری کے بار بار پڑھا۔ اور ایسا محسوس ہوا کہ آپ کسی جلسہ میں تقریر کر رہے ہیں۔ وہی تلازمے۔ وہی بذلہ سنجیاں۔ میں اُس کیفیت کو لکھوں جو آپ کا خط پڑھنے سے میری ہوئی، تو میں یوں کہونگا کہ میری قبر میں منکر نکیر بن کر وہ خط آیا اور جو کچھ اُس نے پوچھا میں نے سب کچھ بتا دیا۔ اور فرشتے یہ کہہ کر چلے گئے کہ جواب ٹھیک نہیں۔ والد صاحب کے ہڈی ٹوٹنے کی خبر سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ اُن کا دم غنیمت ہے۔ دہلی میں اُن کے سوا کوئی پُرانی نشانی باقی نہیں رہی تھی۔ آپ نے دہلی کے مکانوں کا حال نہیں لکھا کہ اُن پر کیا گزری۔ میری تو ہر چیز کسٹوڈین کی ضبطی میں ہے۔ خدا نے آپ کو بیٹا دیا اور مجھے چوتھا پوتا دیا۔ آج آپ کے خط کے ساتھ کراچی سے علی کا خط آیا۔ وہ اپنی بیوی بچوں اور دونوں بہنوں اور ماموں اور اُن کے بیوی بچوں کے ساتھ پندرہ دن ہوئے، یہاں سے بمبئی گئے تھے۔ بڑی مشکل سے پندرہ دن بعد جہاز ملا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۸ء اتوار کی شام کو کراچی پہنچے۔ لکھا ہے بندرگاہ پر دلی اور بستی کے سب چھوٹے بڑے امیر غریب مسلمان یہ سمجھ کر آئے تھے کہ میں بھی کراچی آرہا ہوں۔ جب مجھے نہ دیکھا تو علی سے گلے مل مل کر روئے اور رو رو کر کہا اب خواجہ صاحب سے ملنے کی اُمید باقی نہیں رہی۔ میں نے یہ خط پڑھا تو مجھے بھی رونا آگیا۔ آپ نے مجھے لاہور آنے کا مشورہ دیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ نے میرے کراچی آنے کی خبر سنی تھی مگر وہ خبر مجھے شکار میں ڈالنے کے لئے دشمنوں نے اڑائی تھی۔ اب تو آپ مجھ سے میدان حشر میں ملیں گے اور میں اللہ میاں سے درخواست کروں گا کہ حساب کتاب لینے سے پہلے اردو مجلس کا ایک جلسہ کرنے کی اجازت دیجئے۔ اور پھر ایک مضمون میں سناؤں گا اور ایک مضمون آپ سے سنوں گا۔ اس کے بعد مُلا واحدی صاحب سے کہونگا کہ آپ بھی کچھ سنا دیجئے۔ وہ کہیں گے آپ بھی عجب آدمی ہیں۔ یہ موقعہ جلسہ کرنے کا ہے۔ جلد ہی حساب کتاب طے ہو۔ جنت والے جنت میں جائیں۔ دوزخ والے دوزخ میں جائیں۔ میں کہونگا آپ کو جنت میں جانے کی ایسا کیا جلدی ہے۔ اردو مجلس بھی تو جنت ہی کا ایک جلسہ ہے۔ جنت میں جاؤ گے۔ حوروں کو اور غلمان کو دیکھو گے تو اردو مجلس بھول جاؤ گے۔ واحدی صاحب کہیں گے جنت کی زبان عربی ہوگی۔ وہاں اردو مجلس کا کیا کام۔ میں کہونگا ایسی جنت کو سلام، جہاں اُردو نہ ہو۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ جلسہ حساب کتاب ہونے سے پہلے اُردو مجلس کا جلسہ کرلیں۔ کیونکہ پھر نہ دوزخ میں جلسہ ہو سکیگا نہ جنت میں۔

خواجہ بانو نے آپکے نئے بچے کی خبر سنی تو مجھ سے کہا۔ میری طرف سے شفیع دلہن کو مبارکباد لکھ دینا۔ کنور صاحب کا ٹھیک ٹھیک پتہ لکھئے تاکہ میں اُن کو اس پتہ پر خط بھیجوں۔ والد صاحب کی خدمت میں تسلیمات اور مزاج پرسی۔

مخلص۔ حسن نظامی　　از حیدرآباد۔ دکن　　۱۷ دسمبر ۱۹۴۸ء

# ایڈیٹر کی ڈاک

مکرم گستر، السلام علیکم۔ کہہ نہیں سکتا ہوں کہ کتنی تکلیف، فردوس جنوری نمبر ۴۹ء کے نصف آخر کو پڑھ کر ہوئی۔ آپ کی کسی تحریر سے اتنا دل دکھنے کا خیال بھی میں نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی پرچہ میں نے پورا نہیں پڑھا۔ اطمینان سے مختلف فرصتوں میں پڑھتا۔ اتفاق سے نظر اس صفحہ پر پڑ گئی اور پڑھتے ہی دل بے اختیار ہو گیا۔

اللہ معاف کرے اور حضرت اکبر کی روح بھی معاف کرے، آپ نے اس تحریر سے حضرت اکبر پر جو ظلم کیا، وہ تو خیر ہے ہی، خود اپنے ذوق سلیم پر آپ نے شدید ظلم کر ڈالا۔ جی پھڑ پھڑا رہا ہے کہ کسی طرح اڑ کر آپ تک پہنچوں اور اپنے سامنے آپ سے کتاب کے ہر صفحے سے دو دو چار چار شعر پڑھوا کر سو فیصدی داد لوں۔ یقیناً آپ نے پوری کتاب کیا معنی نصف بھی نہیں پڑھی۔ اس کے سوا کوئی توجیہہ میرے ذہن میں آپ کی اس رائے کے متعلق آتی ہی نہیں۔ کتاب بھر میں سے دو چار۔ دس بیس۔ پچاس سو شعر ادنیٰ قسم کے انتخاب کر لینا کوئی مشکل کام نہیں۔ اقبال اور غالب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ رائے تو ہمیشہ کلام کے بڑے حصہ کی بنا پر قایم کی جائے گی۔ وقت نکلنے پر صدق کے دو نمبروں میں انشاءاللہ دل کھول کر ریویو کروں گا۔ کتاب میں اغلاط طباعت یقیناً کثرت سے ہیں۔ ناشرین کی بے توجہی ہر جگہ نمایاں ہے۔ لیکن ظاہر ہے ان میں سے کوئی سا بھی الزام شاعر غریب کے سر نہیں جاتا۔ کتاب کے متعدد اشعار مجھے یاد پڑتا ہے خود آپ کے خطیب میں نکل چکے ہیں۔ معارف وغیرہ میں اس کے علاوہ۔

دعاگو و دعاخواہ۔ عبدالماجد ازدریاباد ۷، جنوری سنہ ۱۹۴۹ء

فردوس، جنوری سنہ ۴۹ء کے نصف آخر سے مراد غالباً صرف کلیات اکبر حصہ چہارم کا ریویو ہے۔

ریویو بے شک پوری کلیات پڑھ کر نہیں لکھا گیا تھا۔ عام طور پر اخباروں، رسالوں میں جیسے چلتے ہوئے ریویو ہوتے ہیں۔ یہ ریویو بھی ویسا ہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ تعریف نہیں تعریض ہے۔ لیکن تعریض حضرت اکبر پر نہیں، پبلشر پر تھی۔ اتفاق سے نظر چند ایسے شعروں پر پڑی جنہیں حضرت اکبر کے ساتھ منسوب دیکھنا پسند نہ آیا۔ حضرت اکبر کی روح کو تکلیف دینے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ خیر آپ کے توجہ دلانے سے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آیندہ کسی کتاب پر اظہار رائے نہیں کروں گا۔ جب تک اسے تمام و کمال پڑھ نہ لوں گا۔ پبلشر کے ساتھ بھی بے انصافی کیوں ہو۔ کاش پرنسپل مرزا محمد سعید صاحب میری مدد کریں۔ اور اس کام کو اپنے ذمے لے لیں۔ انہیں راولپنڈی میں عریضہ لکھ دیا ہے اور درخواست کی ہے۔ مرزا صاحب مانے ہوئے نقاد ہیں۔ مگر ان کا قابو میں آنا اس سے زیادہ مشکل ہے جتنا میرا کتاب کو پڑھنے کے لئے وقت نکالنا۔
محمد دین واحدی

(۲)

مکرمی - ہدیہ سلام و رحمت ! ابھی ابھی تازہ شمارہ ملا۔ "فردوس" کا ہر آنے والا نقش گزشتہ سے خوب تر ہوتا ہے۔ میری جانب سے ہدیۂ تبریک قبول فرمایئے۔

فروری نمبر میں میرے کرمفرما بزرگ مولانا عبد الماجد دریابادی مدظلہٗ نے میرے ایک افسانے پر دو چار جملے تحریر فرمائے ہیں۔ مولانائے ممدوح کی رائے کا پورا احترام کرتے ہوئے گزارش ہے کہ میرے افسانہ میں عورت کی جس "لغزش" کا ذکر ہے اس کے لئے "عریضِ فاسقانہ ماحول" کی ضرورت نہ تھی برہنہ تصویروں کے اثر سے ہلکی سی موج ہوس نمودار ہوئی۔ قرب نامحرم نے ذرا اور اس کو ابھار دیا اور پھر قرآن کی آیت کو پڑھ کر وہ اتر جاتا رہا۔

میں نے افسانہ کی ہیروئن کی جس خیالی اور نیم عملی لغزش کو دکھایا ہے وہ نفسیاتی اعتبار سے حیرت انگیز یا خلاف واقعہ نہیں ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا رہتا ہے کہ بعض وقت کوئی بڑی تحریک اچھے خاصے شریف آدمی کو بُرا سوچنے پر اُبھار دیتی ہے۔ اسی نفسی کشمکش سے بچنے کے لئے ضرورت ہے کہ پورا ماحول شریفانہ، با اخلاق اور صالح ہو ——— میں نے اسی اہمیت پر زور دیا ہے۔ مخلص۔ ماہر القادری مدیر "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۳ یکم فروری ۱۹۴۹ء

اس افسانے پر بعض اور حضرات کو بھی اعتراض تھا۔ اچھا کیا، آپ نے وضاحت کردی۔

محمد واحدی

(۳)

مکرمی و محترمی۔ السلام علیکم "گلدستۂ فردوس" کے عنوان سے چند اشعار ارسالِ خدمت کرتا ہوں۔ جو مختلف اوقات میں کہے گئے اور جن میں "فردوس" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ امید ہے کہ "فردوس" کے لئے یہ مناسب سمجھے جائیں گے۔ اگر اسی طرح قدیم و جدید شعرا کے کلام سے فردوس کے مضمون کے اشعار جمع کر کے وقتاً فوقتاً "فردوس" میں شائع کئے جاتے رہیں تو ایک اچھا سلسلہ قائم ہو جائے۔

نیاز مند اسعد ملتانی ۱۳ر جنوری ۴۹ء

مناسب خیال ہے - خدا کرے کوئی صاحب اس طرف توجہ فرمائیں۔ خود میرے لئے تو شاید یہ کام ممکن نہیں ہے۔ محمد واحدی

# سرِ راہے

پیر الٰہی بخش، جیسے بڑے شخص، چھ سال کے واسطے سندھ کی وزارت عظمیٰ ہی سے نہیں، سندھ اسمبلی کی ووٹری تک سے محروم ہوگئے۔ اس کے معنی ہیں کہ آزادی ملنے کا کچھ اثر ہے لو اب ہم پر پیر الٰہی بخش، مسٹر کھورو اور خان ممدوٹ سے بہتر حضرات حکومت کیا کریں گے۔ اگر واقعی پاکستان اور ہندوستان میں انتخابات صحیح ہونے لگیں تو منتخب ممبر، منتخب حاکم اور منتخب بادشاہ خلقت کے حق میں ایک نعمت بن جائیں۔ مسلمانوں نے قریب قریب یہی طریقہ خلفائے راشدین کے تقرر میں اختیار کیا تھا۔ اس سے بہتر بات کیا ہے کہ ہمارے بادشاہ اور ہمارے حاکم ہمارے تجویز کئے ہوئے اور ہمارے مقرر کئے ہوئے ہوں جہاں تک بدمزگی کا تعلق ہے، بدمزگی تو انتخاب کی صورت میں لازمی ہے۔ سنی، شیعہ اور خارجی، مسلمانوں کے تین فرقے اسی انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ آج انتخاب برطانیہ کو سب سے زیادہ سازگار ہے۔ لیکن برطانیہ میں بھی پارٹیوں کے دل ایک دوسرے سے صاف نہیں۔ تاہم بدمزگی کے سوا عوام کی انتخاب کردہ حکومت میں کوئی اور خرابی اگر ہے تو بس یہی ہے کہ انتخاب میں بے ضوابطیاں برتی جاتی ہیں۔ اور ہر قسم کی بے ایمانیاں کی جاتی ہیں۔ کم از کم متحدہ ہندوستان یا غلام ہندوستان میں یہ بے ضوابطیاں عام تھیں۔ خدا کرے منقسم ہندوستان یعنی آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان سے یہ دور ہو جائیں اور انتخابات سے ہندوستان اور پاکستان وہ فائدے اٹھا سکیں جو برطانیہ اٹھاتا ہے۔

اب تک ہندوستان اور پاکستان کے صوبوں پر وہی لوگ قابض تھے، جن کا انتخاب دورِ غلامی میں ہوا تھا۔ مرکزی حکومتیں البتہ کسی قدر نئی ہیں۔ اور شاید پاکستان کی مرکزی حکومت کے نئے ہونے ہی کی برکت ہے کہ اس نے مسٹر کھورو، خان ممدوٹ اور پیر الٰہی بخش کی حکومتیں ختم کردیں۔ تاہم دورِ آزادی کے عام انتخابات کا انتظار ضروری ہے اور دیکھنا ہے کہ عام انتخابات میں اب بھی ایمانداری سے کام لیا جاتا ہے یا نہیں۔

ایک انتخاب مغربی پنجاب میں عنقریب ہونیوالا ہے۔ یہ آزادی کے دور کا پہلا انتخاب ہوگا۔ دورِ غلامی کے انتخاب کہلاتے تو عوام کے، اور بیشک عوام ان میں حصہ لیتے تھے۔ مگر کارفرمائی حقیقتاً خواص کی رہتی تھی۔ بلکہ انگریز کی رہتی تھی۔ انگریز کسی کا انتخاب کرانا چاہتا اور وہ منتخب نہ ہوتا یا انگریز کسی کے انتخاب میں روڑا اٹکاتا اور وہ منتخب ہو جاتا اس کا بہت کم امکان تھا۔

عموماً پرانے ممبروں کو نئے انتخاب میں مدد دی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے انتخاب کے بعد مخالفِ حکومت ممبر بھی حکومت کی آنکھیں دیکھا کرتے تھے۔ اب وقت ہے کہ اونچے سے اونچا آدمی نیچے سے نیچی پبلک کی آنکھیں دیکھے۔ لیکن پبلک کے پاس آنکھیں ہونی چاہئیں۔ پبلک کم از کم اتنی بات سمجھ لے کہ جو شخص اپنا انتخاب چالاکی، فریب اور روپے کے بل پر کراتا ہے وہ ایمانداری کے ساتھ اور اللہ کے لئے پبلک کی خدمت نہیں کرے گا۔

محمد واحدی

ہز ایکسیلنسی الحاج خواجہ ناظم الدین، گورنر جنرل پاکستان ایک پارٹی میں چا نوش فرمارہے ہیں

فردوس

| چندہ سالانہ | | قیمت فی رسالہ |
|---|---|---|
| پانچ روپے آٹھ آنے | # فردوس | آٹھ آنے |
| ٹیلیفون نمبر ۳۶۶۳ | | پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱ |

جلد ۳ | کراچی - مئی سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۱


## فہرست مضامین

# لالہ مرلی دھر صاحب شاد کا گرامی نامہ

رسالہ فردوس کو آٹھ نو مہینے میں بغیر خفیف سی کوشش کے جتنے پڑھنے والے میسر آگئے وہ کم نہیں ہیں لیکن پڑھنے والوں کے بڑھنے سے خرچ بڑھتا ہے۔ آمدنی نہیں بڑھتی آمدنی کا ذریعہ ہر اخبار اور رسالہ کا اشتہار ہوا کرتے ہیں۔ اشتہار افسوس ہے مجھے نہیں مل سکے۔

خان بہادر شیخ حبیب الرحمن صاحب کے نزدیک فردوس پر سات آٹھ سو روپے ماہوار خرچ کئے جانا معمولی بات ہے اور انہوں نے زبان سے فردوس بند کرنے کا لفظ کبھی نہیں نکالا۔ مگر مجھے ضرور یہ اپنے اوپر پہاڑ جیسا بوجھ نظر آتا ہے۔ فردوس محض میری خاطر جاری کیا گیا تھا۔ خان بہادر صاحب کو اس سے کچھ لینا نہیں تھا۔

پچھلے دو مہینوں میں ان احساسات کی ایسی فراوانی رہی کہ بعض احباب مطلع ہو گئے اور بغیر اطلاع دور دور جا پہنچی مندرجہ ذیل خط کا شان نزول وہی اطلاع ہے۔

محترمی راحدی صاحب۔ تسلیم۔ مزاج شریف۔

جناب کی مہربانی سے پردۂ دنیا ہی پر فردوس کی سیر کر لی۔ نیز غائبانہ ملاقات بھی ہو گئی۔ آپ دلی سے باہر قدم نہ رکھتے تھے اور مجھے لائلپور سے دلی جانے کا اتفاق کم ہوتا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ پشتینی تعلقات میں کوئی فرق پڑ گیا تھا۔ اسی لئے یہ معلوم کرکے نہایت افسوس ہوا کہ جناب فردوس کے اجاڑنے کے درپے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دنیائے ادب بد مذاق ہوتی جاتی ہے جس کی وجہ سے ایک بلند پایہ اور معیاری پرچہ آپ کی چشم کرم سے محروم ہوا جاتا ہے۔ میری جانب سے صدق دل سے استدعا ہے کہ جناب ایسا غضب نہ ڈھائیں۔ یہی ایک ایسا پرچہ ہے جس سے دلی کی تہذیب، تمدن اور وضعداریاں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اور دلی کی زبان کی چاشنی و لذت سے زبان چٹخارے لینے لگتی ہے۔ آپ کی کوشش سے ممکن ہے یہ چیز کچھ عرصہ قائم رہ جائے۔ ورنہ اس میں شک نہیں کہ دلی اجڑ گئی۔ دلی والے اجڑ گئے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دلی کی تہذیب و تمدن بھی دفن ہو گئے۔ بہرحال میں تو دلی والوں کا خاص طور پر یہ فرض سمجھتا ہوں۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ ہندوستان میں ہوں یا پاکستان میں کہ وہ جہاں تک ہو سکے دلی کی خوبیوں کو برقرار رکھنے میں کوشاں رہیں۔ چونکہ اردو کا جنم دلی میں ہوا۔ وہیں پروان چڑھی اور جوان ہوئی اس لئے خاص کر دلی والوں کا یہ فرض بن جاتا ہے کہ اردو کو ہمیشہ زندہ رکھنے میں ہاتھ بٹائیں۔

یہ میں خوب سمجھتا ہوں کہ کوئی رسالہ بھی مدت طویل تک جیب سے پیسے دے کر نہیں چل سکتا۔ رسالہ ہی پر کیا انحصار ہے کوئی تجارت اس چیز کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ گھاٹا ہوتے ہوئے اس کو قائم رکھا جائے۔ مگر مجھ کو یقین ہے کہ اگر صرف دلی والے ہی اس طرف توجہ دیں اور کوشش کریں۔ تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ رسالہ اگر نفع بخش نہ ہو۔ تو زیر باری کا بھی باعث نہ ہو۔ میں نے اپنے چند دوستوں سے بات کی اور وہ بھی اس معاملہ میں حرف بحرف میرے ہم خیال ہیں۔ اور شاید بیجا نہ ہو اگر میں جناب کو ان کی طرف سے یقین دلا دوں کہ جہاں تک ان سے ہو سکے گا۔ چاہے قلمی طور پر چاہے کسی اور صورت میں وہ تعاون اور مدد سے گریز نہ کریں گے۔ اور دلی والوں اور دیگر ادب نوازوں سے پُرزور اپیل کروں گا کہ جہاں تک اور جس طرح ممکن ہو وہ اس پرچہ کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھیں۔ لیکن میں جناب سے بھی مستدعی ہوں کہ آپ اس پرچہ کو کم از کم چھ ماہ کی اور مہلت دیجئے۔ امید ہے جناب میری اس درخواست کو رد نہ فرمائیں گے۔ اور اگر جناب اپنی ضد پر قائم رہے تو یقین جانئے کہ ہر ادب نواز اور سخن فہم کو نہایت صدمہ ہوگا۔ کم از کم دلی والوں کو تو یہ بہت ہی شاق گزرے گی۔

جناب کی خدمت میں اپنی مل کا پہلے صفحہ کا ایک اشتہار اشاعت کے لئے حاضر خدمت ہے اس کو گلدستہ فردوس میں ہر ماہ شائع فرما کر ممنون فرمائیے۔

خادم ادب۔ مرلی دھر دہلوی ۱۰ اپریل ۱۹۴۹ء

# مجھے خدا کہاں ملا

شہروں کی چہل پہل اور رونق سے دور۔ بہت دور۔ جنگل اور بیرانوں میں، شام کے وقت جب سورج ڈوبتا ہوتا ہے۔ دن پر اداسی چھا جاتی ہے۔ وہ اداسی اور وہ سناٹا خدا کو مزید یاد دلاتا ہے۔ لیکن میں اس وقت بھی خدا سے بغاوت کر سکتا ہوں۔

شہروں سے باہر سورج کا نکلنا یقیناً خدا کو سامنے لے آتا ہے۔ تاریکی کا روشنی سے بدلتے چلے جانا دل تک ایک روشنی پہنچاتا ہے۔ مگر میں اس وقت بھی دل کی کھڑکی بند کر لینے پر اپنے آپ کو قادر پاتا ہوں۔

سمندروں کے تلاطم۔ دریاؤں کی روانی۔ پہاڑوں کی اونچائی اور کھڈوں کی گہرائی سب کے اندر خدا کی خدائی نمایاں نظر آتی ہے۔ لیکن میں خدا کی گود میں بیٹھ کر گناہ کرنے کا نام خوش ذوقی رکھتا ہوں۔

کلیوں کا کھلنا۔ پھولوں کا مرجھانا۔ درختوں کا سبز لباس پہننا اور پھولوں اور پھلوں سے لدنا اور پھر بالکل پتے جھاڑ کر کھڑے رہ جانا شاعر ہی کو نہیں، غیر شاعر کو بھی خدا کا پتہ دیتا ہے۔ لیکن باغ تو گناہ ہی کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔

یتیموں کی بے کسی۔ بیواؤں کی لاچاری۔ بیماروں کی ناتوانی اور فاقہ زدوں کی نیم جانی میں بھی مجھے خدا ملتا ہے۔ لیکن میں بے کسی ولاچاری ناتوانی و نیم جانی دوسروں کا حصہ سمجھتا ہوں اور اپنے عیش و آرام کو ان تاثرات سے مکدر نہیں کرتا۔

## خدا انسان کے اپنے دکھ میں پوشیدہ ہے۔

فقط اپنے دکھ میں

زبان سے کہنے کے لئے خدا بے شک موجود ہے۔ حقیقتاً بھی موجود ہے اور عقیدۃً بھی موجود ہے لیکن جب تک انسان خود دکھ میں مبتلا نہیں ہوتا اسے وہ خدا نہیں ملتا جسے ولی اور عارف خدا کہا گیا ہے۔ مگر اب مجھے تو اپنے اور صرف اپنے دکھ میں خدا ملتا ہے۔ اپنے دکھ میں شدت سے پہلے میں یتیموں کی بے کسی۔ بیواؤں کی لاچاری۔ بیماروں کی ناتوانی اور فاقہ زدوں [illegible] گمان کے تک نہیں کرتا تھا۔ — [illegible] واسطی

# ابلیس کی بھول

محبت کیا ہے؟ ضبطِ نفس کی حد سے گذر جانا
نگاہِ مدعا کا ایک منظر پر ٹھہر جانا

وفا کیا ہے؟ نیازِ عشق کو تسلیم کر لینا
جفا یعنی ادائے حسن کو تسلیم کر لینا

نہیں آساں سوادِ منزلِ الفت سے آگاہی
بھٹکتا ہے انہیں دو مرحلوں کے درمیاں راہی

نگہ مطلوب کی آزاد راہ و رسمِ یکتائی
نظر طالب کی پابندِ تلاشِ نقشِ ہرجائی

"تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں"
محبت کا یہی قانون رمزِ فرق و یکجائی

جمالِ یار تھا زیرِ نقابِ سجدۂ آدم
پرکھنا تھا فقط ابلیس کا ظرفِ شکیبائی

ادائے حسن پر غالب ہوا احساس "من ہستم"
غرورِ عشق نے "تردید قربت" کی سزا پائی

ابرار احمد عزمی

# ہماری زبان اور انگریزی

اردو ہندی کا جھگڑا کچھ ایسا زور پکڑ گیا ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی بھی جو ادبی خدمت کی صلاحیت رکھتے ہیں اس بکھیڑے میں پڑ کر اصلی کام سے غافل ہو گئے ہیں۔ اس وقت ہماری زبان کو چاہے اسے ہندی کہیئے یا اردو یا ہندوستانی سب سے بڑا خطرہ انگریزی زبان سے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انگریزی کے جو لفظ ہماری زبان میں رچ گئے ہیں انہیں چن چن کر نکال دینے کی کوشش کی جائے یہ کوشش تو ایسی ہی نامعقول ہو گی جیسے ہندی زبان سے عربی فارسی کے اُن سینکڑوں الفاظ کو بالکل خارج کر دینے کا جتن جو صدیوں سے اس میں مستعمل چلے آتے ہیں۔ اور جنہیں کبیر۔ تلسی۔ بہاری اور سورداس وغیرہ نے بے تکلفی سے استعمال کیا ہے یا اردو سے ان بھاشا پراکرت اور سنسکرت کے لفظوں کا اخراج جو خسرو سے حالی تک کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری زبان میں جو لفظ مناسبت کے ساتھ سج چکے ہیں اُن کی جگہ انگریزی لفظ کو دینا زبان پر ظلم کرنا ہوگا۔ انگریزی کے کون کون سے لفظ اردو میں قابل استعمال ہیں اور کون قابل استعمال نہیں یہ بات کسی ایک فرد کے طے کرنے کی نہیں ہے یہ کام تو مجموعی حیثیت سے اردو زبان کے ادیبوں یا اگر اردو کے ساتھ عالم کا لفظ لکھنا گستاخی نہ ہو تو اردو کے عالموں کا ہے۔ لیکن ایک موٹی سی مثال لیجیے۔ ہندی اور انگریزی لفظ کا ایک مرکب ریل گاڑی ہماری زبان میں مستعمل ہو گیا ہے۔ اب اگر اس کی جگہ کالسکۂ بخاری، یا اسٹیشن کی جگہ اقامت گاہ کالسکۂ بخاری کہا جائے تو یہ مضحکہ خیز ہوگا۔ ویسی ہی بات ہو گی جیسے سرشار نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب جب لکھنؤ کے اسٹیشن پر اُترے تو یکہ والے سے موٹر کی گاڑی لے چلنے کو کہنے کی بجائے کہنے لگے کہ طاؤس منزل لے چلو۔ مگر اس کی بھی کیا ضرورت ہے کہ وقت کی جگہ ٹائم اور دیاسلائی کی جگہ ماچس کہا جائے۔ لینٹرن کے لئے اپنی زبان میں کوئی خاص لفظ نہیں تو بے کھٹکے اسے اپنا کر لالٹین کہیئے۔ مگر آلہ روشن کار ماچس نہیں دیاسلائی ہی ہونا چاہیئے۔

اردو میں انگریزی کے لفظ کثرت سے استعمال کرنے کی بدعت روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ باپ کے

لئے والد کا لفظ استعمال کرنے پر ہندی والے چیں بجبیں ہو جاتے ہیں اور پتا لکھنے یا کہنے پر اردو والے کان کھڑے کرتے ہیں۔ مگر کالجوں میں جائیے تو باپ والد اور پتا سب نادارد ہیں، ان کی جگہ فادر نے لے لی ہے بقول ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو" ہمارا اوسط طالب علم کالج میں جو اردو بولتا ہے اس میں آدھے لفظ انگریزی کے ہوتے ہیں" دفتروں میں بھی قریب قریب یہی حال ہے۔ بیوی وائف ہو گئی ہے۔ بہن سسٹر بن گئی ہے۔ اسی طرح نقشہ بدلتا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اب ہمارے کتے بھی موتی نہیں بلکہ ٹیپو، اور بلیاں لیلا نہیں، بلکہ روزی یا پوسی ہوتی جاتی ہیں۔ اس ذہنی غلامی کا کیا ٹھکانا ہے۔ اس کے نتیجے بہت خطرناک ہیں۔ چکبست مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے

وطن میں بے وطن مجھ کو کیا ہے اک فسونگر نے  نہ میں ہندوستاں کا ہوں نہ ہے ہندوستاں میرا

یہ صحیح ہے کہ ہماری سیاسی اور معاشی یا اسی طرح دوسری اُن اصلاحی تحریروں میں جو مشرق کے زوال کے بعد مغرب سے نیا جیون بھر کر آنے والے علوم سے وابستہ ہیں انگریزی کے لفظ ضرور آئیں گے یا ایسے ترجمے ہوں گے جن میں غیر ملکی پن کی بو آئے گی۔ مگر یہ تو مجبوری کی بات ہے۔ سر سید نے سویلزیشن کا ترجمہ کرنے میں معذوری ظاہر کی۔ ڈاکٹر ٹیگور نے بھی اعتراف کیا ہے کہ بنگلہ جیسی مالدار زبان میں اس کا ہم معنی لفظ نہیں ہے۔ پھر بھی اُردو میں تہذیب کا لفظ رائج کر لیا گیا اور چل نکلا۔ دیکھئے مثنوی فکر حکیم میں اس لفظ کا کیا خوب استعمال ہوا ہے۔

نفس کی تہذیب پر کر دل رجوع

مولانا محمد حسین آزاد کانسٹی ٹیوشن کا ترجمہ کرتے ہوئے جھجکے مگر اب آئین بے تکلف استعمال ہوتا ہے۔ اگر سیاست پولیٹیکس کے صحیح معنی نہیں دیتا تو سیاست کی وسعت بھی پولیٹیکس میں نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو۔

دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا

ہماری زبان گویا ایک محفل ہے جس میں دیس دیس کے لفظ اپنی اپنی جگہ پر مزین ہیں۔ محفل کے دروازے کھلے ہیں۔ جو آئے اپنی مناسب جگہ پر بیٹھ جائے کسی میں شان و شکوہ زیادہ ہوگی تو دوسرے اپنے آپ اس کے لئے جگہ خالی کر دیں گے۔ لیکن اگر کوئی کندہ ناتراش دوسروں کو جو اپنی موزوں جگہ پر بیٹھے ہیں دھکا دے کر ان کی جگہ لینا چاہے تو اسے ہرگز برداشت نہیں کرنا چاہیئے اور اگر برداشت کیا گیا تو ساری محفل کی سج دھج بگڑ جائے گی۔

گوپی ناتھ امن لکھنوی

# عرضِ حال

رات دن قوم کی حالت پہ گلا کیوں نہ کریں — شدّتِ درد کو کچھ اور سوا کیوں نہ کریں
مضطرب، فکرِ ترقی میں رہا کیوں نہ کریں — وقت کو زندگی کا راہنما کیوں نہ کریں

آنچ جب آ ئی ہے تو خون دیا ہے ہم نے
مُلک، جاں بیچ کے آزاد کیا ہے ہم نے

نالہ و کرب میں ڈوبی ہوئی یہ شام و سحر — درد کی چوٹ سے ٹوٹے ہوئے یہ قلب و جگر
فاقہ کش پیٹ کا ابھرا ہوا چہرے پہ اثر — بھوک کی آگ سے تپتی ہوئی خاموش نظر

یہ پریشانی و افکار بدلنا ہے ہمیں
ایک دن وقت کی رفتار بدلنا ہے ہمیں

دہلی والو! ور پنجاب کی خوں بار فضا — درد و اندوہ کی چھائی ہوئی گھنگور گھٹا
ظلم کی تیغ پہ کٹتا ہوا معصوم گلا — آج بھی ملّتِ اسلام کو دیتا ہے صدا

دوستو! قوم نے پایا ہے بڑی مشکل سے
ملک یہ ہاتھ میں آیا ہے بڑی مشکل سے

کیا یہ رشوت ہے غریبوں کی مصیبت کا صلہ؟ — کیا وزارت ہے وہ دہلی کی قیامت کا صلہ؟
کیا یہی عہدے ہیں لوٹی ہوئی عصمت کا صلہ؟ — کیا یہی پارٹی بازی ہے سیاست کا صلہ؟

کچھ غریبوں کی صعوبت کا بھی احساس کرو
کم سے کم عزتِ اسلام کا تو پاس کرو

دردمندوں کی مصیبت نہیں دیکھی جاتی — اہلِ اسلام کی غربت نہیں دیکھی جاتی
منتشر، بزمِ اخوت نہیں دیکھی جاتی — کیف سے ملک کی حالت نہیں دیکھی جاتی

یا خدا قوم کو پھر پیرو قرآں کر دے
ہر مسلماں کو حقیقت میں مسلماں کر دے

کیفؔ بنارسی

# ۱۹۱۱ء کا دربار

دلی کے اردگرد جتنے کھنڈرات ہیں اور جہاں جگہ جگہ دلّیاں بن اور بگڑ چکی ہیں۔ وہاں کی سرزمین نے خدا معلوم کتنے دربار اور کتنے جشن دیکھے ہوں گے۔ اور خود شاہجہاں کی آباد کی ہوئی موجودہ دہلی کی آنکھوں میں اس وقت کرّ و فر اور جاہ و جلال کے کیا کیا مناظر پھر رہے ہیں۔ لیکن ۱۹۱۱ء کا دربار اپنی آپ نظیر تھا۔ ایسا بارونق اور عظیم الشان دربار غالباً دنیا میں کبھی اور کہیں نہیں ہوا۔ آدمی آدمی کے لئے میلہ اور تماشا ہے۔ اتنے آدمی ایک شہر کے اندر لاکر اکھٹے کر دینے کے پہلے سامان ہی کہاں تھے جو ایسا دربار ہو سکتا۔ ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ اس دربار کے لئے دلی آئے تھے۔ قریباً آٹھ ساڑھے آٹھ لاکھ نفوس اس زمانہ میں باہر کے یہاں تھے۔ ادھر آدمیوں کا یہ سمندر اور اُدھر اُن کو اپنی طرف کھینچنے والی پچاسیوں چیزیں دربار بھی منعقد ہوا تو گو شہنشاہ جارج پنجم کے قریب تو حکّام اور راجہ نواب اور فوجیں تھیں لیکن ان کے سامنے عوام کو بھی بیٹھنے کا موقع دیا گیا تھا۔ یہ مجمع اتنی دور تک پھیلا ہوا تھا کہ دوربین کے بغیر شہنشاہ کی صورت نظر نہ آ سکتی تھی۔ دوربینوں کی مدد سے دور تک بیٹھے ہوئے آدمیوں نے شہنشاہ کو دیکھا۔ شہنشاہ کا تخت دیکھا۔ شہنشاہ کو تاج پہنتے دیکھتا۔ شہنشاہ کو تقریر کرتے دیکھا۔ شہنشاہ کے سامنے راجہ نوابوں کو آتے دیکھا۔ جھکتے دیکھا اور اُلٹے قدموں ہٹتے دیکھا۔

جس ایمفی تھیٹر میں یہ دربار کیا گیا تھا۔ اسے دیکھنے کی اجازت عام تھی۔ دربار کے انعقاد سے پہلے لوگ جوق جوق وہاں جاتے تھے اور اس کی سنعت اور خوبصورتی کو دیکھ کر عش عش کرتے تھے۔ شہنشاہ کے تشریف فرما ہونے سے پہلے پہلے شہنشاہ کی قیام گاہ کو بھی اندر چل پھر کر ہر شخص دیکھ سکتا تھا۔ راجہ نوابوں کی قیام گاہیں بھی سب کے لئے کھلی ہوئی تھیں اور سب دیکھنے دکھانے کے قابل تھیں خیموں کا یہ شہر جو شہنشاہ کی قیام گاہ کے چاروں طرف پچیس میل کے رقبہ میں آباد تھا بجائے خود ایک شوقین کی تفریح کے لئے کافی تھا۔ سفر کی تکلیفیں اور روپے کا خرچ اس شہر میں پہنچ کر فراموش ہو جاتا تھا۔

لوگ سینکڑوں ہزاروں میل سے صرف اس چند روزہ اور عارضی شہر کی سیر کو کھنچے چلے آتے تھے۔ رات دن اتنی بھیڑ لگی رہتی تھی کہ غالباً ایسی صاف ستھری بھیڑ کسی مستقل آباد شہر میں ملنی ناممکن ہے۔ خیموں کی آرائش بعض راجہ نوابوں نے مشرقی طریقہ کی کرائی تھی۔ بعض نے مغربی طریقہ کی۔ خیمے کیا تھے محل تھے۔ کچھ معمولی لوگوں کے خیمے تو تھے ہی نہیں، راجہ نوابوں کے خیمے تھے۔ پارکوں کی بہتات تھی۔ فواروں کی کثرت تھی۔ بجری کی سرخ سرخ روشیں۔ ڈامر کی چوڑی چوڑی سڑکیں۔ سجی سجی دوکانیں۔ بجلی کی روشنی۔ غرض عجیب بہار تھی اس شہر تک پہنچنے کے واسطے دن میں بیسیوں ریلیں چھوٹتی تھیں اور اس شہر کی سیر کے لیے شہر کے اندر لائٹ ریلوے دوڑتی پھرتی تھی۔ شہر دہلی کے بازاروں کی بھی یہ حالت تھی کہ ہجوم کے مارے بازاروں میں چلنے والوں کا کھوے سے کھوا چلتا تھا۔ پندرہ پندرہ منٹ اور آدھ آدھ گھنٹے گاڑیاں رکی رہتی تھیں۔ دربار میں اور جلوس میں جانے کی تیاریاں لوگوں نے اس طرح کی تھیں جس طرح خوش حال گھروں کے بچے عید یا دیوالی کے انتظار میں کیا کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

سخت سردی کے باوجود خلقت رات کے ایک بجے سے امپھی تھیٹر کے پاس کھلے آسمان کے نیچے دلی سے آٹھ میل کے فاصلہ پر جا بیٹھی تھی اور بھوکی پیاسی دربار کے خاتمہ تک بیٹھی رہی۔ بھوک پیاس کا خیال فضول ہے۔ جب سردی سے مر جانے ہی کی پرواہ نہیں کی گئی۔ ایک لاکھ آدمی خاص دربار دیکھنے گیا تھا۔ اتنے آدمیوں کا ایک وقت میں ایک جگہ پہنچنا بھی ایک دلچسپ نظارہ تھا۔ ریل پر ریل چھوٹ رہی تھی اور موٹر پر موٹر دوڑتی تھی۔ تانگے بھی تھے اور دوسری قسم کی گھوڑا گاڑیاں بھی اور اللہ کی دی ہوئی ٹانگیں بھی تھیں۔ لینڈو گاڑیوں کا کرایہ اس روز پچاس پچاس اور ساٹھ ساٹھ روپے تھے اور تانگوں کا بیس اور تیس روپئے۔ اس زمانہ میں یہ بہت ہی زیادہ تھا۔

جلوس کی کیفیت بھی سنئے۔ جلوس شہنشاہ کے وارد ہوتے ہی نکلا تھا۔ اور دربار کئی دن کے بعد ہوا تھا۔ جلوس قلعہ کے دہلی دروازہ سے چلا۔ جامع مسجد پہنچا اور جامع مسجد کا طواف کرتا سول ہسپتال والی سڑک کو مڑا۔ یہاں سے چاندنی چوک فتحپوری۔ صدر دروازہ اور آخر میں پہاڑی کے اوپر چڑھ کر اس میدان میں اتر گیا جہاں باشندگان ہند کی طرف سے شہنشاہ ہند کی خدمت میں لیجسلیٹو کونسل کے صدر نے سپاسنامہ پیش کیا۔ اس طویل مسافت کے دونوں رخ جتنی دکانیں اور بالاخانے تھے ان کے مالکوں کی جلوس کے دن بن آئی تھی۔ جلوس

دیکھنے کے واسطے قلعہ سے جامع مسجد تک اور چاندنی چوک کی درمیانی پٹری پر اور ایک آدھ اور جگہ حکومت اور میونسپلٹی کی جانب سے بھی ٹھیکے دیدیئے گئے تھے اور ٹھیکہ داروں نے وہاں زینہ دار نشستیں بنا دی تھیں۔ جن کا ٹکٹ روپے روپئے اور آٹھ آٹھ آنے میں ملتا تھا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کا بھی ٹھیکہ ہوا تھا اور ان سیڑھیوں کے ٹکٹ پانچ پانچ اور دس دس روپئے میں بکے تھے۔

جلوس والے بازاروں کی چھتیں عورتوں سے پٹی پڑی تھیں۔ کمروں اور دوکانوں میں مرد کھچا کھچ بھرے تھے۔ کہتے ہیں کہ کباڑوں نے جلوس کی رات ڈولیاں ڈھو ڈھو کر پندرہ پندرہ اور بیس بیس روپے کمائے۔ یہ رقمیں اب بڑی نہیں سمجھی جاتیں۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں بڑی تھیں۔ جامع مسجد کے دالانوں چھتوں اور برجیوں میں بھی آدمی ہی آدمی تھا۔ دہلی سے شاہدرہ جانے میں ریلوے لائن قلعہ کے قریب سے گزرتی ہے۔ وہاں ایک پلیٹ فارم بنا ہوا ہے اور ایک دروازہ قلعہ کا اس کے سامنے کھلتا ہے۔ دروازہ تو قدیم ہے۔ لیکن یہ پلیٹ فارم دربار کے ایام میں تیار کیا گیا تھا۔ اور شہنشاہ نے اسی پلیٹ فارم پر نزول اجلال فرمایا تھا۔ اور وہ اس دروازہ سے قلعہ میں داخل ہوئے تھے۔ شہنشاہ کے حضور میں ہمارے راجہ نواب جیسے جیسے لباس پہن کر تشریف لائے تھے۔ اور جن جن طریقوں سے سلام بجالاتے تھے اُس کا بیان بھی لُطف کا موجب ہوگا۔ بالکل سادہ اور صحیح لباس فقط نظام کا تھا۔ ورنہ کم و بیش تمام راجہ، نواب رنگین۔ زرکار۔ زنانے اور بدنما لباسوں میں ملبوس تھے۔ اور بعض سرحدی سردار گاڑھے کی پگڑیاں باندھے اور ڈھیلے ڈھالے کرتے پہنے تھے۔ یعنی یا اس سرے تھے یا اُس سرے۔

ایک نوجوان سرحدی رئیس کا کرتا اس قدر میلا تھا جیسے مہینوں سے بدلا نہ گیا ہو۔ بہمل کے ایک راجہ نے یوں سلام کیا تھا کہ بڑا سا سفید کپڑا شہنشاہ کے قدموں میں بچھایا اور اس پر قدمبوسی کی اور پھر کمال اطمینان کے ساتھ وہی کپڑا شہنشاہ بیگم کے قدموں میں لے گئے اور اس پر ان کی قدمبوسی فرمائی۔ راجپوتانہ کے بیشتر رؤسا اپنی اپنی تلواریں شہنشاہ کے سامنے رکھ کر قدمبوس ہوئے۔ ایک عرب سردار اس شان سے آئے کہ تہمد بندھا تھا۔ پنڈلیاں کھلی تھیں کمبل اوڑھے تھے۔ لیکن سلام کرنے میں جھکے نہیں۔ المختصر ہر ملکے دیگر رسمے۔

سلام کی رسم اور ملاقاتوں سے فارغ ہو کر جلوس اس ترتیب سے چلا تھا کہ اوّل صدر دربار کمیٹی اور ایک فوجی جنرل الگ الگ موٹروں میں بطور ہراول نکلے اور راستے کی حالت دیکھتے سیدھے وہاں پہنچ گئے جہاں

جلوس کو جاکر ٹھہرنا تھا۔ ان کے تھوڑی دیر بعد ایک گھوڑے پر شہنشاہ اور اُن کے بائیں جانب ایک گھوڑے پر ائسرائے اور دونوں کے پیچھے دو گھوڑوں پر دو اور انگریز نمودار ہوئے۔ ان چاروں کی وضعیں کچھ ایسی مشابہ تھیں کہ اگر شہنشاہ کا ہاتھ بار بار سلام کو نہ اٹھ رہا ہوتا تو پہچاننا دشوار تھا کہ شہنشاہ کون سے ہیں۔

ان چاروں کے پیچھے شہنشاہ بیگم کی گاڑی تھی۔ پھر وائسرائے بیگم کی۔ پھر وزیر ہند کی پھر کچھ اور حکام آئے۔ اور ان کے بعد راجہ نوابوں میں سب سے آگے نظام تھے۔ پھر مہاراجہ بڑودہ۔ میسور۔ کشمیر۔ جے پور۔ جودھ پور اور دوسرے چھوٹے بڑے رئیس۔

۷ر دسمبر سے ۱۶ر دسمبر تک شہنشاہ جارج پنجم کا دہلی میں قیام رہا تھا۔ ان دس دنوں میں ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات تھی۔ ۱۹۱۱ء سے پہلے قلعہ کے پاس دریا گنج والی فصیل کے نیچے درخت ہی درخت پھیلے ہوئے تھے۔ درخت کیا تھے درختوں کا بڑا زبردست بن تھا۔ اس بن کو ۱۹۱۱ء میں کاٹا گیا تھا اور قلعہ کے نیچے بڑا شاندار میلہ لگا تھا۔ ایک رات یہاں آتش بازی بھی چھوٹی تھی۔ اور میلہ اور آتش بازی کو شہنشاہ اور شہنشاہ بیگم نے ملاحظہ فرمایا تھا۔ اور اُسی میلہ میں مغل بادشاہوں کی طرح مثمن برج میں بیٹھ کر رعایا کو درشن دیئے تھے۔ اور اسی موقع پر مسلمان علماء و مشائخ اور ہندوؤں و سکھوں کے مذہبی پیشواؤں کا سلام قبول فرمایا تھا۔

اُس دن جیسا میلہ اور اس دن جیسی آتش بازی کی مثال سورج اور چاند شاید نہیں دے سکتے۔ دریا کا کنارہ۔ قلعہ کا سایہ۔ صاف ستھرا میدان۔ ٹھنڈا موسم۔ مردانہ اور سپاہیانہ کھیل۔ طرح طرح کی دکانیں۔ بلکہ طرح طرح کے بازار۔ قسم قسم کے انسان۔ عربی۔ شامی۔ چینی۔ جاپانی۔ افریقی۔ بربری۔ افغانی۔ ایرانی۔ فرانسیسی اطالوی جرمنی۔ اسپینی۔ پرتگیزی۔ امریکی۔ بلجیمی۔ دنیا کی کون سی قوم تھی جس قوم کا آدمی اس میلہ میں نہ ہو۔ ایک حیرتناک منظر تھا۔ جامع مسجد اور قلعہ کے درمیان جو ایڈورڈ پارک ہے اس کا افتتاح بھی شہنشاہ جارج پنجم نے کیا تھا۔ قیام گاہ سے ایڈورڈ پارک تک شہنشاہ کا آنا دیکھنے کے لئے آٹھ میل مسلسل آدمی موجود تھے۔ یہی چیزیں ہیں جنہیں دربار کہا جاتا تھا۔

جس طرح سینکڑوں جشن اور ہزاروں دربار ۱۹۱۱ء سے قبل ہو ہو کر ختم ہوگئے اسی طرح ۱۹۱۱ء کا دربار بھی اب بس حافظہ میں محفوظ ہے۔ جہاں خیموں کا شہر تھا وہاں خاک اڑ رہی ہے۔ جہاں میلہ لگا تھا وہاں

دریا کی ریتی ہے۔

جن کا دربار تھا وہی لاکھوں من مٹی کے نیچے جا سوئے۔

محمد ولحدی

یہ مسٹر ایم۔ اسلم کی کتاب ہے۔ ناول اور افسانے تو مسٹر ایم۔ اسلم نے بہت لکھے اور اس لکھنے میں نام پایا۔ لیکن اس قسم کی کتاب غالباً انہوں نے یہ پہلی شایع فرمائی ہے۔ آدھی سے زیادہ کتاب ایک نومسلم، آسٹریا کے رہنے والے مسٹر فیلکس ویلائی کی تصنیف "دی پولیٹیکل اینڈ ریلیجیس ریوولیوشن اِن اسلام کا ترجمہ ہے اور آدھی کتاب میں اسلم صاحب نے اسلامیان ہند پر طایرانہ نظر کے عنوان سے خود خامہ فرسائی کی ہے۔ مسٹر فیلکس ویلائی نے ترکی، مصر، روس اور ایشیائے کوچک کے مسلمانوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ کس طرح دوبارہ اُٹھ کھڑے ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اور مسٹر ایم اسلم نے اپنے مضمون میں ہندوستان کے مسلمانوں کا حال دکھایا ہے کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان انقلاب کی کیا کیا صورتیں اختیار کیں۔ اقوام مغرب مسلمانوں کی سرگرمیاں روکنے اور انہیں اپنی غلامی میں جکڑے رکھنے کی جو چالیں چلتی رہیں ان سب کا بھی کتاب انقلاب اسلام میں بیان آگیا ہے۔ مسٹر فیلکس ویلائی کی کتاب کا ترجمہ مسٹر ایم اسلم سے علامہ اقبال نے کہہ کر کرایا ہے۔ یہ ترجمہ علامہ مرحوم کی نظر سے گزر چکا ہے اور اس کے مسودہ پر ان کے ہاتھ کی تحریر موجود ہے کہ "یہ کتاب ہر پڑھے لکھے مسلمان کو پڑھنی اور اپنے ناخواندہ بھائیوں کو پڑھ کر سنانی چاہیئے"۔ کتاب کا موضوع چونکہ ہنگامہ خیز ہے۔ لہجہ کہیں کہیں سخت ہو گیا ہے۔ کتاب آج کل کے مروجہ خوبصورت چھوٹے سائز پر صاف ستھری چھپی ہے۔ مجلد ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت۔ تین روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ دارالبلاغ۔ محمد نگر۔ اقبال روڈ۔ لاہور

# کلام ماہر

دیکھو نہ سوئے گریۂ شبنم چلے چلو
کر دے خزاں بہار کو برہم چلے چلو

ٹھیرو نہ گلستاں میں اب اک دم چلے چلو
ہونے دو جشن باغ کا موسم چلے چلو

یہ کہہ کے ان کو لے ہی چلیں بے نیازیاں
دیکھو نہ سمت دیدۂ پُر نم سے چلے چلو

دشتِ جنوں میں وحشتِ دل کا یہ حکم ہے
جب تک تمہارے دم میں بھی ہے دم چلے چلو

مانا کہ گل ہیں۔ باغ ہے۔ عہد بہار ہے
چلنا مگر ہے سب سے مقدم چلے چلو

کیوں آتے آتے رک گئے تم اک لحد کے پاس
ہر گام پر ہے عشق کا عالم چلے چلو

اک مرحلہ ہے یہ بھی طلسمِ مجاز کا
دیکھو نہ یہ بہار کا عالم چلے چلو

پروانے ہوں کہ شمع ہو گل ہوں کہ عندلیب
ان میں نہیں ہے کوئی بھی محرم چلے چلو

اے رہروانِ راہِ طلب دور ہے مقام
دیکھو نہ ہست و بود کا چم خم چلے چلو

شاہیں پکارتا ہے کہ اے طائرانِ باغ
اک دام ہے بہار کا موسم چلے چلو

ہونے دو بزم و رزم و بہار و خزاں کے کھیل
ٹھیرو مگر کہیں بھی نہ اک دم چلے چلو

ٹھیرو نہ دیکھنے کے لئے سوز و سازِ دہر
ہاں ہاں کہیں خوشی ہے کہیں غم چلے چلو

ہاں زیست مستعد ہے اور موت گھات میں
ٹکرا کے موت و زیست کو باہم چلے چلو

انسانیت کی موت ہے واماندگی کا عذر
ماہر جو آدمی ہو تو پیہم چلے چلو

ماہر دہلوی

# نفسیاتِ تعلیمی

بچپن میں بچے کیسی کیسی عجیب حرکتیں کرتے ہیں، اپنی باتوں کا مطلب یا تو وہ خود ہی سمجھ سکتے ہیں یا پھر ماہر نفسیات نے بڑی کوشش اور تجربوں کے بعد قدرے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بچوں کی حرکتیں جو بظاہر بے معنی اور محض شرارت معلوم ہوتی ہیں در اصل بے معنی نہیں۔ بلکہ بچے کی ہر حرکت میں اس کی آئندہ زندگی کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ اگر ہم ایک بچے کا مطالعہ کریں اور اس کی ہر حرکت پر غور کریں تو ہمیں اس بات کا بہت کچھ اندازہ ہو جائے گا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر کیسا ہوگا۔

منجملہ دیگر عادتوں کے بچوں میں ایک عادت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ چیزیں جمع کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت آپ کو بہت آسانی سے مل سکتا ہے۔ ننھے میاں کا خزانہ اُن کے کوٹ۔ شیروانی یا قمیض کی جیبوں میں رہتا ہے۔ آپ ذرا اُن کی جیبوں یا اُن کے میز کی درازوں کی تلاشی لیں۔ وہاں آپ کو بے شمار شیشے کی رنگ برنگی گولیاں، دیاسلائی کی ڈبیاں، سگرٹ کے خالی ڈبوں کے ڈھیر۔ چکنے گول پتھر۔ لکڑی کے ٹکڑے اور چوکور ٹکڑوں کا ذخیرہ، پتنگیں۔ خوشنما شیشیاں اور ننھی ڈبیاں۔ لکڑی کی ریلیں، وغیرہ غرض اس قسم کی سینکڑوں چیزیں نظر آئیں گی۔ ہم سب ان چیزوں کو خرافات سمجھتے ہیں کہ بچہ بے وقوف اور نادان ہے جو ایسی حقیر اور ذلیل اور بے کار چیزوں کو جمع کرتا ہے۔ بعض اوقات ہم بچے کو ڈانٹتے ہیں کہ اس قسم کے انبار جیبوں میں کیوں ٹھونس رکھے ہیں۔ بعض اوقات ہمارا غصہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ معصوم بچے خوف کی وجہ سے اپنا محنت سے جمع کیا ہوا ذخیرہ کوڑے میں ڈال دیتا ہے۔ مائیں خوش ہوتی ہیں کہ بچے نے اُن کا حکم مان کر بے کار ذخیرہ کوڑے میں پھینک دیا۔ مگر اپنی لاعلمی کے باعث یہ نہیں سمجھتیں کہ بچے کی اس جبلت کو پامال کر کے انہوں نے کتنا بڑا جرم کیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچے آخر جمع کیوں کرتے ہیں۔

جمع کرنے کی فطری عادت نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں اور کیڑوں وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے۔

لیکن اس کا عمل جس قدر نمایاں طور پر چیونٹی میں پایا جاتا ہے شاید ہی کسی اور جاندار میں پایا جائے۔ کس قدر مشقت سے یہ ایک ایک دانہ جمع کرتی ہے اور کتنے صبر اور استقلال سے اپنا کام کئے جاتی ہے۔ دانے کا بوجھ خود اس کے وزن سے زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے بار بار وہ منہ سے گر پڑتا ہے لیکن آخر اس کو کشاں کشاں لے ہی جاتی ہے۔ اگر اس حقیر کیڑے کی اس محنت کے فائدے پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی یہ مشقت اور کوشش اس لئے ہے کہ سخت سردی کے زمانے میں جب وہ باہر نہیں نکل سکے گی کھانے کا یہ ذخیرہ زندگی قائم رکھنے کے کام آئے گا۔

اسی طرح پرانے زمانے میں جبکہ انسان غیر مہذب تھا مختلف چیزوں کو جمع کرنا اور ان کو محفوظ رکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا کیونکہ ذرائع آمد و رفت محدود تھے ریلیں وغیرہ ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں اگر کسی جگہ قحط پڑ جاتا تھا تو دوسرے ممالک کے لوگ قحط زدہ ملک کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے قحط سے بچنے کے لئے لوگ غلہ نیز دوسری ضروریات زندگی جمع رکھتے تھے۔ قحط کے علاوہ لڑائیاں عام تھیں۔ لہذا دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لئے مختلف چیزوں کا جمع کرنا بہت ہی زیادہ ضروری تھا۔ اپنے آباؤ اجداد کی یہی عادت بچوں میں ورثے کے طور پر ابھی تک چلی آ رہی ہے جس کی وجہ سے بچوں کو مختلف قسم کی چیزوں کے جمع کرنے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ لیکن اگر مختلف ممالک کے بچوں یا ایک ہی ملک کے مختلف طبقوں کے بچوں کے ذخیرہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ بچہ اپنے ماحول کے مطابق چیزیں جمع کرتا ہے، شہر کے لوگ گاؤں کے لوگوں سے زیادہ امیر اور مہذب ہوتے ہیں اس لئے شہری بچے جو چیزیں جمع کرتے ہیں وہ بہتر اور نسبتاً قیمتی ہوتی ہیں اور گاؤں کے بچے محض رنگ برنگے کاغذ، تصاویر، پتھر، ڈور وغیرہ جمع کرتے ہیں۔ شہری بچے کے خزانے میں اکثر قیمتی کھلونے۔ لٹو۔ چاکلیٹ ٹافی یا پوڈر کے خوبصورت ڈبے وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح لڑکے اور لڑکیوں کے ذخیروں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے خزانے میں عموماً خوبصورت رنگین موتی یا ریشم کے کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے ٹکڑے، ٹوٹے نگینے، چوڑیوں کے ٹکڑے غرض اس قسم کی سینکڑوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ بچے میں یہ جذبہ تین سال کی عمر میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور دس اور

چودہ سال کے درمیان یہ جذبہ بہت قوی ہو جاتا ہے۔ تین سال کی عمر سے بچہ ہر اُس چیز کو جو اُسے مل جاتی ہے جمع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن جوں جوں بچے کی عمر میں ترقی ہوتی جاتی ہے وہ مختلف چیزوں میں امتیاز کرنے لگتا ہے اور ہر چیز کو اپنے ذخیرہ میں شریک نہیں ہونے دیتا۔ یعنی مختلف چیزیں ایک خاص مقصد کے تحت جمع کی جاتی ہیں اور جو چیزیں اس مقصد کے مطابق نہیں ہوتیں انہیں ترک کر دیا جاتا ہے۔ آخری زمانہ میں یعنی تیرہ چودہ سال کی عمر میں اس کو اپنے ذخیرے سے تجارت کرنے کا خیال آنے لگتا ہے۔

چونکہ بچوں کو قدرتی اشیاء سے بہت دلچسپی ہوتی ہے اس لئے ہم انہیں مختلف اقسام اور رنگ کے پھول اور پتے جمع کرنے اور رنگ برنگ کی تتلیوں اور بھونروں کا پیچھا کرنے میں مشغول پاتے ہیں۔ ہم ان سب باتوں سے یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ خود قدرت نے اس جذبے کے ذریعے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا ہے۔

اس جذبہ کی تعلیمی اہمیت کے علاوہ اگر ہم غور کریں کہ بچوں کو اپنے اس جذبہ کی تسکین کے لئے کس قدر دقت اُٹھانی پڑتی ہے تو ہمیں نہ صرف حیرت بلکہ افسوس ہوگا کہ ہم اپنی لاعلمی اور جہالت کے باعث قدرت کے بیش بہا عطیوں کو ضائع اور برباد کر رہے ہیں۔ مثلاً ایک بچہ جو سگریٹ کی ڈبیاں جمع کر رہا ہے روزانہ اس فکر میں رہتا ہے کہ کب اباجان کے سگریٹ ختم ہوں اور کب خالی ڈبیا ہاتھ آئے۔ سڑک پر کوئی خالی ڈبیا پڑی دیکھی بس اُسی دم جھپٹ پڑے اور خزانے میں داخل کر لی۔ اباجان کے کسی دوست نے خالی ڈبیا لانے کا وعدہ کیا تو جونہی وہ آئے فوراً بھاگ کر باہر گئے اور وعدہ یاد دلا دیا۔ کبھی بھائی جان سے فرمائش ہے کہ سڑک پر کوئی ڈبیا پڑی دیکھیں تو فوراً اٹھا لائیں۔ کبھی تتلیوں کے جمع کرنے کے لئے باغوں میں دوڑے پھر رہے ہیں یا اگر آپ کے یہاں بڑھئی فرنیچر بنا رہا ہے تو لکڑی کے ٹکڑے اور چوکور ٹکڑوں کے حاصل کرنے کی فکر ہے۔ ویسے تو بڑھئی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن اس مطلب کے لئے بڑھئی کو پہلے سے ہدایت ہے کہ یہ لکڑی کے جو ٹکڑے نکلیں بس اسے ہی ملیں۔ بڑے بھائی یا آپا مانگیں تو ہرگز نہ دے۔ اسی فکر میں کبھی اندر رہتے ہیں کبھی باہر اور جب تک لے نہیں لیتے چین نہیں آتا۔ غرض ایک معمولی سی چیز جمع کرنے کے لئے بچوں کو کافی محنت خیال اور فکر کرنی پڑتی ہے۔

مشاہدہ اس بات کا شاہد عادل ہے کہ گو کمسن بچہ کا یہ جذبہ مختلف اشیاء کے جمع کرنے تک محدود

ہوتا ہے لیکن عمر کی ترقی کے ساتھ وہ ان چیزوں کا مقابلہ کرتا ہے ان پر قسم قسم کے تجربے کرتا ہے اور اُن کی امتیازی خصوصیات معلوم کرکے ان کی درجہ بندی (classification) کرتا ہے اور جب تک وہ سب کام نہیں کر لیتا اس کو تشفی نہیں ہوتی۔ لیکن ذرا غور تو کیجئے کہ اس ذہنی عمل کے لئے بچہ کی کتنی توانائی خرچ ہوئی اور وہ بھی دیا سلائی کی ڈبیوں کے نمونے یا ایسی کسی فضول و بیکار چیز پر۔ اگر یہی توانائی جو بچے بخوشی اپنے ذخیرہ پر صرف کرتے ہیں کسی مفید اور اعلیٰ کام میں صرف ہوتی تو یقیناً دنیا میں بہت ترقی ہوتی۔

پس والدین و اساتذہ کو چاہیئے کہ وہ اس جذبہ کو حقیر اور فضول نہ سمجھیں بلکہ بچوں سے خود فرمائش کریں کہ وہ اپنی خواہش کی چیزیں جمع کرکے استاد کے پاس لائیں اور وہ اپنی نگرانی میں درجہ بندی کرائے اور ان کو ایک آئینہ دار الماری یا (Showcase) میں رکھے تاکہ جماعت کا ہر بچہ دوسرے بچوں کے ذخیروں کو دیکھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کرسکے اور اس طرح اس کے ذوق کا دائرہ وسیع ہوتا جائے۔ اس جذبے سے تاریخ جغرافیہ اور مطالعہ قدرت کے اسباق میں بہت فائدہ حاصل ہوسکتا ہے اور اساتذہ کو چاہیئے کہ اس جذبے سے آئندہ زندگی کے فائدے کو مدنظر رکھیں اور اسے sublimation یعنی بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ تاکہ جو قوت کہ بچپن میں فضولیات جمع کرنے میں صرف ہوتی تھی وہ آئندہ چل کر واقعات کے جمع کرنے اور اُن کا مقابلہ کرنے اور پھر یہ معلوم کرنے کے کام آئے کہ کون سے واقعات ٹھیک ہیں اور کون سے غلط۔ واقعات جمع کرنے سے وہی بچے جو بچپن میں مختلف قسم کی تتلیاں اور بھونرے جمع کرتے تھے بڑے ہو کر قابلانہ (Theses) اور مقالات لکھیں گے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کریں گے۔ ہماری ساری موجودہ ایجادات اسی تحقیق اور واقعات جمع کرنے کا نتیجہ ہیں اور تحقیق کے ذریعے اور بہت سی چیزیں ایجاد ہوں گی جس پر دنیا فخر کرے گی۔

اختر قریشی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

# پیامِ عمل

بندگی کرنے کا وہ انداز ہونا چاہئے
بندگی پر بندگی کو ناز ہونا چاہئے

آدمی میں عزم اور جوشِ عمل کے ساتھ ساتھ
غیرتِ پروانہ جاں باز ہونا چاہئے

رونے والے گریۂ خاموش سے کیا فائدہ
کچھ تو آوازِ شکستِ ساز ہونا چاہئے

شوق سے کیجئے ترقی کی طرف بڑھنے کا عزم
اور عزمِ محکم پرواز ہونا چاہئے

کم سے کم اتنی تو دلکش ہو نوائے اتحاد
قلبِ عالم پر اثر انداز ہونا چاہئے

کیوں نگاہِ دوست تجھ میں بے رخی پاتا ہوں میں
کچھ نہ کچھ تو انکشافِ راز ہونا چاہئے

میرے قصہ کو سماعت سے جہاں کی واسطہ
صرف ان کو گوش بر آواز ہونا چاہئے

پھر کوئی صورت ہو تجدیدِ مذاقِ عشق کی
پھر اسی روداد کا آغاز ہونا چاہئے

انگلیاں اٹھتی ہیں اب تو جس طرف جاتا ہوں میں
انقلاب اے چشمِ فتنہ ساز ہونا چاہئے

بازوؤں میں قوتِ پرواز ہو چاہے نہ ہو
دل میں لیکن جذبۂ پرواز ہونا چاہئے

مختلف سازوں کو چھیڑو بھی تو یوں چھیڑو نہالؔ
ایک ہی لَے ایک ہی آواز ہونا چاہئے

نہالؔ رضوی

# انسان گلّے کا جانور ہے

انسان آج بھی تقریباً ویسا ہی وحشی اور جنگلی ہے، جیساکہ اُس زمانہ میں تھا، جبکہ غاروں میں رہتا تھا۔ یہ گلّے کا جانور ہے۔ یعنی گائے، بھینسوں، بھیڑوں بکریوں کی طرح گلّے (Herds) بناکر رہتا سہتا ہے۔ ......"

**سلطان بابو:** جناب بے شک ہم نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ پہلے خاموشی سے آپ کی بات سُنا کریں گے، پھر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئے گی تو اُس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا کریں گے اور آپ سے پوچھ لیا کریں گے، مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ ہمارے وعدے کی بھی حد ہے۔ آپ بات ہی ایسی فرماتے ہیں کہ ہم تو کیا، اچھے اچھے چپ نہیں رہ سکتے۔ آپ ہم کو جانور کہہ رہے ہیں۔ وحشی کہہ رہے ہیں، ہم گائے بھینسوں، بھیڑوں بکریوں کی طرح گلّے بناکر رہتے سہتے ہیں؛

**مسٹر میمن:** یہ سائی کولوجی (علم النفس Psychology) کے متعلق گہرا مضمون ہے۔ فرنگی اور عرب محققین، دونوں کی درایت ایک ہی ہے۔ سب سے پہلے عرب محققین نے یہ بات سمجھی اور ثابت کیا کہ انسان جانور ہے۔ (الانسان حیوانٌ) ان کے بعد فرنگی عالموں نے بھی عربوں ہی کی پیروی کی اور بالکل یہی بات دہرائی کہ آدمی جانور ہے (Man is an animal) اس میں بُرا ماننے اور غصہ ہونے کی کیا بات ہے۔ خفگی یا غصے سے حقیقت تو مٹ ہی نہیں سکتی۔ چاہے کیسے ہی غصے ہوجیئے۔ چاہے کیسے ہی دانت پیسیئے۔ جس طرح غاروں میں رہنے والا ازحد جنگلی

اور وحشی آدمی دانت پیسا کرتا تھا۔ حقیقت تو حقیقت ہی رہے گی، آدمی تو جانور کا جانور ہی رہے گا۔"

سلطان بابو۔ مگر ہماری تعلیم، ہماری تہذیب، کالج، یونیورسٹیاں۔ مکانات، فرنیچر، ہوائی جہاز، ریلیں، اگر آدمی جانور کا جانور ہے۔ تو کیا یہ سب چیزیں جانوروں نے بنائی ہیں، اور کیا یہ تعلیم اور تہذیب فضول ہے، آج تک کسی نے نہیں دیکھا کہ کوتوں نے درزی کی دوکان کھول رکھی ہو، یا ہاتھی کوئی مکان بنا رہے ہوں یا شیروں نے اپنے بھٹ میں، جھاڑ فانوس لگا رکھے ہوں۔ یا کسی اور طرح کا روشنی کا کوئی سامان کیا ہو۔"

مسٹر یونس۔ "بس ایک بئے تو بے شک اپنا گھونسلا ذرا اچھا بنا لیتے ہیں، کبھی کبھی کوئی جگنو ہاتھ لگ جاتا ہے، تو روشنی کے لئے پکڑ لاتے ہیں، مگر وہ حضرت نوحؑ کے زمانے سے ایسا ہی کرتے ہیں۔ آگے انہوں نے کچھ ترقی نہیں کی۔ حضرت نوحؑ کا جب طوفان آیا تھا، تو حضرت نے طوفان سے پہلے جانوروں کا ایک ایک جوڑا اپنی کشتی میں چڑھا لیا تھا۔ یہ جانور جیسے جب تھے، ویسے ہی آج ہیں۔ کیا انسان بھی ویسا ہی ہے؟"

مسٹر میمن۔ "نہیں انسان ویسا تو نہیں ہے، مگر ہماری تعلیم، ہماری تہذیب، ہمارے کوٹ، قمیض بنیان، اور جلد کے نیچے تقریباً ویسا ہی وحشی پن چھپا ہوا ہے جیسا کہ ابتدائی انسان کے ظاہر تھا۔ مثلاً "لڑائی بھڑائی" فطرت انسانی میں داخل ہے، غاروں میں رہنے والا ابتدائی انسان جب کسی پر غصہ کرتا تھا تو اُسے دیکھتے ہی گتھم گتھا ہو جاتا تھا۔ ہم چونکہ تعلیم یافتہ ہیں، "مہذب" ہیں تجربہ کار ہیں۔ اس لئے ہم یہ نہیں کرتے کہ دشمن کو دیکھا اور جنگلی انسان کی طرح آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً گتھم گتھا ہو گئے۔ ہم نے اپنی اس لڑائی بھڑائی کی "ضرورت" کو پورا کرنے کے لئے اور اور بیسیوں طریقے نکال رکھے ہیں۔........"

سلطان بابو۔ "کیا لڑائی بھڑائی "ضروریات" زندگی میں شامل ہے؟"

حاجی اشفاق۔ اصل بات یہ ہے کہ بابو میاں حد درجہ دخل در معقولات کے عادی ہیں۔ ہماری

پارٹی میں، بلکہ چوں کہ ہم بھی جانور ہیں، اس لئے یہ کہنا چاہیئے کہ ہمارے "گلے" میں" جب بھی بیٹھتے ہیں تو یہ وعدہ کرکے بیٹھتے ہیں کہ پہلے غور اور خاموشی سے سنیں گے، اور اس کے بعد، جو کچھ اعتراض کرنا ہوگا، وہ کریں گے۔ بڑی خوشی سے جواب دیا جائے گا

**سلطان بابو۔** تو جناب آپ بات ہی ایسی کہتے ہیں۔ "آدمی جانور ہے" لڑائی "ضروریات زندگی" میں شامل ہے۔ کوئی کہاں تک چپ رہے۔ گائیں، بیل اپنے گلے میں چپ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہم کوئی بیل تھوڑا ہی ہیں کہ چپ سادھے رہیں۔

**حاجی اشفاق۔** جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو، مگر اس مجلس کی شرائط یہی ہیں کہ پہلے اچھی طرح سے سنئے اور اس کے بعد اعتراض کیجئے۔

**مسٹر مبین۔** میں حاجی جی کی بات پر صاد کرتا ہوں، ہم کو آداب مجلس کو مدنظر رکھنا چاہیئے، اور ہم کو فردوس کے ہزار ہا ناظرین پر ثابت کر دینا چاہیئے کہ باوجودیکہ ہم معمولی حیوانوں کی طرح حیوان ہیں، پھر بھی ہم کم سے کم یہ کوشش ضرور کرتے ہیں کہ کوٹ، قمیض، بنیان کے نیچے جنگلی پن چھپا رہے۔ ہم سب ہمہ تن گوش ہیں، آپ فرمائیے۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا۔ اس نے خدا کو پہچان لیا۔ دنیا میں ترقی کرنے کے لئے یہ بات از حد ضروری ہے کہ ہم اپنے نفس کو بھی پہچانیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اچھی طرح سے سمجھیں، جن سے ہم کو آئے دن واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ سائکولوجی (علم النفس psychologe) ہم کو اس "پہچاننے" کے کام میں بڑی مدد دیتی ہے۔

اگر ہم خود اپنے کو شناخت کرلیں گے، تو ہم خود اپنی کمزوریاں دور کر سکیں گے، اور اپنی جسمانی اور دماغی طاقت کا بالکل صحیح استعمال بھی کرسکیں گے۔ اور اگر ہم دوسروں کو، مثلاً بیوی کو، بچوں کو، اردو سیل کو، خریداروں کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے، تو ہم کو، انہیں اپنی "ڈگر" پر چلانے میں اور ان سے معاملات کرنے میں بڑی آسانی ہوگی۔

ظاہر ہے کہ اگر زیادہ سے زیادہ لوگ ہماری طرف ہوں، اور ہمارے کہنے پر چلیں، تو ہم کو زیادہ

سے زیادہ فائدہ بھی ہو گا۔

سائی کولوجی، ہم کو اس بات کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ ہم خود اور دوسرے لوگ "کیوں" اور "کس لئے" کوئی کام کرتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ بہت سے لوگ اپنی زندگی، صرف اس لئے مغموم اور اُداس گزارتے ہیں کہ وہ خود نہیں جانتے کہ کیا چاہتے ہیں؟ خوشی اور خرمی کی زندگی بسر کرنے کے لئے اس بات کا جاننا بھی بڑا ضروری ہے کہ آپ خود کیا چاہتے ہیں، اور دوسروں کی ضروریات کیا ہیں۔ دوسروں کی ضروریات کو سمجھ لینے سے بھی بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔

## حسِ حیوانی
## (INSTINCT)

یہ تو بالکل پکی بات ہے کہ انسان بھی حیوان ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ بہت سی اچھی اور بُری خاصیتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان خاصیتوں کو سائنٹفک زبان میں حس حیوانی (INSTINCT) کہتے ہیں۔ ان کی تعداد پچاس سے متجاوز ہے۔ مثلاً غصہ۔ غرور، خودغرضی، آرام طلبی۔ لڑائی بھڑائی، مذہب کی خدمت۔ ملک کی خدمت، خوف، گٹھے بنا کر رہنا سہنا وغیرہ وغیرہ۔ بیس سال سے میں بھی سائی کولوجی کی ریسرچ کر رہا ہوں۔ میں نے بھی چار یا پانچ حس حیوانی سائنس کی دریافت کے علاوہ دریافت کی ہیں۔

یہ حس حیوانی ہر شخص میں ہوتی ہیں کم یا زیادہ ہوتی ضرور ہیں، یعنی کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی سی "حس" بالکل غائب ہو۔

مثلاً "غرور" ایک حس حیوانی ہے۔ ہر شخص اپنی کسی نہ کسی بات پر مغرور ضرور ہے۔ کوئی اپنی دولت پر، کوئی اپنے حسن پر، کوئی اپنے علم پر، کوئی اپنی عقل اور قابلیت پر۔ یہ بات اور ہے کہ زید کم مغرور ہو اور بکر زیادہ۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ زید اپنی کسی چیز پر بالکل مغرور نہ ہو، یہاں تک کہ ایک گھسیارہ یہ سمجھتا ہے کہ جیسی گھاس میں کھودتا ہوں، اور کوئی نہیں کھود سکتا۔

میں نے اپنے تجربات میں اونچے تو اونچے، نیچے سے نیچے طبقے میں بھی غرور کی "حِس" بہت زیادہ پائی ہے۔ میں نے کئی تانگے والوں سے دریافت کیا ہے جن سے معلوم ہوا کہ جیسا تانگہ چلانا وہ جانتے ہیں دنیا میں کوئی نہیں جانتا۔ حلوائی بھی اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جیسی پوریاں وہ بناتے ہیں کرۂ زمین پر کوئی نہیں بنا سکتا۔ یہ غرور کی حسّ حیوانی کے متعلق میں نے مختصراً لکھا ہے۔

ایک اور مزے کی بات سنیئے۔ یہ اونچے طبقے کے متعلق ہے۔ بنجامن فرینکلن (Beniamin Franklin) امریکہ کے بڑے مشہور پریسیڈنٹ گزرے ہیں۔ ابتدا میں آپ بالکل معمولی آدمی تھے انہوں نے اپنی مفلسی کے زمانہ میں عہد کیا تھا کہ وہ کبھی غرور نہیں کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ میں اپنا غرور توڑنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا۔ مگر پھر بھی اس کو زائل نہیں کر سکا اور کچھ نہیں تو میں اسی بات پر مغرور رہا کہ "اب غرور نہیں کرتا" واقعی بالکل ٹھیک ہے۔ سائیکولوجی بالکل نیا سائنس ہے اگر پریسیڈنٹ زندہ ہوتے تو میں ان سے کہتا کہ امریکہ کا پریسیڈنٹ ہو جانے سے آپ حیوانیت کے دائرے سے نہیں نکل سکتے۔ غرور حس حیوانی میں داخل ہے، اس لیے آپ اس کو کم تو ضرور کر سکتے ہیں۔ مگر بالکل ختم نہیں کر سکتے۔ یہ بات آپ کے قبضۂ قدرت سے باہر ہے۔

"ضرورت"

انسان بہت سے کام ایسے کرتا ہے، جس کے پس پردہ کوئی نہ کوئی "حسّ حیوانی ضرور کام کرتی ہے۔ مگر یہ حسّ حیوانی صرف "خوردبین سے ہی نظر آ سکتی ہے۔ اگر ہم کسی کے طرزِ عمل کے متعلق دریافت کرنا چاہیں کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ پہلے یہ بات دریافت کریں کہ اس طرزِ عمل کے پس پردہ کونسی حسّ حیوانی کام کر رہی ہے۔ یہ نہایت گہرا سائنٹفک مضمون ہے ذرا اس کو زیادہ توجہ سے مطالعہ کیجیئے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس کو کئی کئی مرتبہ پڑھیئے۔ اگر ناظرین فردوس نے اسے از حد پسند کیا، تو میں کسی اور حسّ حیوانی کے متعلق پھر لکھونگا۔ آج یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر کسی نہ کسی حسّ حیوانی کو پورا کرنے کی خواہش پیدا

ہوتی ہی رہتی ہے۔ مگر چوں کہ ہم "مہذب" ہوگئے ہیں تجربہ کار ہیں اور تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے ہم اسے اپنے قدرتی جنگلی طور پر پورا نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے پورا کرنے میں ہم اور ہی ترکیبیں نکالتے ہیں۔ مثلاً دوسروں کا مذاق اڑانا اور دوسروں کی کھنچائی کرنا بھی حسِ حیوانی میں داخل ہے۔ اب اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہوا میں کسی راہ گیر کی ٹوپی اُڑ گئی اور گول شکل میں سڑک پر لڑکتی ہوئی جا رہی ہے تو ہم ہنسنے لگتے ہیں یا اگر کسی کی سائیکل کیچڑ میں پھسل جاتی ہے تو بجائے ہمدردی کرنے کے ۹۹ فی صدی لوگ ایسی کی تمسخر اڑانے کی حس بڑھی ہوئی ہے، اتنا ہنستے ہیں کہ پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔

ان کی نسبت سنجیدہ لوگ، اپنے تمسخر اڑانے کی حس سے مجبور ہو کر ہنسی مذاق کے فلم دیکھتے ہیں، اور اسی قسم کے افسانے یا ناول پڑھ کر اس "حس حیوانی" کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔

ناظر صاحب۔ کیا آپ کی عشق و محبت کی حس حیوانی دبی رہی۔ اور آپ نے عشقیہ ناول، افسانے اشعار اور دیوان پڑھ کر، یا اسی قسم کے فلم دیکھ کر اپنی اس "ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یا آج کل پورا کر رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ وہ نامی گرامی شعرا، جو ہجر اور وصل کے بے مثل اشعار کہتے ہیں، ان کی عشق و محبت "کی حس حیوانی" محبت کے اشعار اور دیوانوں کی شکل میں ظاہر ہو کر پوری ہوتی ہے۔ چوں کہ "حس حیوانی" کی تعداد پچاس سے متجاوز ہے، ان کا پورا حال تو آپ میری سائی کولوجی کی کتابوں میں پڑھیں گے، جو کچھ عرصے کے بعد انشاء اللہ شایع ہونی شروع ہوں گی۔ آج کی صحبت میں، میں صرف گلّے کی "حس حیوانی" کے متعلق لکھونگا۔

## گلّے کی حسِ حیوانی

"حس حیوانی" کی سائنٹیفک تعریف یہ ہے:۔

"حس حیوانی ایک موروثی رجحان طبیعت ہے، جو ہم کو، خاص حالات میں، خاص طریقے پر

عمل کرنے کو مجبور کرتی ہے"۔

ہم مہذّب لوگ اپنی ان "حسوں" کو اس طرح پورا نہیں کرتے، جس طرح ابتدائی انسان کیا کرتا تھا۔ بلکہ ہماری تعلیم، ہماری تہذیب، ہمارے تجربات اور ماحول نے ہم کو ان کے پورا کرنے کے بیشما اور راستے بتادیئے ہیں۔

غاروں میں رہنے والا ابتدائی انسان "گلّے" بنا کر جنگلوں میں اس طرح پھرا کرتا تھا جس طرح آج کل بھیڑیئے اور ہرن، ڈاروں میں، اِدھر سے اُدھر، اور اُدھر سے اِدھر کلیلیں کیا کرتے ہیں۔ فطرتاً انسان گلّے بنا کر رہنے کا عادی ہے۔ شیر، بلّی، لومڑیاں اکیلے رہتے ہیں۔ آج تک آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے محلّے کی، اور آس پاس کے بازاروں، گلیوں اور محلّوں کی بیس بیس، پچاس پچاس بلیاں مل کر پھر رہی ہوں۔ اس کے برخلاف، بھیڑیئے، ہاتھی، چیونٹیاں، ہرن مل کر رہتے ہیں۔ ان کے بڑے بڑے گلّے، اور بڑی بڑی ڈاریں ہوتی ہیں۔

پرندوں میں اُلّو، باز وغیرہ اکیلے رہتے ہیں۔ کونجوں، طوطوں اور کبوتروں کے جھلّر اور ٹکڑیاں آپ نے بارہا دیکھی ہوں گی۔

# فطرت انسانی

مل جُل کر ساتھ رہنے کی "حس حیوانی" ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم گلّے بنا کر رہیں اور کام اور ملکی یا قومی خدمات بھی گلّے بنا کر ہی انجام دیں۔ وہی تعلیم اور تہذیب سیکھ لینے کی وجہ سے، ہم وحشی انسان کی طرح تو گلّے بنا کر نہیں پھرا کرتے، بلکہ اپنی اس فطرت کو پورا کرنے کے لئے ہم نے اور طریقے ایجاد کر لئے ہیں۔ مثلاً ہم باغوں میں، محلّوں کے سروں پر "ٹکڑیاں" بنا کر بیٹھتے ہیں۔ راتوں کو مُرا "شعر و سخن" کی محفلیں سجانے کے بہانے اپنے گلّے پن کی فطرت کو پورا کرتے ہیں۔ کلبوں (clubs) میں بھی غور سے، دیکھنے پر یہی "گلّہ پن" نظر آسکتا ہے۔

دنیا میں جتنی سیاسی پارٹیاں ہیں، خواہ وہ اشتراکی ہوں، یا نازی یہ سب "گلّے" ہیں۔

**سلطان بابو:** تو پھر گھروں میں بیوی بچے "بی" گلے " ہوے - واقعی آپ کی منطقی طاقت بھی بہت بڑھی ہوئی ہے، آپ نے آدمی کو تو جانور بنا ہی دیا۔ ہم کو تو اس بات کا بھی یقین ہے کہ آپ جانور کو بھی آدمی بنا سکتے ہیں۔ بس جی بس۔ حاجی جی! مسٹر میمن، اب ہم سب جانور ہیں۔ یہ سوفا، یہ قالین، یہ میزیں، کرسیاں ہٹادو۔ اب یہ "تحقیقاتی" مجلس نہیں ہے۔ یہ تو گلہ ہے گلہ "!

میزوں کرسیوں کی یہاں کیا ضرورت ہے۔ جانور کہاں کرسیوں، میزوں پر بیٹھتے ہیں۔ چار کا کاسیٹ پھینک دو۔ جانور تو چائے اور کوکو دوا سمجھ کر سونگھ بھی نہیں سکتے۔ ارے بیرا! اب جو ہمارا "گلہ" بیٹھا کرے، تو "بالٹی" میں چار لا کر د۔ بالکل ٹھنڈی یا لاہونی چاہیئے۔ کیونکہ جانور گرم پانی نہیں پیا کرتے۔ ہم سب گائے بھینسوں کی طرح بالٹی میں منہ ڈال کر کوکو پیا کریں گے۔ بالٹی کی وجہ سے گلاسوں، پیالیوں، پلیٹوں، پرچوں کے دھونے، صاف کرنے اور ٹوٹنے کا جھگڑا بھی جاتا رہے گا..... ......"

**مسٹر میمن۔** - بابو میاں، اب آپ پھر خفا ہو گئے۔ ع

روئے زیبا ہو گیا مثل چقندر، دیکھئے!

کیا آپ جانتے ہیں کہ غصہ اور مزاج کا چڑچڑا پن بھی "حیوانی حسیں" ہیں۔

**مسٹر پولنس** " اچھا غصہ بھی "حس حیوانی" میں داخل ہے۔

**مسٹر میمن** - " بے شک، بے شک۔ جس طرح کتے غصے کی حالت میں کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ اسی "حس حیوانی" کے ماتحت انسان کے منہ سے کف جاری ہو جاتا ہے، کتوں کی طرح بھونکنے لگتا ہے، دانت پیستا ہے، یہ اُن لوگوں کی کیفیت ہو جاتی ہے جن کی غصے کی حس بہت بڑھی ہوئی ہے، اور جو لوگ زیادہ "مہذب" اور "سنجیدہ" ہیں، وہ اپنی خفگی اور غصے کے اظہار کے اور اور طریقے نکالتے ہیں۔ مثلاً جس سے وہ خفا ہو جاتے ہیں۔ اس کے متعلق وہ جھوٹی تہمتیں لگاتے ہیں۔ اُسے بدنام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُس پر جھوٹے مقدمے لگا.

لگا دیتے ہیں، اور جہاں تک اُن کے قبضہ قدرت میں ہوتا ہے، اُسے پریشان کرتے ہی رہتے ہیں۔

**حاجی اشفاق**۔ "بابو میاں، آپ کے غصے کی حسِ حیوانی" بہت بڑھی ہوئی ہے، آپ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ آپ جانور ہیں، جانور۔ اور ہم سب بھی جانور ہیں، اور ہماری طرح دنیا کے ڈیڑھ ارب انسان بھی جانور ہیں۔ اگر ہم فقط آپ کو ہی جانور کہیں، جب تو آپ بُرا مانیں، بلکہ بات بات پر خفا ہو کر، آپ خود اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ جس طرح درندوں کی یہ غصے کی حِس" بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے، اسی طرح آپ کی بھی بڑھی ہوئی ہے، آپ لاکھ غصیل سہی، پھر بھی، اگر آپ چاہیں، تو اپنی اس "حِس" کو کم کر سکتے ہیں ناگنوں کی طرح پھنپھنا کر اٹھنا جنگلی انسان کا کام تھا، وہ ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کو لہولہان کرتا رہتا تھا۔ آج کل۔ وہ کیفیت تو نہیں ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے، کہ مخالف کی بات کو سننا ہی نہیں چاہتے۔ مخالفت کا ایک لفظ منہ سے نکلا اور آپے سے باہر ہوگئے۔ چہرہ چقندر ہوگیا۔

**سلطان بابو**۔ بہت اچھا۔ بہت اچھا!! بہت بہتر! بہت بہتر!! میں نے اپنا غصہ چھوڑ دیا۔ ٹھنڈا سا دم لے کر آپ کی باتیں غور سے سنوں گا۔ آپ مجھے چینونٹی کہیں، مکڑی کہیں، مینڈک اور کیچوا کہیں، میرے سر آنکھوں پر، "آن پھنسے" کی یاحسین ہے۔ سب کچھ سنوں گا اور تیوری پر بل نہیں ڈالوں گا"

# ساتھ رہنا

کیا آپ کے "گلّے" میں مل کر ساتھ رہنے کی خواہش بہت بڑھی ہوئی ہے۔ تھوڑی بہت یہ ہر انسان کے اندر ہے ضرور۔ جب تک یہ خواہش خاطر خواہ پوری نہیں ہوتی، انسان بے کل سا رہتا ہے۔

مشہور سائی کولوجسٹ پروفیسر میک ڈوگل ( Pro, Medougal ) لکھتے ہیں۔

"وہ شخص جس میں یہ خواہش بہت بڑھی ہوئی ہے، جب وہ "گلے" کے ساتھ نہیں ہوتا تو اس کو کوئی خوشی بھی نصیب نہیں ہوتی، یعنی ان چیزوں میں بھی، کوئی دلچسپی نہیں لیتا، جو اس کو پسند ہیں، مثلاً وہ پہاڑوں کی سین سینری اور قدرتی مناظر کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ اگر تنہا ہو، تو اسے دریاؤں اور پہاڑوں کی سیر میں کچھ لطف نہیں آئے گا۔ اور اُس کی طبیعت کسی چیز کو ڈھونڈتی ہی رہے گی"

واقعی بات بھی یہی ہے، خواہ کوئی سی بھی ہو۔ اگر ہماری "حس حیوانی" پوری ہوجاتی ہے تو ہم کو خوشی حاصل ہوتی ہے، اور اگر وہ دبی رہتی ہے، تو ہمارے دل کی کلی مرجھائی رہتی ہے، کامیابی کے راستے میں، سب سے بڑی مشکلات جو حائل ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے، کہ ہم سائی کولوجی نہیں سمجھتے، اس کی مدد سے ہم بڑی آسانی سے، بہت جلد اور بہت بڑی ترقی کرسکتے ہیں۔

اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی شخص (مرد، عورت، یا بچہ) کوئی خاص قسم کا طرز عمل کیوں اختیار کرتا ہے، یا فلاں کام کیوں کررہا ہے۔ تو ہم کو چاہیئے کہ یہ دریافت کریں کہ اُس کی کونسی حس حیوانی اس کی تہ میں کام کررہی ہے۔

یہاں میں چند اور حیوانی خواہشات کے نام لکھتا ہوں، مگر ان کے متعلق مفصل صرف اسی صورت میں لکھ سکتا ہوں، جبکہ ناظرین کو ہر بار فردوس مجھ سے براہ راست سائی کولوجی پر اور مضامین لکھنے کے متعلق بذریعہ پوسٹ کارڈ خواہش ظاہر کریں۔ اگر آپ کی " ڈھونڈھنے اور معلوم کرنے" کی حس حیوانی آپ کو مجبور کرتی ہے، تو اسی منٹ مجھ کو پوسٹ کارڈ لکھئے۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ چونکہ سائی کولوجی کا سائنس بالکل نیا ہے، یعنی صرف بیس پچیس سال سے، اس نے سائنس ہونے کا درجہ حاصل کیا ہے، اس لئے آپ کا پوسٹ کارڈ آنے سے میں سمجھ جاؤں گا کہ ناظرین اس نئے سائنس کے متعلق بھی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

چند اور حیوانی حسیں یہ ہیں۔

(۱) خود اپنا بچاؤ کرنا۔

(۲) نیند

(۳) کھانا پینا۔

(۴) آرام

(۵) برتری (انسان چاہتا ہے کہ اپنی قسم کے لوگوں پر برتری حاصل کرے)

(۶) خوف

(۷) نام و نمود یعنی اپنے آپ کو دکھانا۔ (مور چاہتا ہے کہ آدمی اور جانور میری خوبصورتی کی تعریف کریں اور مجھ کو ناچتا ہوا دیکھیں۔)

# نقل کرنا

ریچھ چال۔ آپ کسی محفل میں، بیٹھ کر پانی مانگتے ہیں، آپ کی نقل میں اور لوگ بھی پیاس محسوس کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں بھئی ایک گلاس پانی اور دینا۔ آپ جیب سے گھڑی نکال کر وقت دیکھتے ہیں، تو اور لوگ بھی، جن کے پاس گھڑی ہوتی ہے، وقت دیکھنے لگتے ہیں۔ اور "برتری" کی حس حیوانی ان کو اس بات پر بھی مجبور کرتی ہے کہ آپ کی گھڑی کو غلط اور اپنی گھڑی کو صحیح بتائیں

ماں باپ نے آپ کو پالا، پوسا، پڑھایا، لکھایا، مگر اردو بولنا آپ نے نقل کرکے ہی سیکھا ہے۔ بچپن میں، جبکہ نہ آپ کی عقل ٹھکانے تھی، نہ حواس، اُس وقت کسی نے "مُم مُم" کہنا شروع کیا۔ آپ نے بھی اس آواز کی نقل کرنی شروع کر دی۔ یعنی آپ نے بھی کہنا شروع کر دیا "مُم مُم"۔ اسی طرح پھر کسی نے "ابا" "اماں" "پانی" کہا۔ آپ بھی ان آوازوں کی نقل کرنے لگے۔ پھر آگے چل کر جب آپ ذرا بڑے ہوئے، اور ذرا سا شعور پیدا ہو گیا۔ تو آپ سمجھنے بھی لگے کہ پانی کسے کہتے ہیں، اور ابا اماں سے کیا مطلب ہے۔ یہ بعد کی باتیں ہیں، پہلے تو آپ نے صرف نقل ہی کی تھی۔

میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ "بھیڑ چال" صرف بندروں ہی تک نہیں ہے بلکہ فطرت انسانی میں داخل ہے،

(۹) غصہ لڑائی بھڑائی

(۱۰) عزدناً خود آپ اپنے کو "سمجھا"

(۱۱) مرد کا عورت کی طرف، اور عورت کا مرد کی طرف رُجحان،

(۱۲) اگر کسی شخص میں نقصان پہنچانے کی طاقت ہے، تو اس سے دب جانا وغیرہ وغیرہ۔

(۱۳) تلاش کرنا۔ ڈھونڈنا سمجھنے کی کوشش کرنا۔

(۱۴) بچوں اور دیگر تعلق والوں سے محبت کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

## تبدیل کرنے کی ترکیب

جس شخص کو خواہ وہ بیٹا بیٹی ہو، رشتے دار ہو، دوست ہو، خریدار یا گاہک ہو، آقا یا ملازم ہو، یا اگر ہم لیڈر ہیں تو عوام کے متعلق بھی یہی بات سمجھنی چاہیئے۔ یعنی جس شخص کو، یا ہزاروں، لاکھوں آدمیوں کو ہم بدلنا چاہیں، تو سب سے پہلے ہم کو یہ سوچنا چاہیئے کہ اُن کے موجودہ طرز عمل کے پس پردہ، کون کون سی "حیوانی حسیں" کام کر رہی ہیں۔ پھر ان میں سے بھی، سب سے بڑی "حس" کونسی ہے۔

اگر آپ خود اپنے کو، یا کسی اور کو، اس کے موجودہ "گلّے" سے علیحدہ کرنا چاہیں، تو سب سے پہلے یہ سوچیئے کہ آپ خود، یا اگر کوئی اور ہیں، تو وہ فلاں "گلّے" میں شامل "کیوں ہیں۔ یعنی کون سی حس حیوانی مجبور کر رہی ہے۔ کہ اُس گلّے میں شامل رہیں۔ جب آپ یہ بات سمجھ جائیں گے، تو آپ خود اپنے کو یا دوسروں کو "غلط گلّے" سے بچا سکتے ہیں۔ مثلاً خود آپ اپنے کو "سمجھا" سکتے ہیں، کہ میں اُس "گلّے" میں فلاں "حسِ حیوانی" سے مجبور ہو کر شامل ہوں۔ اور یہ غلط ہے۔ اس لئے مجھ کو "اُس حسِ حیوانی" کو کم کرنا چاہیئے، تاکہ موجودہ گلّہ مجھ سے چھوٹ جائے۔

## دُوسرے گلّے میں شامل ہونا از حد ضروری ہے

انسان چونکہ گلّے کا جانور ہے (جانوروں میں بابو میاں بھی شامل ہیں) اس لئے یہ نہیں

ہوسکتا کہ وہ ہر قسم کا گلہ چھوڑ دے۔ اور کسی گلے سے تعلق نہ رکھے۔

سلطان بالو۔ "جی دم مارنے کی جگہ نہیں، میں تو پہلے ہی عہد کر چکا ہوں کہ آپ کے "گلے" میں ...... میں بے زبان جانوروں، بھیڑوں کی طرح چپ بیٹھوں گا۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ آدمی میں بھیڑ چال ہے۔ اس لئے میں نے بھیڑوں ہی کی نقل کر لی ہے۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ آدمی میں "اعتراض" کرنے کی بھی مرض "حسِ حیوانی" ہے، یا نہیں۔ میرے خیال میں تو ہے۔ کیونکہ میں "اعتراض کرنے کی حسِ حیوانی" سے اس وقت مجبور ہو رہا ہوں۔ اور آپ سے یہ دریافت کرتا ہوں۔ کہ بھیڑیں ہماری نقل کیوں نہیں کرتیں۔ اور آپ کی نقل میں فاؤنٹین پن سے کیوں نہیں لکھتیں؟"

مسٹر میمن "بات یہ ہے کہ "حسِ حیوانی" اور "عقل" میں زمین و آسمان کا فرق ہے معمولی جانوروں میں فقط "حسِ حیوانی" ہے۔ اور انسان جانوروں میں "عقل" بھی ہے"

حاجی اشفاق۔ "اچھا تو پھر ہم خود اپنا، یا کسی دوسرے کا قابلِ اعتراض گلہ چھڑانا چاہیں، تو خود اپنے لئے یا دوسرے کے لئے اس سے بہتر گلے کا انتخاب کریں۔ ......"

مسٹر میمن۔ "اور آہستہ آہستہ، پہلے گلے کو ترک کرتے ہوئے، دوسرے بہتر گلے میں شامل ہو جائیں" بے شک یہ بالکل ٹھیک ہے۔ مگر یہ خیال رہے، کہ دوسرے گلے میں شامل ہونے سے پہلے ہم کو اپنے خیالات، اطوار، یہاں تک کہ لباس بھی، دوسرے گلے کے لوگوں کے مطابق کرنا چاہیئے۔ فرض کیجئے آپ مذہبی رہنماؤں کے زمرے میں شامل ہونا چاہتے ہیں، اس صورت میں آپ کو ڈاڑھی رکھنی چاہیئے، لمبا کرتہ، عبا، قبا، عمامہ اور اور اسی قسم کے لوازمات مہیا کرنے چاہئیں۔ اگر یہ چیزیں نہیں ہوں گی، یعنی آپ کا ظاہر لباس، شکل و صورت اور خیالات، علما جیسے نہیں ہوں گے، تو بہ حیثیت پُر جوش "ممبر" آپ اُن کے زمرے میں شامل نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح ناچ رنگ، کھیل کود، چرند م خورندم، کار و بار سیاسی اور اور بیسیوں "گلوں" میں شمولیت کے لئے ہم کو ویسے کو ویسا بننا ہی پڑے گا۔

جب ہم ایک گلے کو چھوڑ کر، دوسرے گلے میں شامل ہوتے ہیں، تو پہلے گلے والوں کی انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں کہ او ہو، یہ تو "وہی آدمی ہیں" مگر ان پر کسی نے روغن قاز مل دیا ہے۔

جب تک ہم اپنے رجحان طبع کے مطابق کسی گلے میں شامل نہیں ہوتے، تو ہماری زندگی بے چین سی رہتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر وقت ہمارے سر پر انکس لٹک رہا ہے۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رجحان طبع کا تبدیل کرنا، ہنسی کھیل نہیں ہے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ہماری طبیعت دو تین مختلف مشاغل کی طرف مائل ہوتی ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ کھانے پینے کے معاملے میں ہم معدی کرب کے جانشین ہیں، اور اس "چرندم خورندم" کی حسِ حیوانی سے مجبور ہو کر ہم ایسے کوٹھوں پر بیٹھتے ہیں، یا اس قسم کے گلوں میں شامل ہوتے ہیں، جہاں آئے دن کچھ نہ کچھ پیٹ کی دوزخ بھرنے کا سامان ہوتا ہی رہتا ہے۔ اگر دیگ نہیں تو دیگچیاں تو ہر وقت کھڑکتی ہی رہتی ہیں، اور کچھ نہیں تو یہی سہی "کبھی آج سب مل کر روٹی کھائیں گے۔ اپنے اپنے گھر سے کھانا لیتے آنا"

فرض کیجئے، آپ نے سوچا کہ اس طرح گھنٹے دو گھنٹے کی تفریح کی بجائے، بعض اوقات آدھا آدھا، یا سارا سارا دن ضایع ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح کام کا حرج ہوتا ہے، اور آمدنی کم ہوتی ہے۔ تو آپ کو یہ چاہیئے کہ اپنی اس چرندم خورندم کی حسِ حیوانی کو جاری رکھئے مگر اس کے طریقہ پلٹ دیجئے۔ اپنا وقت بچایئے اور اس طرح اپنی آمدنی بڑھایئے۔ اپنے پُرانے "گلے" پر لعنت بھیج دیجئے۔ اور شام کو روزانہ، یا ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ، کسی اچھے ہوٹل میں چلے جایا کیجئے۔ یہاں ہفتہ دو ہفتہ میں کچھ ایسے لوگ ملنے لگیں گے، جو آپ کے دوست بھی ہو جائیں گے۔ اور ہوٹل کی وجہ سے چرندم خورندم کا شغل بھی جاری رہے گا۔ آپ کی حسِ حیوانی بھی پوری ہوتی رہے گی، اور جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق ہے، آپ کا پُرانا گلہ اس طرح غائب ہو جائے گا۔ جیسے گدھے کے سر پر سے سینگ۔ اپنی زندگی کو غلط "گلوں" کی بھینٹ نہ چڑھایئے۔ کیونکہ گلے صحیح ہوں، یا غلط، ان کی دھن ایسی ہوتی ہے، کہ گلوں میں شامل ہونے کے لئے آدمی بیتاب ہو جاتا ہے۔

گلّے کے سردار کی ہم تقریباً ہر بات میں پیروی کرنی چاہتے ہیں۔ آدمی بھوکا ہو، یا پیاسا، لوٹ لوٹ کرتا۔ اپنے گلّے میں جا شامل ہوتا ہے، اور سردار کا حکم بجا لاتا ہے۔ لباس میں، بات چیت میں۔ آؤ بھگت میں، ہر طرح کے برتاؤ میں، سردار کی پیروی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ سب باتیں میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اگر آپ کسی گلّے میں شامل ہوں اور وہ غلط ہو، تو آپ اندھیرے میں نہ ٹٹولتے رہیں۔

سردار کا حکم، غلط ہو یا صحیح، ہم بلا چون وچرا مانتے ہیں۔ چونکہ مذہبی خدمت اور ملک کی خدمت بھی فطرت انسانی میں شامل ہیں۔ اس لئے یہ بات زیادہ تر مذہبی اور سیاسی جماعتوں میں دیکھی جاتی ہے، سردار نے حکم دیا کل صبح ساڑھے چھ بجے آجانا۔ بہت بہتر۔

ماں بیمار ہیں "بیٹا ذرا مجھے سونف خمیرہ دیتا جا"

بیٹے نہیں سنتے۔ یہ جا وہ جا۔ ماں کے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا۔ دن بھر سردار کی یا سردار کے حکم کی ٹہل کرتے رہے، شام کو خالی ہاتھ گھر میں گھسے۔ بیوی ہاتھ تکتی کی تکتی رہ گئیں۔ اپنی ہوں یا پرائی حیوانی حسوں کو سمجھنے کے لئے، کہ ہم، یا زید، بکر، عمر، خالد، کون کون سی حسوں کے ماتحت کام کر رہے ہیں ہم کو عقل بھی استعمال کرنی چاہیئے اور زبردست مشاہدہ بھی کرنا چاہیئے۔

خیال رہے۔ کہ صرف یونہی سرسری طور پر دیکھنے اور گہرا مشاہدہ کرنے میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ گہرے مشاہدہ سے ہم فطرت انسانی کا بہت اچھی طرح حال معلوم کر سکتے ہیں۔ مگر مشاہدے کے ساتھ ساتھ، ہم کو عقل بھی استعمال کرنی چاہیئے۔

## عقل

عقل کیا چیز ہے؟ یہ سونا نہیں ہے۔ بلکہ کندن ہے کندن۔ سارے جہان میں اس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ آڑے وقت میں کام آتی ہے، مصیبتوں سے نجات دلاتی ہے۔ انسانوں کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ مگر عقل کے متعلق یہ عجیب بات ہے کہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہ خزانہ میرے پاس ہے۔ حالانکہ اکثر حالتوں

میں، ان کو عقل سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔

آنجہانی امریکی ارب پتی مسٹر انڈریو کارنیگی (Mr Andrew Carnegie) لکھتے ہیں کہ

"معمولی عقل بڑی غیر معمولی چیز ہے"

پھر یہیں تک نہیں بلکہ ہر شخص یہ بھی سمجھتا ہے کہ عقل موروثی ہوتی ہے، اور میری طرح میرا بچہ بھی بڑا عقلمند ہے۔ عقل کے متعلق میں روپیہ میگزین بابت فروری ۱۹۴۹ء سے، ایک چھوٹا سا پیرگراف نقل کرتا ہوں

"ہر شخص خیال کرتا ہے، کہ اُس کا بچہ بڑا عقلمند ہے، مگر جب وہ بڑا ہو جاتا ہے اور بالکل بے وقوف اٹھتا ہے، اس وقت باپ کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ عقل موروثی نہیں ہوتی۔

سائی کولوجی ہم کو بتاتی ہے کہ جس تھوڑی بہت عقل کے ساتھ ہم پیدا ہوئے ہیں، اگر اس کو بڑھائیں گے، یعنی اُس سے کام لیں گے، تو وہ بڑھتی ہی جائیگی۔ اور اگر کام نہیں لیں گے تو اُس کو زنگ لگنا شروع ہو جائے گا۔

کسی بچے کی آنکھیں، ناک، نقشہ، جسمانی طاقت، موروثی ہو سکتی ہے مگر استقلال، ایمانداری، یا بے ایمانی، اچھائی یا برائی، محنت کرنا یا کام سے جی چرانا موروثی نہیں ہو سکتا۔ بالکل اسی طرح عقل بھی موروثی نہیں ہو سکتی"

میرا مطلب یہ ہے کہ نفس ہم کو دھوکا دے سکتا ہے، اور ہم کو کئی وجوہات سے یہ بات سمجھا سکتا ہے کہ ہم فلاں باپ کے بیٹے ہیں، یا ہم فلاں عالی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا ہم اس قدر زبردست تعلیم یافتہ ہیں۔ اس لئے عقلمند بھی ہیں۔ یاد رکھئے تعلیم اور عقل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ ممکن ہے کہ ہم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں، اور عقلمند نہ ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم بے پڑھے لکھے ہوں، یا جاہل مطلق ہوں، مگر ہمارا دماغ زیادہ طاقتور ہو، اور ہم باوجود جاہل ہونے کے بڑے

عقلمند بھی ہوں، یہ پڑھنے کے بعد خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے، کہ حیوانی حسوں کو پہچاننے کے لئے، خواہ وہ اپنی ہوں یا دوسروں کی ہوں، آپ کو نقلی نہیں، بلکہ اصلی عقل استعمال کرنی پڑیگی۔

## ہم گلّے کے سردار کی رائے کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں

اگر ہمارے گلّے کا سردار اُلٹی بات بھی کہے تو ہم کو سیدھی معلوم ہوتی ہے۔ اور ہم آمنا وصدقنا، واہ واہ اور سبحان اللہ کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر ہمارے گلّے کا مخالف سردار کیسی بھی سیدھی بات کہے، ہمارے فائدے کی بات ہم کو سمجھائے، تو وہ ہم کو بے تُکی، غلط اور اُلٹی معلوم ہوتی ہے۔ ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے، اور ہمارا دل ذرا بھی نہیں پسیجتا۔

## گلّے کا ڈر

ہم بہت سے کام گلّے کے ڈر کی وجہ سے نہیں کرتے۔ مثلاً بے شمار لوگ جو سنیما نہیں دیکھتے، اور یہ ظاہر کرتے ہیں، کہ گناہ ہے۔ اِن ہی میں بہت سے ایسے ہیں، جو خدا کے خوف سے نہیں، بلکہ "گلّے" کے ڈر سے، تفریحات کا رخ نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اصل حقیقت کا اظہار وہ کبھی بھی نہیں کریں گے۔

بہت سے لوگوں کا جی چاہتا ہے کہ وہ کوٹ، پتلون پہنیں، ٹائی کالر لگا کر نقلی جنٹلمین بن جائیں، مگر اُن کے گلّے کا رواج ان کو مجبور کرتا ہے کہ لمبا کرتہ پہنیں۔ اور بڑی سی پگڑی باندھیں۔

بظاہر وہ کوٹ پتلون کی برائی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بُرا سمجھ کر وہ اس لباس کو اختیار نہیں کرتے۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس لباس کو دل سے بُرا نہیں سمجھتے۔ بلکہ گلّے کے ڈر سے خود استعمال نہیں کرتے۔

# گلّے کے رسم ورواج

ہم گلّے کے رسم ورواج کی بھی پابندی کرتے ہیں۔ مثلاً اگر آج آپ کی، آپ کی خالا صاحبہ سے ملاقات ہو، تو آپ صرف سلام علیکم کہیں گے۔ اس کے برخلاف اگر کسی بنگالی بابو صاحب کی خالہ سے ملاقات ہو، تو وہ اُن کے پاؤں چھوئیں گے۔ کیونکہ ان کے گلّے کا رواج یہی ہے۔ اگر وہ پاؤں نہ چھوئیں، تو یہ بڑی بُری بات ہے۔ آپ کے گلّے میں پاؤں نہ چھونا کوئی بُری بات نہیں ہے۔

آپ کے صاحبزادے کی شادی ہو، تو آپ براتیوں کو قورمہ اور بریانی کھلوائیں گے، کیونکہ آپ کے گلّے کا رواج یہی ہے۔ مگر ایک بنیہ کے ہاں اگر شادی ہو، تو یہی گوشت کھلانا بڑے عیب کی بات ہے۔

بہت سے گناہ اور عیب ہم "گلّے" کے ڈر سے نہیں کرتے، مگر ظاہر یہ کرتے ہیں کہ ہم خدا سے ڈرتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ یہ اللہ میاں کو دھوکا دینا ہے۔ وہ عالم القلوب ہے، وہ جانتا ہے کہ تم یہ گناہ میرے ڈر سے نہیں کرتے۔ "گلّے" کے ڈر سے کرتے ہو۔ کام وہی ہے، مگر چونکہ "گلّے" کا ڈر تھا، اس لئے، جنت دوزخ بن جاتی ہے۔ اور اگر ہم غیر اللہ کا ڈر دل سے نکال دیں، اور کسی فرد سے، یا "گلّے" سے مطلق خوف نہ کھائیں، تو دوزخ کے بدلے جنت ہماری میراث ہو جاتی ہے!

# گلّے کے ڈر کی وجہ سے فضول خرچی

جس کے پاس نہیں پیسا۔ وُہ بھلا مانس کیسا؟ یہ پُرانی مثل ہے۔ ہم مسلمانوں میں فضول خرچی کی بیماری نے وبا کی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ پیسے کو پھینکنے میں اور برباد کرنے میں اپنی "عزت" سمجھتے ہیں۔ روپے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں، حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں:-

قرار درکفِ آزادگاں ، نگیرد مال

نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

(آزاد لوگوں کی ہتھیلی میں مال کو قرار نہیں رہ سکتا۔ جس طرح عاشق کے دل میں۔ صبر نہیں ہوتا، اور چھلنی میں پانی نہیں ٹھیر سکتا۔)

ہم مسلمانوں کی عموماً یہ کیفیت ہے کہ ادھر روپیہ آیا اور اُدھر بہایا۔ گویا، کوئی دشمن گھس آیا تھا، اور اُس کو دھکا دے کر نکال دیا ہے۔ ہم ایسے لوگوں سے ذاتی طور پر واقف ہیں، جو، ہر بیٹے یا بیٹی کی شادی پر ہزار ہا روپیہ خرچ کرتے تھے، اور آج کل پھٹے ہوئے لیترڑے پیروں میں گھسیٹتے پھرتے ہیں، اور کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو۔

یہ وہ لوگ ہیں، جن کا "گھلے" کے ڈر کی وجہ سے دم نکلتا تھا۔ باپ دادا کی کمائی جائدادیں رہن کرتے تھے، اور چار دن کی چاندنی چٹکاتے تھے، اور پھر وُہی کی وہی اندھیری رات ہو جاتی تھی۔

قرض کی پیتے تھے مے اور کہتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

گلے کے ڈر کی ایک عجیب مثال میں آپ کو سناؤں میرے بچپن میں ایک ماما ہمارے گھر میں کھانا پکانے آیا کرتی تھی۔ یہ سقنی تھیں۔ صبح کو بلا ناغہ ان کا یہ ڈیڑھ میل کا سفر تھا۔ عمر رسیدہ تھیں۔ دوپہر کو اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ واپس چلی جاتی تھیں۔ ہمارے میں برستی ہوں یا چلچلاتی دھوپ ہو اُن کے اس معمول میں فرق نہیں آتا تھا۔ حق یہ ہے کہ اس عمر میں ایسی غضب کی محنتی عورت نہ دیکھی نہ سُنی۔

قضاءِ عند اللہ اُن کی لڑکی کی شادی ہونے والی تھی۔ برادری، یعنی گلے میں ناک نہ کٹے۔ اس لئے انہوں نے اپنا بھی چاندی کا توم چھلّہ خال سے لگایا اور نیوتہ ڈال کر ڈھائی سو روپے قرض نکالے۔ سقوں کی برادری میں دو چار دن کی واہ واہ ہو گئی ہوگی۔ کیونکہ انہوں نے اپنی ناک کٹوانے کے بدلے سر منڈا لیا تھا۔

مگر اس کے بعد جو اُن پر قرض کی بپتا پڑی، اُس کو ان کا دم ہی جانتا تھا۔ بے چاری نے نہ تن کو دیا نہ پیٹ کو۔ محنت مزدوری، تیری میری ٹہل کرنا اور قرضہ بھگتانا۔ آخر کئی سال تک پاپڑ بیلنے کے بعد، یہ قرض کی دنیا کی مصیبت اور آخرت کا عذاب اُن کے سر سے اُترا۔ اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ پہاڑ کا بوجھ صرف اس لئے اٹھایا، کہ دو دو روٹیاں اپنے "گلے" کو کھلا کر اپنی ناک بچالیں۔

کیا آپ کے بیٹا، بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ خیال رکھئے کہ کہیں "گلے" کے ڈر سے قرض کی مصیبت سر پر نہ چڑھ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو آپ کی آدھی جان رہ جائے گی۔

# گلّے کے متعلق ایک اور نکتہ

یہ ممکن ہے کہ ایک شخص تمام عمر ایک پارٹی میں، یا ایک دفتر میں کام کرتا رہے، مگر اس گلّے کا ممبر نہ ہو، کیونکہ ایک شخص صرف اسی صورت میں گلّے میں شامل ہوتا ہے، جبکہ گلّے میں اُسی کی قسم کے آدمی ہوں۔

فرض کیجئے ایک شخص پوسٹ آفس میں ملازمت کرتے ہیں، مگر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ڈاک خانے کے گلّے کے ممبر نہ ہوں۔ یا فرض کیجئے، ایک صاحب، کسی سیاسی پارٹی میں، عرصہ دراز سے بہ حیثیت والنیٹر کام کرتے ہوں، اپنے کام کے شام کو پیسے لے لیتے ہوں اور گھر چلے آتے ہوں۔ اُن کی دلی ہمدردی اس کام میں شامل نہ ہو۔ تو یہ اُس "گلّے" کے ممبر نہیں ہیں۔

گلّے میں شامل ہونے کی شناخت یہ ہے کہ جس گلّے میں ہم شامل ہوں، اگر اُس کو کوئی نقصان ہو جائے، یا کسی معاملے میں اس کو شکست ہو جائے یا کوئی اس کی بے عزتی کرے، اور ٹی۔ پی۔ لی کر دے تو ہم کو دلی تکلیف ہو۔

(حقوق محفوظ)

ایس۔ اے۔ خالق
ایڈیٹر ہندوستانی میگزین دہلی

# نشاطِ گرداب

کشتی کو بھنور میں گھرنے دے موجوں کے تھپیڑے سہنے دے
زندوں میں اگر جینا ہے تجھے طوفان کی ہلچل رہنے دے

دھارے کے موافق بہنا کیا توہینِ دست و بازو ہے
پروردۂ طوفاں کشتی کو دھارے کے مخالف بہنے دے

اے جوشِ تمنّا ڈال بھی دے امروز کی گردن میں باہیں
جو محوِ غمِ فردا ہیں انہیں، محوِ غمِ فردا رہنے دے

مچھلی کی طرح تڑپائے گا احساس تجھے پایابی کا
جینا ہے تو اپنے دریا میں امکانِ تلاطم رہنے دے

کچھ اور حسیں ہو جاتے ہیں اس روپ میں وہ اے ذوقِ نظر
اُس پیاز ی پیازی مکھڑے پر اشکوں کے ستارے بہنے دے

وہ دیکھ اُفق کے ساقی نے خورشید کا ساغر چھلکایا
یہ رات کے ساغر ٹکڑے کر یہ بادۂ دوشیں پینے دے

ساغر نظامی

# آنریبل مسٹر فضل الرحمٰن

آنریبل مسٹر فضل الرحمٰن کے پاس حکومت پاکستان کے چار محکمے ہیں۔ تعلیم۔ صنعت۔ تجارت اور تعمیرات۔ چاروں محکموں کو جس خوش اسلوبی سے آنریبل مسٹر فضل الرحمٰن نے سنبھال رکھا ہے اس کی الفاظ میں تعریف نہیں ہوسکتی۔ ایک وزیر کا چار محکمے چلانا آسان کام نہیں ہے۔

آنریبل مسٹر فضل الرحمٰن صبح، بہت سویرے سے اپنے مکان پر کام شروع کر دیتے ہیں۔ اور ساڑھے دس بجے دفتر پہنچ جاتے ہیں۔ اور شام کے سات آٹھ بجے تک بالعموم دفتر میں رہتے ہیں۔ رمضان المبارک میں بھی اس پروگرام میں فرق نہیں آتا۔ آنریبل مسٹر فضل الرحمٰن نہایت مذہبی آدمی ہیں۔ نماز روزے اور تمام اوامر کے سختی کے ساتھ پابند۔ قرآن خوانی کے عموماً شایق ــــ پھر رمضان المبارک میں آپ کی یہ مصروفیتیں کتنی بڑھ جانی چاہئیں۔ لیکن وزارت کے فرائض کی انجام دہی بھی وہ عبادت سمجھتے ہیں۔ اور یہ عبادت رمضان المبارک میں کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ جب دورہ پر تشریف لے جاتے ہیں تو رات کے بارہ بارہ بجے تک آرام نہیں لیتے۔ ایک دفعہ شام کے پانچ بجے میز پر سر رکھ دیا۔ معلوم ہوا۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔ کہا گیا۔ مکان چلے جائیے۔ اس کا جواب نہیں دیا۔ اور فرمایا "ضروری کاغذات جلد پیش کرو" چنانچہ ڈیڑھ گھنٹے اور ٹھہرے اور کام ختم کر کے ہی تشریف لے گئے۔

ہر بات کو غور سے سنتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اسے یاد رکھتے ہیں اور ذہن سے اترنے نہیں دیتے۔ لکیر کے فقیر نہیں ہیں۔ کام کے نئے نئے طریقے نکالتے ہیں۔ عملہ کی رشوت خواری اور بداطواری کو روکنے کے لئے سپیشل پولیس کا تقرر آپ ہی نے شروع کیا تھا۔ ایسے آدمی کو جس کی دیانت اور ایمانداری کے متعلق شبہ ہو آپ برداشت نہیں کر سکتے۔ غریب کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتے ہیں۔ مالدار کو خاطر میں نہیں لاتے۔ لیکن برا کسی کا نہیں چاہتے۔ دل کے صاف اور خدا ترس انسان ہیں۔

اردو بولنے کی مشق نہیں ہے۔ لیکن اردو ہی بولتے ہیں۔ اور اردو بولتے وقت انگریزی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کرتے۔ صحیح اردو نہ بول سکنے کی خامی کو محسوس کرتے ہیں۔ اور کوشاں ہیں کہ صحیح اردو بولنے لگیں۔ آج کل عربی زبان سیکھ رہے ہیں۔

سادہ لباس پہنتے ہیں۔ سگریٹ نہیں پیتے۔ پان نہیں کھاتے۔ سر کے بالوں کی آراستگی کا خیال نہیں ہے۔ ہاں باغ کو سنوارنے کا شوق ہے۔ لوگوں سے ملاقات کرنے میں بخل نہیں کرتے۔ اور ہر ملاقاتی کو محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی ملاقات انہیں ناگوار نہیں گزری۔ عملے کے چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بات کرتے ہیں اور اس کی جائز مدد کو تیار رہتے ہیں۔

سید فرید احمد دہلوی

---

# مناجاتِ مقبول

دیوبند ضلع سہارنپور کی طرف پچھلے سو سال کے اندر کئی بڑے ذی علم اور خدا شناس بزرگ پیدا ہوئے تھے۔ ان ہی میں ایک مناجاتِ مقبول کے مؤلف حکیم الامت مجدد ملت حضرت علامہ اشرف علی صاحب تھانوی ہیں۔ مناجاتِ مقبول دو سو سے زیادہ دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ چالیس قرآنی دعائیں ہیں۔ باقی حدیثی۔ حضرت تھانویؒ کی تمام کتابیں مشہور و معروف ہیں۔ یہ کتاب بھی پہلے غالباً کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ اب کے اسے حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، مدیر صدق لکھنؤ نے اردو ترجمہ پر نظر ثانی کر کے اور توضیحی حاشیے بڑھا کر شایع فرمایا ہے اور بالکل نیا کر دیا ہے۔ ایک دوسرے زندہ بزرگ کے حوالے سے اس میں ایک اور جامع حدیثی دعا بھی شامل کی گئی ہے۔ آخر میں مثنوی مولانا رومؒ سے سات حزب، سات دنوں کی مناسبت سے منقول ہیں، کاغذ، لکھائی، چھپائی ٹھیک ہے۔ چھوٹے سائز کے ایک سو چھیاسٹھ ۱۶۶ صفحے ہیں۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

ملنے کا پتہ

**صدق بک ایجنسی۔ مرشد آباد بلڈنگ۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ (ہند)**

# کلام شاد

(۱)

مانگی دعا تھی "دہر میں آجائے انقلاب"
قدرت پکاری "دیکھ تماشائے انقلاب"
کیا انقلاب خون کے آنسو رُلا گیا
پیدا ہے قطرے قطرے سے دریائے انقلاب
یہ انقلاب ہے کہ خدا کا غضب ہے یہ
ہر ذرّہ کی زبان پہ ہے۔ ہائے انقلاب
جھپکی نظر کہ پھول کو کانٹا بنا دیا
کیا گل کھلائے تو نے یہ اے وائے انقلاب
عیش و نشاط۔ رنج و بلا سے بدل نہ جائیں
کچھ کہہ رہا تھا مجھ سے تقاضائے انقلاب
انسانیت بہی خس و خاشاک کی طرح
آیا ذرا تھا جوش میں دریائے انقلاب
اپنے پرائے کر دیئے اس انقلاب نے
ایسے تو انقلاب میں آجائے انقلاب
ہوش و خرد کے ساتھ ہی دیوانگی بڑھی
کہتے ہیں اس کو شاد تماشائے انقلاب

(۲)

تھے جو زمیں پہ کل بھی۔ وہی آسماں ہیں آج
لیکن جو دُور دور سے تھے کل تک کہاں ہیں آج

اللہ! اس چمن کو نظر کس کی کھا گئی
ہر سمت یہ جو اُجڑے پڑے آشیاں ہیں آج

الجھے ہوئے ہیں کانٹوں میں فردا کا غم نہیں
باغ جہاں میں وہ چمن آرائیاں ہیں آج

وہ صورتیں، وہ شکلیں، وہ باوضع ہستیاں
آنکھوں کے سامنے تھیں جو کل تک کہاں ہیں آج

ہائے وہ باغ جس میں چہکتی تھیں بلبلیں
زاغ و زغن کے چند وہاں آشیاں ہیں آج

کل کچھ نگاہ اور تھی کل اور بات تھی
اب وہ ہیں میں ہوں اور مرے امتحاں ہیں آج

اے تیرِ نالہ توڑ کے ساتوں طبق نکل
کمبخت سدِّ راہ ترے آسماں ہیں آج

ہجراں نصیب کون ہوا ہے شریک راہ
سو آفتیں رواں جو سوئے کارواں ہیں آج

اے شادؔ اپنے دل پہ نہ کیوں مجھ کو ناز ہو
ارمان اُس کے دل میں مرے میہماں ہیں آج

---

مُرلی دھر شادؔ

زبیدہ دس برس کی جان کا ماں کے سایۂ تربیت سے محروم ہو جانا چھوٹی بچی کے لئے صدمہ جانکاہ سے کم ثابت نہ ہوا۔ گلاب کی طرح کھلا کھلا چہرہ۔ گوری رنگت۔ گول گدرایا ہوا جسم۔ نیلی چمکیلی آنکھیں چلبلاپن ایک بات بھی نہ رہی۔ باپ ماں کی زندگی میں ہی زبیدہ سے بڑی محبت کرتا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد اور زیادہ جان چھڑکنے لگا۔ دس برس کی عمر کیا ہوتی ہے کھیلنے کودنے گڑیے لگانے کے دن۔ مگر پانچ چھوٹے بھائی بہن۔ چھٹا باپ چھ سات کے کھانے پکانے کا فکر اس ننھی سی جان پر آپڑا۔ باپ انگریزی دفتر میں نوکر تھا۔ تین بھائی بہن اسکول جاتے تھے سب کو وقت پر جانا ضرور۔ تاروں کی چھاؤں اٹھ بیٹھتی۔ سب کھا پی کر رخصت ہو لیتے تو چھوٹے بہن بھائیوں کا سینا پرونا۔ ایمان نگلا نہیں جاتا اس ننھی سی جان نے گھر کو سنبھالا اور ایسا سنبھالا کہ سب چھوٹے بڑے عش عش کرتے تھے۔ باپ نے اپنے دم کو دم نہ سمجھا۔ شادی کیسی شادی کے نام سے جلتا تھا۔ ان ہی بچوں کی پرورش میں نہ صبح دیکھنا نہ شام۔ چھ سات گھنٹے دفتر میں کام کرتا۔ دفتر سے چھوٹتا لڑکوں کو پڑھاتا۔ دکانوں پر چٹھیاں لکھتا۔ حساب کتاب کرتا۔ سرکاری پرچیا کر رکھا تھا۔ یہ دن یونہی گزر جاتے تو بھی غنیمت تھا۔ دس برس کے اندر اندر سب بچے پروان چڑھ جاتے۔ بڑے بچوں کی شادی ہو جاتی، چلو باپ کو کچھ راحت کا سانس لینا نصیب ہوتا۔ لیکن نصیب ہوتا تو کیونکر ہوتا۔ آسمان کا کلیجہ ابھی ٹھنڈا کہاں ہوا تھا۔ تقدیر کے نوشتے ابھی انقلاب چاہتے تھے۔ ماں کا مرنا، چھوٹے بہن بھائیوں کی پرورش۔ غربت میں صبر و شکر سے روٹی کھا کر پڑ رہنا ہی کون سے راحت کے دن تھے۔ مگر نوشتے ابھی پورے ہونے باقی تھے۔ قسمت کا چکر خانماں بربادی سے بڑھ کر اس مصیبت کو دعوت دے رہا تھا جس پر گھر کی چار دیواری میں صبر و شکر سے دن گزارنے والی بیویاں موت کی تمنا

کیا کرتی ہیں۔ زمانہ کے نرم گرم دنوں سے انجان زبیدہ واقف نہ تھی۔ ابھی سولھویں برس میں تھی کہ ہندوستان میں تقسیم کا انقلاب عظیم بروئے کار آیا۔ اور خانہ بربادی۔ بے گھری۔ قتل و غارت گری آبروریزی ساتھ لایا۔ ایک ہی شہر میں مدتوں کے رہنے والے وقت پڑنے پر ایسی آنکھیں بدل گئے گویا کبھی کے شناسا تھے ہی نہیں۔

شکل و صورت میں انسان لیکن سفاکی اور بے باکی میں درندوں سے بڑھ کر مجسم شیطان بھیڑیوں کی طرح امن و عافیت سے بسر کرنے والوں پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ گھر بار دھڑی دھڑی کر کے لوٹا۔ جوان، بوڑھے عورتیں بچے، سب کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اب بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا گھر کو اپنے قبضے میں کیا۔ جو زندہ رہے انہیں گاجر مولیوں کی طرح نکال باہر کیا۔ حکومت منہ میں گھونگنیاں اور کانوں میں تیل ڈالے ہوئے تھی اور ٹس سے مس نہ ہوتی تھی۔ فوجی تلنگے وحشی سہی۔ پولیس تو حفاظت کی طرف ہوتی۔ مظلوم پولیس کے سپاہیوں کو دیکھ کر امداد کی تمنا کرتے۔ اور پولیس والے الٹے ظالموں کی ہمت بندھاتے اور سارے ظلم روا رکھتے۔ ۱۸۵۷ء کی مصیبت جو بڑی بوڑھی عورتوں نے اپنے بڑوں سے سن رکھی تھی ان ظلموں کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہ رکھتی تھی۔ ہائے کچھ نہ پوچھو بڑے بڑے چوٹی کے گھرانے کی عورتیں دن دھاڑے کھلے منہ۔ نہ سر پر دوپٹہ نہ پیر میں جوتی، اس طرح بھاگ رہی تھیں جیسے خزاں دیدہ درخت کے سوکھے، نیچے گرے ہوئے، پتے ہوا کے جھونکوں سے زمین پر لڑھکتے دکھائی دیتے ہیں۔ انسان بیان کرنے سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ جگر شق ہوتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اسی زمین پر کیا کیا بلائیں نازل نہ ہوئیں۔ کیا کیا آفات اور بلیات نہیں ٹوٹیں، لیکن آدم کی اولاد بستی چلی آئی اور بستی چلی جائے گی۔ زبیدہ کا باپ نعیم الدین بھی بے گھر بے در ہوا۔ بچوں کو ساتھ لے نکل کھڑا ہوا۔ ایک ایک تانگہ بیس بیس روپے مانگتا تھا۔ خیر لشتم پشتم بہزار جر ثقیل پرانے قلعے میں آن پڑا۔ یہاں سے مہاجرین ریل گاڑی میں بیٹھ کر پاکستان آ سکتے تھے۔ مصیبت زدہ چاہتا تھا بلا سے چاہے کچھ ہی خرچ ہو جائے۔ کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچ جاؤں۔ پرانے قلعے میں دو دن کے اندر اندر ایک لاکھ آدمی جمع ہو گیا۔ اُس ٹس میرے کان میں گھس۔ سب ہی مصیبت زدہ تھے۔ کون کس کو روکتا۔ قصہ کوتاہ، ایک دن نظام الدین اسٹیشن سے ریل گاڑی کے

ایک ڈبے میں جگہ مل گئی۔ زنانہ ڈبے میں بچوں کو بٹھا خود مردانہ ڈبے میں جا بیٹھا۔ گاڑی جوں کی چال چل رہی تھی۔ لاہور کوسوں دور، راستے بھر حملے کا اندیشہ۔ پاکستان کی سرحد لینی مشکل۔ گاڑی جوں توں کرکے ایک دن ایک رات میں بیاس تک پہنچی۔ وہاں نا اسنگھی کرپانوں سے مسلح موجود تھے۔ نہتے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ نعیم الدین کے چھوٹے بچے بھوکے پیاسے زبیدہ کی آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیئے گئے۔ زبیدہ کو زبردستی نیچے اتار لیا گیا۔ آفت رسیدہ بے کسی میں ابا ابا کہہ کر چیخنے لگی۔ نعیم الدین نے بیٹی کو چیختے سنا۔ اس کی امداد کے لئے دوڑا۔ چھوٹے بچوں کو اپنی آنکھوں سے کٹتے ہوئے دیکھا۔ ستم شعاروں نے باپ کو بیٹی کے پاس پہنچنے نہ دیا۔ بیٹی کے سامنے باپ بھی ظالموں کی تلوار سے گھائل ہو کر تڑپتے تڑپتے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ آہ! یہ سارے ظلم و ستم زبیدہ کے سامنے ہوئے اور وہ دیکھنے پر مجبور تھی۔ تاروں بھری رات اس کی مصیبت پر قہقہے لگا رہی تھی آسمان برابر دیکھتا رہا اور پلٹا نہ کھایا۔ زمین پر یہ ستم توڑے گئے اور شق نہ ہوئی۔ یہ خونی وقت بیت گیا۔ ظالم زبیدہ کو لے گئے۔ اپنے کارناموں پہ خوش تھے۔ گردنوں کو اکڑاتے اور قہقہے لگاتے تھے۔ خدائی حکم محکم اور اٹل۔ کون اس کی مشیت کے آگے دم مار سکتا ہے۔ ظالم جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے۔

دنیا میں اب تک یہی ہوا اور دیکھ لینا آئندہ بھی یہی ہوگا۔ حکومتیں بدلیں۔ سلطنتوں میں انقلاب آیا۔ بادشاہ محتاج ہوئے۔ نادار صاحب تخت و تاج ہوئے۔ لیکن یہ کہیں ہوتے دیکھا نہ سنا کہ نہتے انسانوں کو بے دریغ تہ تیغ کیا گیا ہو۔ عورتیں ماری گئی ہوں۔ ننھے ننھے بچے سسک سسک کر مرے ہوں۔ بوڑھوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہو۔ لوگ حکومت اور حشمت کے زعم میں انسانیت اخلاق۔ مروت سب کچھ کھو بیٹھے ہیں۔ بے کسوں کی فریاد انہیں مار لائی۔ منتقم حقیقی ہی بے وارثوں کی سنے گا اور زمانہ دیکھے گا کہ ستم شعاری اور ظلم رانی ظالموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر چھوڑے گی۔

بدنصیب زبیدہ نے بہن بھائی اور باپ کو اپنی آنکھوں سے دم توڑتے اور ختم ہوتے دیکھا۔ اب ظالموں کے قبضے میں تھی۔ جنہوں نے اور بہت سی لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح اپنے ساتھ لے لیا۔ اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان پر کیا گزری۔ ان کی زندگی یہ صدمے جھیل کر بھی

ں ختم نہ ہوئی۔ بڑے بوڑھے سچ کہہ گئے ہیں کہ انسان سے بڑھ کر سخت جان کوئی نہیں۔ آسمان گرے یا زمین شق
اگر وقت پورا نہیں ہوا تو ساری مصیبتیں اور آفتیں جھیل جاتا ہے اور کسی طرح زندگی ختم نہیں ہوتی۔ یہی حال زبیدہ
ایسا ایسے صدمے جھیلے جو حشر ٹوٹنا تھا ٹوٹا۔ سب کچھ ہی ہوا۔ لیکن یہ جیتی جاگتی ہی رہی۔ یہ طوائف الملوکی کب تک
، ظلم و ستم کے بادل پھٹے۔ نئی زمین اور نیا آسمان بنا۔ جاندار وں کی پرورش کے لئے سورج پھر نکلا۔ دونوں حکومتیں
ہو چکی تھیں۔ ان میں معاہدہ ہوا کہ جو جو عورتیں اغوا کی گئی ہیں وہ واپس کر دی جائیں۔ زبیدہ کے فرشتوں کو بھی خبر
ں۔ ایک دن چند فوجیوں نے گھروں کو گھیر لیا۔ زبیدہ بھی ایک اکالی سنگھ کے گھر سے برآمد ہوئی اور جمیل نامی ایک کپتان کے
ومت پاکستان کی طرف سے اس کام کے لئے متعین تھا سپرد کر دی گئی۔ واپس آ رہا تھا سکھ غنڈوں سے مٹ بھیڑ
ے۔ جمیل زخمی ہو گیا۔ ہسپتال میں داخل ہوا۔ زبیدہ پناہ گیروں کے کیمپ میں پہنچا دی گئی۔

مصیبت زدہ زبیدہ جمیل کو اپنا محسن سمجھتی تھی۔ ایک دن جمیل کو دیکھنے کے لئے شفاخانہ آئی۔ وہ لیٹا
تھا۔ اس کا مزاج پرسی کے لئے آنا جمیل کے دل پر غیر معمولی طریق سے اثر انداز ہوا۔ وہ سوچنے لگا جس کا آزا
میرا عین فرض منصبی تھا اخلاقاً میرے لئے تکلیف برداشت کر کے آئی ہے میں بھی اخلاق محمدی کے
ت ہیں کم از کم شکریہ تو ادا کروں۔ چنانچہ زبیدہ کے پہنچنے پر اس نے خندہ پیشانی سے پوچھا۔ آپ اچھی تو ہیں۔
بیدہ: "اللہ کا شکر ہے، میں بدنصیب اچھی ہوں۔ آپ پر یہ کیا مصیبت ٹوٹی؟ ہم آفت رسیدہ کی
رہائی کے عوض آپ کیسے زخمی ہوئے۔ جب تک جیونگی آپ کا یہ احسان بھول نہیں سکتی۔ اپنی روزانہ
دعاؤں میں آپ کو یاد رکھتی ہوں"

میل: "آپ کی رہائی میرا عین فرض منصبی تھا۔ دراصل یہ آپ کا اخلاق ہے کہ میرے فرض کو آپ خدمت
سمجھتے ہوئے اپنی روزمرہ کی دعاؤں میں مجھے یاد رکھتی ہیں۔ آپ کی دعا سے میں اچھا ہو گیا ہوں۔ دراصل
گولی میرے بازو سے چھوتی ہوئی نکل گئی۔ ذرا سی خراش آئی تھی۔ اب اچھا ہوں۔ ہاں آپ کا نام
کیا ہے؟"

یدہ۔ محمد بدنصیب کو زبیدہ کہتے ہیں۔

میل۔ کہاں کی رہنے والی ہیں؟

یدہ۔ دلی کی۔

میل۔ (حیرت سے چونکتا ہو کر) آپ کے والد صاحب کا کیا نام ہے؟

یدہ۔ مقیم الدین صاحب کی لڑکی ہوں۔

میل۔ وہ کہاں ہیں؟

یدہ۔ رونے لگی اور روتے روتے کہا) ہم لوگ ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ ستم شعاروں نے میرے بہن
بھائیوں اور والد کو مار ڈالا اور مجھ کو ساتھ لے گئے۔

جمیل اُف! قسمت! یہ کیا کہہ رہی ہو۔ دیکھنا تمہیں اپنے دادا صاحب کا نام معلوم ہے۔

زبیدہ - جی ہاں وہ قاضی سلیم الدین کہلاتے تھے۔

جمیل- اللہ اللہ زبیدہ تم میرے سگے ماموں صاحب قبلہ کی لڑکی ہو۔ قاضی سلیم الدین صاحب میرے نانا تھے ... در اصل ملازمت کے سلسلے میں آپ مرحوم مسور چلے گئے تھے۔ بارہ برس یا کچھ زاید برس کے عرصے سے والدہ صاحبہ کبھی تمہارے ہاں نہیں آئیں۔ مجھے یاد ہے شاید تم گود میں تھیں میں پانچ چھ برس کا ہوں گا۔ ماں مجھے لیکر تمہارے ہاں گئی تھیں۔ پھر اتنے عرصے سے کبھی ملنا جُلنا نہیں ہوا۔ میرے ماں باپ بھی اس ہنگامے میں کام آ گئے۔ مرنے والی ماں کی دلی خواہش تھی کہ میری شادی ان کی بھتیجی سے ہو۔ کیا قبلہ ماموں صاحب نے اس امر کا کبھی گھر میں ذکر کیا اور اس کی بھنک اڑتے اڑتے تمہارے کان میں بھی پہنچی۔

زبیدہ - مجھے سب علم ہے۔ لیکن میرے محسن بھائی زبیدہ اب اس قابل نہیں رہی کہ تم جیسے نیک، فرشتہ سیرت بھائی کی خدمت کر سکے۔

جمیل۔ زبیدہ تم بالکل نیک ہو تمہارے نفس کا اس میں دخل نہیں۔ میں تو تم کو اب بھی فرشتے کی طرح معصوم سمجھتا ہوں۔ جمیل کی آیندہ زندگی کا فریق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ زبیدہ تم ہو۔ ہاں اس کے پورا ہونے یا نہ ہونے کا انحصار اب تمہاری ہاں یا نا پر ہے۔

زبیدہ نے شرم سے گردن جھکا لی اب وہ دونوں میاں بیوی ہیں اور پاکستان میں امن و عافیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں

محمد حسن آسان دہلوی احمدی

---

# کلام اکبر الہ آبادیؒ

ان مصائب میں بھی مایوس نہیں ہوں اکبر　　قیدِ ہستی سے رہائی کی خوشی باقی ہے

---

ہوش میں لائی ہیں اب مایوسیاں　　نشۂ امید فَرّا ہو چکا

---

پہلے تنہائی سے گھبراتا تھا میں　　زندگی سے اب تو گھبرانے لگا

# اجمال و تفصیل

تضمین

بر غزل حضرتِ نواب عجمی بیاوری رح

شوقِ خود بینی نہ ہو ذوقِ خود آرائی نہ ہو    اور اگر یہ ہو تو پھر پندارِ رعنائی نہ ہو
عام ہو جلوہ مگر اتنا بھی ہرجائی نہ ہو    آئینہ میں روئے زیبا محوِ زیبائی نہ ہو
خود شناسی ہو تو دشمن سے شناسائی نہ ہو

یہ تلون کی ادا اور ایسی انگڑائی نہ ہو!    اک ذرا سی بات پر یہ خلق سودائی نہ ہو
یوں تقاضائے محبت کی پذیرائی نہ ہو    حسن کے پردے کی رکھ لاج اور تماشائی نہ ہو
آنکھ کے پردے سے باہر ہو کے ہرجائی نہ ہو

سادگی سے آئینہ دارِ مہ و پرویں نہ بن    اے ستم پرور کبھی لیلیٰ کبھی شیریں نہ بن
بن، مگر اتنا بھی اب اے جلوۂ رنگیں نہ بن    آئینے میں بن سنور کر دیکھ تو خود بیں نہ بن
ہو خدا تیرا خود آرا، گر خود آرائی نہ ہو

کس قیامت کی ہے پیدا دلکشی زیرِ نقاب    شمع ہے فانوس میں اور روشنی زیرِ نقاب
کوندتی ہے بزم میں اک روشنی زیرِ نقاب    کھاتی ہیں جھلی شعاعیں حسن کی زیرِ نقاب
پھر بھی کیا منہ لیکے کہتے ہیں کہ رسوائی نہ ہو

گرچہ وہ رہوا نہیں اہلِ وفا کی دید سے    پھر بھی فرماتے ہیں آخر کیا نتیجہ دید سے
کس قدر نا آشنا ہوں آشنا کی دید سے    بند چشمِ دل ہے میری ماسوا کی دید سے
ہے تماشا پھر بھی کہتے ہیں تماشائی نہ ہو

ہوتے ہیں نغمات پیدا سب ربابِ غوث سے    ہے ہر اک جلوے میں رنگینی شبابِ غوث سے
نکلی ہیں اختر شعاعیں آفتابِ غوث سے    شکلیں سب ہونگی حل عجمی جنابِ غوث سے
جسکو دل میں تو نے سمجھا کوہ، وہ رائی نہ ہو

اختر انصاری اکبر آبادی

افسانہ

# پچھتاوا

طاہرہ نے ایک انگڑائی لی۔ اور کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ باہر رم جھم رم جھم پھوار پڑ رہی تھی۔ آکاش پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور فضا میں ایک فسوں طاری تھا۔

"کیا سہانا موسم ہے۔" اُس نے باہر کا سماں بغور دیکھکر کہا۔

آج اُس کے دل میں کچھ اُمنگیں سی پیدا ہو رہی تھیں۔ آج وہ اپنے آپ میں شباب کی ترنگیں محسوس کر رہی تھی۔ آج اُس کا من کچھ بے چین سا تھا۔ آج اُس کی مخموری آنکھیں کسی کے پیار کی متمنی نظر آرہی تھیں —— وہ کھڑکی سے پلٹی اور آکر مسہری پر دراز ہوگئی۔

فضا میں خنکی کی وجہ سے اُس نے رضائی کا کچھ حصہ اوڑھ لیا۔ اور کتنی ہی دیر تک خاموش سوچتی پڑی رہی۔

"واقعی بغیر مرد کے بھی کوئی زندگی ہے۔" اُس نے اپنے آپ سے کہا —— اور اُسے اپنی ایک سہیلی یاد آئی جو اُس سے اکثر کہا کرتی تھی کہ شادی کر لو تو زندگی کا لُطف آئے۔ شاید وہ سچ ہی کہتی تھی۔ جبھی تو شادی ہونے کے بعد کتنی خوش تھی وہ۔ ہمیشہ بن ٹھن کر رہتی۔ خوب سنگھار کرتی۔ جب دیکھو شگفتہ گوں ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم کھیلتا رہتا۔ قسمت سے اُسے جیون ساتھی بھی اچھا ملا۔ پڑھا لکھا۔ خوش اخلاق اور کچھ خوبصورت بھی —— شادی کے بعد اُس کی زندگی میں غیر معمولی تبدیلی ہوگئی۔ وہ اُس کا خاموش سا رہنا، وہ اس کی لاپرواہی، وہ اُس کا سنجیدہ پن سب غائب ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسری ہی لڑکی ہے۔ بے تکلف باتیں، ہر وقت کی مسکراہٹ، آہستہ آہستہ گنگناتے رہنا، آنکھوں میں کچھ خمار سا،

بڑی منچلی ہو گئی ـــــ جب چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لگا رکھی ہے۔ واقعی عورت جیسی نازک ہستی کو توسنجیدگی ذرا اچھی نہیں معلوم ہوتی ـــــ اب تو اس کے ایک بچہ بھی ہو گیا ہے۔ بھولا بھالا سندر سندر سا۔ گلاب کے پھول جیسا۔ بڑا ہی پیارا۔ اُس کی معصوم ادائیں، اُس کی بھولی بھالی صورت، اُس کی میٹھی میٹھی باتیں کتنی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ سینے سے چمٹا لیں ـــــ اکثر وہ اُس سے کھیلتی رہتی ہے۔ جگر کے ٹکڑے سے ـــ ننھے ریاض سے۔ اپنے کھلونے سے ـــ اُس سے کھیلتے وقت خود بھی بچہ بن جاتی ہے اور اپنی جوانی کو اُس کے بچپن میں کھو دیتی ہے ـــــ واقعی خوش قسمت ہے وہ۔

پھر اُسے اپنے بھیا کا خیال آیا۔ جن کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی ـــــ کتنی رونق آگئی ہے بھیا کے چہرے پر۔ ہر وقت مُسکراتے رہتے ہیں۔ کتنی محبت ہے انھیں بھابی سے۔ جب دیکھو گھر میں نئی نئی چیزیں آ رہی ہیں۔ گھر کو ہر طرح سے سجایا جا رہا ہے۔ نیا ریڈیو سیٹ لایا گیا۔ گھر میں ٹیبل ٹینس قائم کیا گیا۔ کیرم بورڈ خریدا گیا۔ اور مختلف قسم کے اخبار و رسائل جاری کروائے جا رہے ہیں۔ قسم قسم کے کیمرے لائے جا رہے ہیں۔ گھر میں ہر ایک کی تصویر کھینچی جا رہی ہے۔ ہر تیسرے چوتھے دن سنیما کا پروگرام بن رہا ہے۔ ہر ہفتے پکنک کو جا رہے ہیں۔ ہر قسم کے کپڑے اور ہلکے ہلکے زیورات آ رہے ہیں۔ طرح طرح کی مٹھائیاں آ رہی ہیں۔ قسم قسم کے مربّے بن رہے ہیں۔ رنگا رنگ کے کھانے پکائے جا رہے ہیں۔ غرض گھر میں زندگی اور رونق آگئی۔

بھابی بھی کتنی اچھی ہیں۔ پڑھی لکھی، حسین اور شاعرانہ دماغ رکھنے والی لڑکی ـــــ کتنا چاہتی ہیں وہ بھیا کو۔ جیسے وہ بچپن سے اُنھیں کے تھے۔ بس اُنھیں کے ـــــ جب بھیا بیڈمنٹن کھیل کر ریکٹ ہلاتے ہوئے آتے ہیں تو بھابی انھیں کن انکھیوں سے بغور دیکھتی ہیں۔ بھابی کے اس طرح دیکھنے میں کس قدر پیار ہوتا ہے۔ بلا کا ـــــ جس کا اندازہ شاید مشکل ہے۔ اور واقعی بھیا بھی اُس وقت کتنے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے کسی ٹکنی کلر فلم کا ہیرو۔

کھانا کھاتے وقت عجیب لطف رہتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چپکے چپکے اشارے کرتے ہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کو مختلف چیزیں کھانے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ اگر کوئی دیکھ لے تو بس مسکرا دیتے ہیں۔ اکثر کھانا کھاتے وقت میں سب کچھ دیکھ کر بھی انجان ہو جاتی ہوں۔ اور چپکے چپکے دونوں کے راز و نیاز کا لطف اٹھاتی ہوں۔

واقعی بغیر مرد کے زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی اپنا نہیں ہے ـــــ بس عجیب سی زندگی ہو جاتی ہے ـــــ بے ڈھنگ سی ـــــ بے رنگ سی ـــــ بے معنی سی ـــــ غرض ایک راہ بھٹکے ہوئے مسافر کے جیسی ـــــ اللہ میاں نے عورت اور مرد کے تعلق کے متعلق کیا سچی بات کہی ہے کہ عورت مرد کا لباس ہے اور مرد عورت کا ـــــ گویا دونوں لازم و ملزوم ہیں ـــــ کوئی بھی تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

ابتدا میں دو تین جابر مردوں کے واقعات ایسے میری نظر سے گذرے کہ میں مردوں کو بری نگاہ سے دیکھنے لگی ـــــ اور جب بی۔ اے پاس کر کے میں نے ایک اسکول میں ملازمت اختیار کر لی تو مجھے مردوں سے نفرت ہی ہوگئی۔ اور سمجھ بیٹھی کہ شادی کے بعد زندگی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ مرد کے تابع رہنا پڑتا ہے۔ آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتے۔ اپنی مرضی کے آپ مالک نہیں۔ ہر وقت شوہر صاحب سر پر سوار رہتے ہیں ـــــ مگر سب مرد یکساں نہیں ہوتے۔ اور بغیر مرد اور بچوں کے زندگی بھی کیا ـــــ کم از کم ایک آدھ بچہ تو ہونا ہی چاہیئے۔

رفیع کتنے اچھے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ شاعروں جیسے بے ترتیب بال۔ چھریرا بدن۔ ہر وقت گنگناتے رہتے ـــــ مجھے کتنا چاہتے تھے وہ۔ دور کے رشتہ دار ہونے کے باوجود تیسرے چوتھے دن ہمارے گھر چلے آتے، گھنٹوں بچوں سے کھیلتے رہتے۔ کبھی بھیا سے

باتیں ہوتیں۔ اور کبھی مجھ سے مختلف موضوعات پر مباحث ہوتے۔ اور ہر بار کوئی نئی چیز مجھے ضرور معلوم ہوتی۔ اور ہمارے گھر اس قدر بے تکلفی سے چلے آتے جیسے وہ بھی اسی گھر کے ایک فرد ہیں ـــــ کتنی سادگی اور کتنا خلوص تھا اُن میں ـــــ ایک مرتبہ جب میں سخت بیمار پڑ گئی تھی تو وہ کس قدر پریشان ہو گئے تھے۔ مجھے دیکھنے کے لئے ہر روز چلے آتے۔ کبھی کبھی یہیں رہ جاتے۔ مجھ سے مزاج پوچھتے۔ تسلّیاں دیتے۔ مختلف طریقوں سے میرا دل بہلاتے۔ میں کتنا ہی سنجیدہ رہوں مگر بغیر ہنسائے نہیں چھوڑتے۔ اپنے ہاتھ سے دوا پلاتے۔ ساتھ سیب وغیرہ ضرور لاتے۔ اگر میں کبھی کہتی کہ آپ نے تکلیف کیوں کی ـــ بس جواب دیتے "رلتے میں نظر آ گئے لے لئے ـــــ" اور اگر ذرا بھی میری طبیعت خراب ہو جاتی تو فوراً ڈاکٹر کے پاس دوڑتے ـــــ اُسے علاج میں دلچسپی لینے کے لئے توجہ دلاتے۔

ایک مرتبہ جب بیماری سے بیزار سی ہو گئی تھی تو اُنہوں نے کس قدر خلوص سے کہا تھا کہ "طاہرہ! اگر میں ڈاکٹر ہوتا تو تمہیں ضرور بہت جلد اچھا کر دیتا ـــــ" اور کتنی ہی دیر تک افسوس کرتے رہے کہ اُنھوں نے ڈاکٹری کیوں نہیں پڑھی۔

پھر جب میں اچھی ہو گئی تو اُنہوں نے مجھ سے شادی کی درخواست کی۔ بھیّا بھی بہت مصر رہے۔ اور بولے "طاہرہ! شادی کر لو۔ رفیع بہت اچھے آدمی ہیں۔ عورت بغیر شوہر کے نہیں رہ سکتی۔" اور جانے کیا کیا کہا۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا کہ "میں شادی وادی کچھ نہیں کروں گی ـــــ میں آزاد زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں ـــــ اسکول سے جو کچھ ملتا ہے وہ میرے لئے بہت کافی ہے۔"

اس کے بعد رفیع ہمارے یہاں کم آنے لگے۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے آنا جانا بالکل بند کر دیا۔ اور پھر کہیں چلے گئے۔

سُنا ہے کسی ادیب لڑکی سے اُنہوں نے شادی کرلی۔ اور کسی کالج میں پروفیسر ہوگئے۔

"کتنے اچھے تھے وہ —— کاش میں انہیں اپنا لیتی۔"

وہ پچھتانے لگی۔

رحمان ساجد

# سنہ ۱۳۶۸ھ کے تاریخی نام

ظہور انور۔ رضا جمشیدی۔ افتخارِ جمیل۔ حشمت قریشی۔ نصیر غازی۔ ممتاز شفقت، رحمت علی تاجور۔ ملک نظیر حسن۔ شاہ نواز حفیظ۔ آغا حسن مرزا۔ شیخ محمد شاہین۔ لطیف رحمانی، بہرام ظہوری۔ میر فیض حسن۔ صغیر ساجد۔ عابد اصغر۔ خورشید لقا یوسفی۔ خورشید احمد صادق، طہماسپ مختاری۔ سلیمان ظہور اللہ۔ رضوان قادری۔ انور نظامی۔ مختار فرخ۔ اعجاز غفور منظہر اکبر۔

(مرتبہ محسن عرانی از ڈیرہ اسماعیل خاں)

# قطعات

(۱)

ایک مرکز پہ سکوں کیوں نہیں ملتا دل کو
زندگی راہ بہر گام بدلتی کیوں ہے
کل جنہیں قہقہہ سنجی سے نہ ملتا تھا قرار
آج ان ہونٹوں پہ افسردہ خموشی کیوں ہے

(۲)

کنارِ آب مچلتی ہیں جو حسیں موجیں
میں اپنے آپ کو اُن کے سپرد کردوں گا
یا آج تیرہ نصیبی کا گھونٹ دوں گا گلا
یا دلفریب اُجالوں کا راز پالوں گا

(۳)

غمِ حیات کا مارا ہوا حزیں صہبا
پناہ ڈھونڈنے آیا ہے رہگذاروں میں
علاجِ زخمِ دلِ مضطرب بھی ہے کہ نہیں
بتاؤ خشک ببولو! تمہارے خاروں میں

صہبا اختر علیگ

# تلاش

بندۂ حرص و ہوس کو عمرِ فانی کی تلاش
عشق کے ماروں کو عمرِ جاودانی کی تلاش
اک نگاہِ بیرخی سے مٹ گئی ہر آرزو
اب نہ دل ہے اور نہ دل کو شادمانی کی تلاش
عالمِ بیچارگی میں یہ ہوا ہے دل کا حال
رہتی ہے اب صرف مرگِ ناگہانی کی تلاش
مستیٔ چشمِ کرم سے تیرے دل مخمور ہے
کسکو ہے ساقی شرابِ ارغوانی کی تلاش
کشتگانِ عشق کی یہ سادگی تو دیکھئے
ہے فقط تیرے ہی خنجر کی روانی کی تلاش
محتسب میخانے والوں پہ ستم ہے کس لئے
رہتی ہے انکو تو بس دو بوند پانی کی تلاش
آرزوِ لطف و کرم کی چشمِ جاناں سے عزیزؔ
موت کے آغوش میں ہے زندگانی کی تلاش

عزیز بنگلوری

# چور

مکان سے باہر سڑک کے کنارے گیلی مٹّی کے ڈھیروں پر وہ گھنٹوں کھیلا کرتا۔ کچھ دنوں سے وہ بے حد خوش تھا۔ کیونکہ سامنے کے بڑے میدان میں ایک بنگلہ بن رہا تھا۔ گاڑی والے روزانہ بہت سے مٹّی کے ڈھیر لگاکر چلے جاتے۔ اور وہ خوش خوش پہلے تو بہت دیر تک مٹّی کے نرم نرم گدیلے پر اچھلتا رہتا۔ اُس کے پاؤں ٹخنوں تک گڑ جاتے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی مٹّی جب اُس کے گرم گرم پیروں سے چھوتی تو اس کے تمام بدن میں ایک جھرجھری پیدا ہو جاتی۔ وہ زور سے اُچھلنے لگتا۔ خوب کودتا اور پھر یکایک اُسے اپنے دوستوں کا خیال آجاتا۔ اُچھلتے اُچھلتے وہ چلاتا۔ دوستوں کو پکارتا۔ اس کے دوست دبکے ہوئے جانے کہاں سے نکل آتے۔ اور سب مٹّی کے ڈھیر پر کودنے لگتے۔ اُسے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا۔ وہ کودنا بند کر دیتا۔ آڑے ٹیڑھے اپنے قدموں کے نشانوں کو دیکھتا ہوا بیٹھ جاتا اور گھروندے بنانے کی سوچنے لگتا۔ اُسے وہ پُرانا قلعہ یاد آجاتا جسے وہ بہت دن پہلے کسی کے ساتھ دیکھنے گیا تھا۔ وہاں کی اونچی اونچی دیواروں اور بڑے بڑے دروازوں کے متعلق وہ اکثر سوچا کرتا تھا۔ آدمیوں نے کیسے وہ تمام عمارتیں بنائی ہونگی۔ وہ سوچنے لگتا۔ اور جس دن اُسے یہ معلوم ہوا کہ سامنے کے میدان کو ایک بڑے رئیس نے خرید لیا ہے اور وہ وہاں بہت جلد ایک عالی شان بنگلہ بنوانے والا ہے تو اُسے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ اُس نے بڑے اُونچے اُونچے مکانوں کو بنتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اپنے دوستوں کو بُلاکر وہ مٹّی کے ڈھیر میں قلعے بنانے کو کہتا۔ وہ سب الگ الگ

قلعے تعمیر کرتے۔ اپنا چھوٹا قلعہ بنا لینے کے بعد وہ دور جا کر ایک بڑے انجنیر کی طرح اُسے دیکھتا۔ اپنی بنائی ہوئی عمارت اُسے تمام ساتھیوں سے اچھی معلوم ہوتی۔ وہ مسکراتا۔ اور فاتحانہ انداز میں اپنے دوستوں کے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروندوں کو دیکھتا۔ اور اپنی عمارت سے ان سب کا موازنہ کرنے لگتا۔ کتنی بلند تھی اس کی عمارت۔ تمام دوستوں سے بلند۔ وہ چاہتا، کہ اس کے دوست بھی اس کی تعریف کریں۔ لیکن کوئی بھی اُس کے شاہکار کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھتا۔ اُسے غصہ آجاتا۔ اس کی طبیعت چاہتی کہ وہ اس عظیم الشان قلعہ کو ڈھا دے جو اُس نے اتنی امنگ اور اُمیدوں سے بنایا ہے۔ وہ اس پر اُچھل کر کود پڑے۔ اُسے مٹی میں واپس بکھیر دے۔ وہ دس قدم دور جاتا اور اپنے قلعہ کو ٹھوکر سے اُڑا دینے کے لئے دوڑتا۔ وہ پھلانگ جاتا۔ لیکن جانے کیوں وہ اُسے توڑ نہ سکتا۔ آخر اس کا کوئی منچلا دوست لپک کر اُس کے قلعے کو ٹھوکر مار دیتا۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتا اور زور سے کھلکھلا کر ہنس دیتا۔ گویا اُس کے دوست نے اس کی ایک بڑی گتھی سلجھا دی ہو۔

اپنے باپ سے اُسے بے حد محبت تھی۔ لیکن وہ اُس سے ڈرا بھی کرتا تھا۔ دن بھر فیکٹری میں محنت کر کے جب شام کو باپ گھر لوٹتا تو اپنے تمام دوستوں کو کھیلتا چھوڑ کر وہ گھر میں آجاتا۔ اور اتنے میں اس کا باپ چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی پکارتا "اسلم —!" اور اسلم "جی" کہکر اُس کے سامنے چُپ چاپ کھڑا ہو جاتا۔ کھانا کھانے کے بعد جب وہ بستر پر لیٹتا تو اسلم اُس کے پاؤں دبانے لگتا۔ اُسے ایک غیر معمولی مسرت محسوس ہوتی۔ اس کا باپ پوچھتا "اسلم! آج تو نے پڑھا؟" —— "جی"۔ جیسے وہ بہت دیر سے اس کا جواب دینے کے لئے تیار تھا —— "کیا پڑھا؟" —— یہاں آ کر وہ سٹ پٹا جاتا۔ اور اس سے کچھ کہتے نہ بنتا کہ اُس نے کیا پڑھا۔ وہ خاموش رہتا۔ اور اُس کا باپ بھی بھول جاتا کہ اُس نے اسلم سے کیا سوال کیا تھا —— آخر وہ اونگھتے اونگھتے کروٹ بدل کر کہتا "خوب پڑھو —— خوب لکھو —— جاؤ سوؤ ——" اور اسلم اُٹھ کر بستر پر لیٹ جاتا۔ وہ سوچتا۔ اُس

نے آج کیا پڑھا تھا ــــ "الف خالی ب کے نیچے ایک نقطہ ــــ" یہ تو وہ دو سال سے پڑھ رہا تھا۔ اک پہ اٹک گیا، کہتے کہتے اُس کی زبان تھک گئی تھی۔ اُس نے کیا پڑھا تھا۔ یہی۔ اور پردیس کی اُستانی بھی اُسے روز یہی پڑھایا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب کچھ بھول جاتا۔ اور اپنے بنائے ہوئے کھیلوں میں کھو جاتا۔ کتنے اچھے تھے اس کے کھیل ــــ وہ پھر کوئی نیا کھیل بنانے کا تصوّر کرنے لگتا۔ اور یونہی سوچتے سوچتے وہ سو جاتا۔

میدان میں بنگلہ بنا اور آباد ہو گیا ــــ اسے اکثر بنگلہ کی چہار دیواری کے پھاٹک پہ چھوٹے خوبصورت بچّے فٹ بال کے پیچھے دوڑتے نظر آتے۔ وہ درخت پر چڑھ جاتا اور وہاں سے بنگلے کی چہار دیواری میں دیکھتا۔ گورے گورے، تندرست بچّے اُسے بہت اچھے معلوم ہوتے۔ وہ خاموش درخت کی دو شاخہ پہ بیٹھا ہوا دیکھا کرتا۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا وہ انسان نہیں ہیں۔ وہ اُن سے بات نہیں کر سکتا۔ وہ شاید پریوں کے بچّے ہیں۔ جن کی کہانیاں وہ بڑی دلچسپی سے سُنا کرتا تھا۔ اُس کے دل میں اُن کے لئے بے پناہ محبت اُبھر آتی۔ وہ اپنے تمام دوستوں کو بھول جاتا۔ جیسے محلّے کے گندے اور چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے آوارہ بچّے اس کے کبھی دوست نہیں ہو سکتے۔

وہ چاہتا کہ وہ بھی اُن کے ساتھ کھیلے۔ اُن کے پاس جائے۔ اُن سے التجا کرے "میں بھی تمہارے ساتھ کھیلوں گا۔ تمہارا دوست بنوں گا۔ تمہیں نئے نئے کھیل بتاؤں گا۔ خدا کے لئے مجھے بھی اپنا دوست بنا لو۔ یہ تمہارا فٹ بال ــ مجھے بے حد پسند ہے ــــ" اور یہی سوچتے سوچتے وہ ان کے کسی مذاق پہ ہنس پڑتا۔ جیسے وہ اُن کے ساتھ ہی کھیل رہا تھا۔

بازار میں بنئے، فٹ بال اور گیندوں کی دکان کو دیکھکر وہ کھڑا ہو جاتا۔ دیکھتا رہتا۔ یونہی جیسے وہ اپنی خواہش کو تسکین دے رہا ہو۔ ایک دن ڈرتے ڈرتے اس نے دوکاندار سے ایک چھوٹی فٹ بال کی قیمت پوچھی ــــ "ایک روپیہ ــــ" اس کی آنکھوں میں

جیسے اندھیرا سمٹ آیا ـــــ ایک روپیہ وہ کہاں سے لائے - اپنی ماں سے مانگے -
نہیں - اپنے ابا سے - نہیں ـــ وہ سب اُسے دھتکار دیں گے۔ اُسے ڈانٹ کر
چُپ کر دیں گے۔ اُسے وہ دن یاد آگیا جب اُس نے ایک مرتبہ غبارہ خریدنے کی خواہش
ظاہر کی تھی ـــــ لیکن فٹ بال ـــ وہ تو اُسے بے حد پسند تھی - گول گول خوبصورت سی
فٹ بال اُس کے معصوم ذہن میں سماگئی۔ اور اُس نے سڑک کے کنارے چلتے چلتے ایک چھوٹے
سے پتھر کو یوں ٹھوکر ماری گویا وہ فٹ بال کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

ایک روپیہ اُس کے لئے کتنی بڑی رقم تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتا۔ بنگلے کے بچے کہاں
سے روپیہ لائے ہونگے۔ وہ تو روز نئی فٹ بال سے کھیلتے ہیں۔ اُنہیں کون روز روپیہ
دیتا ہے۔ لیکن وہ تو پریوں کے بچے ہیں۔ اُن کے پاس روپوں کی کیا کمی۔ اُس نے اپنی
ماں سے سُنا تھا، پریوں کے پاس بہت پیسہ ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی سے خوش ہوجاتی ہیں
تو سونے چاندی سے مالا مال کر دیتی ہیں۔ اُسے اپنے دادا کا قصہ یاد آجاتا تھا۔ وہ سوچتا رہتا
دل ہی دل ہی۔ باپ سے وہ ایک روپیہ کیسے مانگ سکتا تھا۔ کوئی پری اُس سے کیسے خوش
ہوسکتی تھی۔ وہ فٹ بال کیسے خرید سکتا تھا۔ لیکن اُس کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا ـــ
وہ جیسے تھر تھر کانپنے لگا ـــــ "یہ تو چوری ہے۔" نہیں۔ نہیں ـــــ وہ چوری کبھی نہیں
کرسکتا۔ لیکن وہ پھر خود ہی سوچنے لگتا۔ چور تو بڑا آدمی ہوتا ہے۔ اس کے دوست نہیں
ہوتے۔ اُس کے پاس چھُریاں ہوتی ہیں۔ وہ آدمیوں کو مار ڈالتا ہے۔ وہ تو ابھی چھوٹا ہے۔
اُس کے تو بہت سے دوست ہیں۔ وہ کبھی کسی کو نہیں ستاتا۔ وہ کبھی چور نہیں ہوسکتا۔
دل ہی دل میں جیسے وہ خود کو سمجھاتا۔

ایک دن وہ مُنہ اندھیرے اُٹھ گیا۔ اُس کا باپ خراٹے لے رہا تھا۔ اس کی ماں نیند میں
غافل تھی۔ گھر میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اُس نے کروٹ بدلی۔ اُسے پھر فٹ بال یاد آگئی۔
"لیکن روپیہ" - چراغ کی مدھم روشنی میں کھونٹی پر ٹنگا ہوا اُس کے باپ کا میلا کوٹ اُسے

یوں نظر آیا۔ گویا کوئی حسین پری اس کی کسی معصوم سی بات سے خوش ہو کر اُسے بہت سے روپے دینے آ گئی ہو۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ وہ ہی اس کے باپ کا پرانا، لمبا سا کوٹ، جس کی بڑی بڑی جیبوں میں سے اکثر اُس نے اپنے باپ کے لئے بیڑیاں نکالی تھیں۔

"نہیں — نہیں — یہ تو چوری ہے۔" جیسے کسی نے اس کا حسین محل ڈھا دیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ چور کو پولیس پکڑ کرلے جاتی ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ وہ کبھی چوری نہیں کر سکتا — مگر — بھوری پری مسکرا دی — میں تم سے بہت خوش ہوں۔ یہ لو تمہارا انعام — وہ ڈرتے ڈرتے بستر سے اُٹھا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ اور اس کے ٹھٹھرتے ہوئے ننھے ننھے ہاتھ باپ کے پرانے بھورے کوٹ کی بڑی بڑی جیبوں میں تیزی سے روپے ٹٹول رہے تھے۔ لیکن اُس کے ہاتھ جلدی پلٹ آئے — خالی — لرزتے ہوئے۔ جیسے بھوری پری بہت دُور جا کر اُسے منہ چڑا رہی ہے۔ "تم چور ہو — تمہیں کبھی روپیہ نہیں مل سکتا۔" وہ ڈر گیا۔ "نہیں۔ نہیں۔" اس کے ہونٹ دانتوں میں جکڑ گئے۔ اس کا باپ کھانسا اور وہ دوڑ کر بستر میں دبک گیا۔ گویا پولیس کے ہزاروں وحشی سپاہی بڑے بڑے ڈنڈے لئے اُسے پکڑنے آ گئے ہوں۔

اُس نے ایک دن اپنی ماں کے دوپٹے میں پیسے بندھے دیکھے۔ پیسوں کو محسوس کرتے ہی جیسے وہ کانپنے لگا ہو۔

"ماں — ! یہ کتنے پیسے ہیں؟" اُس نے ہمت کر کے پوچھا۔

اور اُس کی ماں نے تیوری پر شکن ڈالتے ہوئے کہا "کیوں —؟"

وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کا دل چاہا وہ کہہ دے — اُسے ایک روپیہ چاہیئے — وہ ایک فٹ بال خریدے گا۔ بنگلے کے بچے روزانہ فٹ بال کھیلتے ہیں — بازار میں فٹ بال ملتا ہے۔ اُسے صرف ایک روپیہ چاہیئے۔

"ماں ــــ ! مجھے ــــ" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ جیسے کسی نے اس کا گلا بھینچ دیا ہو۔

کام میں مصروف اُس کی ماں کو اتنی فرصت کہاں کہ اپنے بیٹے کے وہ الفاظ پڑھ لیتی جو اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر خشک ہو گئے تھے۔ کتنی معصوم تمنا تھی اس کی ــــ! لیکن کوئی اس کا پورا کرنے والا نہیں تھا ــــ وہ کبھی کبھی سوچنے لگتا "یہ اُس کے ماں باپ نہیں ــــ وہ کسی اور کا بچہ ہے۔ ماں باپ تو بچوں کو بے حد پیار کرتے ہیں۔ اُس کے کانوں میں بنگلے کے بچوں کے قہقہے گونجنے لگتے۔ وہ کتنے خوش ہیں۔ وہ روز فٹ بال کھیلتے ہیں۔ ہنستے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں ــــ اُس کی دنیا میں شاید کوئی باپ نہیں ــــ اُس کی شاید دنیا میں کوئی ماں نہیں ــــ وہ اکیلا ہے ــــ یہ نہ جانے کون ہیں ــــ"!

اُسے پہلی بار معلوم ہوا تھا۔ اُس کا باپ تیس ۳۰ روپے کماتا ہے ــــ "تیس روپے" دل ہی دل میں وہ گنگناتا رہا ــــ "تیس روپے کتنے زیادہ ہوتے ہیں ... ــــ وہ تیس ۳۰ فٹ بال خرید سکتا ہے۔ وہ یوں سوچتا جیسے وہ تمام روپے اسی کے ہوں۔

اُس نے ایک دن اپنے باپ سے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ابا ــــ!"

اُس کا باپ دن بھر کی محنت سے تھکا ہوا چارپائی پر پڑا جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اُس نے کچھ نہیں سُنا۔

"ابا ــــ!" اسلم نے اور زور سے کہا۔

"کیا ہے ــــ؟" باپ نے کروٹ بدلتے ہوئے آہ بھری۔

"مجھے ــــ!" اور جیسے وہ اب آگے کچھ نہ کہہ سکے گا ــــ "روپیہ چاہیئے"

"روپیہ ــــ! جیسے اُسے کسی نے زور سے جھنجھوڑ دیا ہو ــــ اب تجھے روپوں کی ضرورت پڑنے لگی۔ محلے کے بچوں میں بہت بگڑ گیا ہے ــــ بدتمیز ــــ"

اسلم کچھ نہ سن سکا۔ اس کا چہرہ دُھندلا گیا ۔ وہ زمین میں نظر گاڑے جیسے

معافی مانگ رہا ہو — نہیں — ! نہیں — ! مجھے روپیہ نہیں چاہیئے ۔ میں اچھا لڑکا ہوں۔ بنگلے کے تمام بچے بگڑے ہوئے ہیں ۔ فٹ بال بُرے لڑکے کھیلتے ہیں — وہ بھی کتنا اچھا لڑکا ہے ۔ وہ کبھی فٹ بال نہیں کھیلتا۔

ایک صبح اندھیرے اندھیرے اُس کی بھوری پری نے مُسکرا کر ایک روپیہ دے ہی دیا ۔ وہ کتنا خوش تھا۔ اُسے شاید پہلی بار حقیقی مسرت ملی تھی ۔ اُس کے تمام دوست اُس کے ساتھ تھے ۔ فٹ بال — ایک روپیہ — محلے کے بچے — جیسے وہ بھی پرندوں کا بچہ ہو ۔ وہ ہنس رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا — بالکل اُن بچوں کی طرح جن کو وہ بنگلے کی چہار دیواری میں دیکھا کرتا تھا ۔

دن کے ساتھ اُس کے دوست رخصت ہو گئے۔ شام کے ہلکے دُھندلکے نے اُسے ڈرا دیا۔

"ماں — !" وہ چلّایا۔

بھوری پری نے جیسے کالا لباس پہن لیا ہو۔ اور آسمان کے دامن سے بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں دکھا رہی ہو — تم چور ہو ۔ تم نے اپنے باپ کی جیب سے روپیہ چُرایا ہے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا، پولیس کے بہت سے سپاہی اس کے پیچھے دوڑے آرہے ہیں۔ وہ تیز تیز چلنے لگا۔

"نہیں — !نہیں — ! میں چور نہیں ۔ مجھے تو بھوری پری نے خوش ہو کر روپیہ دیا ہے۔ یہ فٹ بال — " اور اُس نے اپنی فٹ بال کو سینے میں بھینچ لیا ۔ گویا کسی دیو قامت پولیس والے نے اپنا سیاہ کھردرا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا ہو۔

"اسلم — !" اُس کا باپ چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی چلّایا۔

اور اسلم زور سے چیخ پڑا۔ "میں چور نہیں — ابا مجھے چھوڑ دو — میں چور نہیں"

"میں چور نہیں" اُس کے باپ نے اطمینان کا سانس لیا ۔ اور اسلم جیسے سرد ہو گیا۔

"روپیہ کہاں ہے ۔۔۔ ؟" باپ بھاری آواز میں چیخا۔

"مجھے نہیں معلوم ۔۔۔ !" سہمی سہمی آواز میں اس نے کہا۔

"تجھے نہیں معلوم ۔۔۔" اسلم کے منہ پر زور کا تھپڑ پڑا۔

"مجھے نہیں معلوم ۔۔۔ مجھے نہیں معلوم ۔۔۔" اس کا جسم لاتوں اور گھونسوں کے نیچے کچلا جا رہا تھا۔

وہ خاموش تھا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو رخساروں سے ڈھلک کر زمین پر گرنے لگے۔

"مجھے نہیں معلوم ۔۔۔ ابا مجھے مت مارو۔"

اس کا باپ چارپائی پر گر پڑا۔ اور اس کی ماں اسے گھورنے لگی ۔۔۔ چور ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ ! نہیں ۔۔۔ !!

گھر کی چھوٹی سی کوٹھری میں مٹی کا بجھتا ہوا دیا جیسے یہ سب کچھ دیکھ کر ہچکیاں لینے لگا۔ اسلم کو مت مارو ابا ۔۔۔ وہ بالکل بے قصور ہے۔

اقبال حیدری

# دو غزلیں

## (۱)

مصیبت کی حکایت ہوں بلاؤں کا نشانہ ہوں
زمانہ دیکھنے آئے کہ پامالِ زمانہ ہوں

میں اپنی شخصیت ہوں میں آپ اپنا زمانہ ہوں
جو سمجھو تو حقیقت ہوں نہ سمجھو تو فسانہ ہوں

مجھے بادِ خزاں برباد کرتی بھی تو کیوں کرتی
ضرورت جس کی بلبل کو ہے وہ رنگیں ترانہ ہوں

ابھی میں صبح کے تارے سے کچھ کہنے ہی والا تھا
ندا آئی کہ ناداں میں تری آہِ شبانہ ہوں

ادب سے پیش آئیں اہلِ زر اہلِ قناعت سے
کہ مفلس ہوں مگر اپنی جگہ خود اک خزانہ ہوں

خزاں بھی دیکھتا جا او بہاریں لوٹنے والے
جسے تو نے سنوارا تھا وہی رنگیں ترانہ ہوں

ادھر آ او مری ناکام تدبیرو! تمہیں رولوں
جسے تقدیر کہتے ہیں میں وہ سچا بہانہ ہوں

شریکِ گردِ راہِ حسن عالمتاب ہوں نوری
کسی کی ٹھوکروں سے مٹ گیا وہ آستانہ ہوں

سردار نوری

## (۲)

کیا جانے کس گنہ کی سزا پا رہا ہوں میں
ہر روز اک فریب نیا کھا رہا ہوں میں

ہر چند جانتا ہوں کہ ہے راستہ غلط
دھوکے میں رہنما کے مگر آ رہا ہوں میں

کل میں ہی رہنمائے دو عالم چنا گیا
رہزن جہاں میں آج گنا جا رہا ہوں میں

قدموں میں میرے گرتے تھے شاہوں کے تاج کل
اور آج ہر قدم پہ گرا جا رہا ہوں میں

میں تھا کہ میرے پیشِ نظر تھیں بلندیاں
میں ہوں کہ پستیوں میں گرا جا رہا ہوں میں

یارب ہو میری قوم صداقت سے بہرہ ور
یہ فکر ہے کہ جس میں گھلا جا رہا ہوں میں

یہ آسماں یہ چاند ستارے، چمن کے پھول
ممتاز منظروں میں بسا جا رہا ہوں میں

ممتاز ملتانی

# مشاعرے اور اُن کی اِصلاح

مشاعرے کیا ہیں ؟ موازنۂ خیال کے مرکز۔ فن و نقد کے آماج گاہ۔ شعر و ادب کے تربیت کدے۔ فن کاروں۔ ادیبوں اور شاعروں کے پُرکیف اجتماعات۔ نکتہ فہموں نکتہ دانوں اور نکتہ رسوں کی کامیاب محفلیں۔ تہذیب و متانت کی پر وقار جلوہ گاہیں۔ خوش مذاقی اور خوش گوئی کی مترنّم جنبشیں۔ جہاں سامع کا ذہن ایک غیر فانی انبساط اور رُوح ایک ابدی نشاط محسوس کرے۔ جہاں علم و ادب کے حجابات نگاہوں سے اُٹھتے چلے جائیں۔ جہاں تخیّل کی رنگا رنگ۔ مُسکراتی اور جھومتی ہوئی نئی نئی تصویریں دل و دماغ میں رعنائیوں کی تخلیق کریں۔ جہاں تغزّل کے پیکر۔ ادب کے آئینے میں بنتے۔ سنورتے اور نکھار کرتے ہوئے نظر آئیں۔ جہاں درس و پیام کی تلخ اور تند و تیز شرابیں متین الفاظ کے سیمیں ساغروں میں بھر بھر کر کانوں کے راستے پلائی جائیں۔ جہاں زبان و ادب کے گیسو فن کے محتاط شانے سے سُلجھائے جائیں۔ جہاں نظم و ضبط کی شمع محوِ گردش ہو۔ جہاں منتہی اور دیرینہ مشق فنکار اپنے جواہر ریزوں کو بایں اطمینان پیش کریں کہ ان کے خونِ جگر سے رنگین کئے ہوئے لعل و گوہر رائیگاں نہیں جا رہے ہیں بلکہ قدر دانوں اور جوہر شناسوں کے دل و دماغ میں محفوظ ہو رہے ہیں۔ جہاں طلبائے فن و شعر غیر ارادی طور پر ادب کے گنجینوں سے استفادہ کر سکیں۔ جہاں شریک ہونے والے روحانی لطافت کا ذخیرہ لئے ہوئے واپس جائیں۔ اور جہاں سے جانے کے بعد بھی کیف و انبساط کے تاثرات مدت تک قوتِ حافظہ میں انگڑائیاں لیتے رہیں۔ یہ ہے میری نظر میں

مشاعروں کا معیار۔

یہ معیار صرف خیالی یا نظری نہیں۔ تاریخ کا زبردست ہاتھ اُس کی پُشت پر ہے۔ ذرا ماضی کی کھڑکی سے جھانکئے اور ماں کی چلمنیں اُٹھائیے تو آپ کو نظر آئیگا کہ شاعروں نے جنم ہی اس معیار کی آغوش میں لیا ہے۔ آج بھی دہلی کے قلعۂ معلّٰی کی ویرانیاں۔ چاندنی راتوں میں آن ہو جانے والے مشاعروں کے مرثیے پڑھتی ہوئی نظر آئیں گی۔ آج بھی اُمرا و اعیان سلطنت کے برباد شدہ ایوانات زبان حال سے ذوقؔ و غالبؔ اور میرؔ و داغؔ کے اشعار سناتے ہوئے محسوس ہونگے۔ آج بھی دہلی۔ آگرہ۔ لکھنؤ۔ رام پور اور حیدرآباد کی سوگوار فضائیں۔ ان معیاری اور پُر وقار شاعروں کے اشعار گنگناتی ہوئی دکھائی دینگی۔ اللہ اللہ! مشاعرے نہیں ہوتے تھے، ادبی دربار سجائے جاتے تھے۔ پُر ہیبت۔ پُر رعب اور پُر وقار۔ قدم رکھتے ہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی روحانی محفل میں باریاب ہوئے ہیں۔ عالیشان شہ نشینوں میں صاف اور شفاف چاندنیوں کے فرش اُن پر جگہ جگہ ایرانی قالینیں گویا آبِ رواں میں تختۂ گل کا عکس۔ قالینوں پر گاؤ تکیئے اور پھر سنجیدہ سامعین اور خوش گو شعرا کی علیحدہ علیحدہ نشستیں۔ بھیگی ہوئی رات۔ پُر کیف ماحول۔ کافوری شمعیں روشن۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ارباب فردوس روحانیت کی فضاؤں میں خوش گوئی اور خوش فہمی کے مظاہرے کر رہے ہیں۔ حوریں گا رہی ہیں۔ فرشتے سُن رہے ہیں اور فطرت مسکرا رہی ہے۔

وہ دن رخصت ہوئے۔ وہ زمانے بیت گئے۔ نہ وہ دربار رہے۔ نہ وہ درباری۔ نہ وہ مشاعرے۔ اب ایک رسم ہے جو ادا کی جاتی ہے۔ ایک لکیر ہے جس پر راہ گیر چل رہے ہیں۔ لیکن امتداد ایام اور راہگیروں کی پیہم مسافرت نے اُس کو اتنا مدھم کر دیا ہے کہ مسافر اس کے ذریعہ منزل مقصود پر پہنچنے کی بجائے گمراہ ہو رہے ہیں۔ اور ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ اِس ارتقائی دور میں فرش کی بجائے میز کرسی کافوری شمعوں کی جگہ بجلی کے قمقمے ضرور جلوہ پیرا ہیں۔ لیکن جس طرح آج کے ہر شعبۂ حیات میں مادّیت کا راج ہے اور غریب روحانیت منہ چھپائے

بیٹھی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح مشاعرے بھی جسدِ بے روح بن کر رہ گئے ہیں۔ روحانیت اور لطافت ان محفلوں سے بھی رخصت ہو گئی ہے۔

موجودہ مشاعرے کیا ہیں۔ تھیٹر کے اسٹیج، سینما کے پردے، پھبتیوں کے مجرے، مشق ظرافت اور مسخرہ پن کے اکھاڑے۔ سوانگ اور نقل کے جلسے۔ بے ترتیبی اور بے نظمی کے مرکز ادبی بے کیفی اور بے حسی کے محل۔ لیکن طعن۔ طنز۔ تشنیع۔ فقرہ بازی۔ آوازہ کشی۔ خوش گپی اور مذاق سے کامیاب اور با اثر عمل کدے۔

جہاں ادب سر بگریباں رہتا ہے۔ جہاں زبان ذبح کی جاتی ہے۔ جہاں فن کا خون ہوتا ہے۔ جہاں شاعرِ نفس مغنی کامیاب ہوتا ہے۔ جہاں ذوق صحیح سے بے بہرہ۔ ادب سے ناآشنا اور ادبی حُسن سے محروم سامعین کی کثرت ہوتی ہے اور جاہل متشاعروں کی بہتات جہاں اساتذۂ فن جاتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ جہاں مبتدی منتہی کے دوش بدوش بیٹھ کر تضیع اوقات کا سبب بنتے ہیں۔ جہاں صدرِ محفل سامعین کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر کھیلتا ہے۔ کھلونا۔ بے زبان، گونگا اور بہرا۔ جہاں خوش مذاقی پاس ہو کر نہیں پھٹکتی۔ جہاں سے روحانیت کوسوں دُور رہتی ہے۔ جہاں وقارِ محفل کا انعقادِ محفل سے قبل ہی جنازہ اُٹھ چکا ہوتا ہے۔ نہ نظم۔ نہ ضبط۔ نہ شکوہ۔ نہ وقار۔ جہاں سے واپس ہونے کے بعد سر گراں۔ اور ذہن بوجھل اور دل بھاری بھاری معلوم ہوتا ہے۔ جہاں صاحب ذوق ایک لمحہ بیٹھنا بھی تضیع اوقات سمجھتا ہے۔ عام طور پر موجودہ دور میں منعقد ہونے والے بیشتر مشاعروں کی یہی کیفیت ہے۔ یوں کبھی کبھی اگر ایک دو مشاعرے معیاری اور کامیاب ہو بھی جاتے ہیں تو وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

آج کل مشاعروں کے افادی پہلو سے دانستہ گریز کیا جاتا ہے۔ بانیانِ محفل اسی مشاعرے کو کامیاب سمجھتے ہیں جس میں مجمع زیادہ ہو۔ خواہ وہ یتیم الفہم اور یسیر الذوق ہی کیوں نہ ہو دو چار کا کر پڑھنے والے اپنے کلام سے زیادہ اپنی خوش گلوئی کا مظاہرہ کر جائیں۔ اور سننے

والے قہقہے لگا کر۔ تالیاں بجا کر اور فقرے کس کر اپنے گھر واپس چلے جائیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ مشاعرہ ہو گیا اور کامیاب ہو گیا۔ دوسرے ہی دن اخبارات میں اس کی روداد شائع ہو گئی۔ حسین الفاظ میں اور خوبصورت جملوں میں۔ پڑھنے والے متاثر ہو گئے اور شائع کرانے والے خوش ــــــ اب اگر یہ سوچا جائے کہ اس سے ادب کو کیا فائدہ ہوا اور زبان کو کیا ترقی ہوئی تو دونوں جگہ صفر۔ سوال یہ ہے کہ ان کی اصلاح کیونکر ہو۔

(۱) میری اپنی رائے میں جب تک عوام کا مذاق بلند نہ ہو، مختصر ادبی محافل منعقد ہوں جس میں مخصوص سامعین اور مخصوص شعراء کو دعوت شرکت دی جائے۔ اس صورت سے وہ غلط مبحث جو عام مشاعروں میں نظر آتا ہے۔ پیدا نہیں ہوگا۔

(۲) میں مبتدی اور منتہی شعراء کے مشاعرے علیحدہ علیحدہ منعقد کرنے کے بھی حق میں ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مبتدی شعراء اپنے مشاعروں میں بطور راہنما یا نگراں کسی منتہی کو دعوت دے کر اس کی ہدایات کی روشنی میں اپنے مشاعرے کی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کریں یا منتہی شعراء کے مشاعروں میں بطور سامع شریک ہو کر اُن کے کلام کو اُن کی زبان سے سُن کر مستفید ہوں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ سوء ادبی کا ازالہ ہوگا بلکہ وقت بھی بچے گا۔ اور فائدہ بھی ہوگا۔ ممکن ہے کہ کوئی صاحب سوچیں کہ مبتدی اور منتہی کی تفریق کرنا ہی جھگڑا مول لینا ہے آج کل تو ہر شخص بجائے خود اُستاد ہے۔ میں عرض کروں گا کہ اول تو یہ تفریق ان اساتذہ کے ذریعہ بآسانی ہو سکتی ہے جو شاگردوں کی ایک مخصوص جماعت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ ہر اُستاد اپنے ہر شاگرد کے علم۔ معیار اور ادبی رتبہ سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اس کے لئے اپنے شاگردوں میں مبتدی اور دیرمشق کی تفریق کرنا آسان ہے اور وہ کر سکتا ہے۔ اب رہے ایسے شعراء جو کسی کے شاگرد ہی نہیں۔ وہ مبتدیوں اور منتہیوں کے مشاعرے علیحدہ علیحدہ ہو جانے کی صورت میں خود سمجھ سکیں گے کہ اُن کا کلام کہاں زیادہ کامیاب

ثابت ہو سکتا ہے ۔

(۳) تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اپنے شہر یا دور کے ایسے شاعروں کی جن کی شرکت متوقع ہے ایک مکمل فہرست مرتب کر لی جائے ۔ اور پھر فہرست میں سے ایک مخصوص تعداد کی جماعتیں بنائی جائیں ۔ مثلاً فہرست میں اگر پچاس شعراء ہیں تو دس دس کی پانچ جماعتیں یا پانچ پانچ کی دس جماعتیں بنائی جائیں ۔ اور پھر ہر ہفتہ مشاعرہ کر کے ان میں سے ہر ایک جماعت کو بالترتیب سنا جائے ۔ اور جب فہرست کی تمام جماعتیں ختم ہو جائیں تو پھر از سر نو یہ سلسلہ شروع کر دیا جائے ۔ اس صورت میں کسی شاعر کو شکایت کا موقع بھی نہیں ملیگا ۔ سننے والے بھی سب سے مستفید ہونگے ۔ اور وقت بھی بیکار ضائع نہ جائیگا ۔

(۴) صدر مشاعرہ ۔ شاعر یا کم از کم اس قدر ادب شناس ضرور ہونا چاہیئے جو خطبۂ صدارت دے سکے ۔ اور فضا اور ماحول اگر سازگار ہو تو محاکمہ بھی کرے ۔

(۵) صدر مشاعرہ داد بیجا ۔ نقرہ بازی اور آوازہ کشی کی بطور خاص نگرانی کرے ۔ آغاز مشاعرہ میں سختی سے ہدایات کر دے ۔ دوران مشاعرے میں بھی اگر ضرورت سمجھے تو اشارتاً اس پر اظہار خیال کرتا رہے ۔ لیکن میرا تجربہ شاہد ہے کہ مختصر اور مخصوص ادبی محافل میں ان ہدایات کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی ۔

(۶) تعین وقت اور اس پر پابندی کی بھی سخت ضرورت ہے ۔ ہر مشاعرے کے آغاز اور اختتام کا وقت متعین کر دیا جائے اور اس پر سختی سے عمل در آمد کیا جائے ۔

(۷) عام مشاعرے کرنا اگر ناگزیر ہی ہوں تو ان میں شاعروں کے لئے وقت کے تعین کے ساتھ ساتھ اشعار کی تعداد کا بھی تعین کر دینا چاہیئے ۔

مشاعرے اگر اصلاحی لائحۂ عمل کے ماتحت منعقد ہونے میں تو اس میں شک نہیں کہ یہ ادب کے خزانے بن جائیں گے ۔ ان میں مٹی کے انبار ہی نہیں ہونگے بلکہ صحیح معنوں میں یہاں کے سنگریزوں سے موتی نکلیں گے ۔ گو ہر شب چراغ چمکیں گے ۔ اور یہاں کے لعل وجواہر و نیا

کی نگاہوں کو خیرہ کر دیں گے۔ اور اگر مشاعروں کی اصلاح پر توجہ نہیں دی گئی تو اس میں بھی شبہ نہیں کہ بے فنی اور بے راہ روی کے یہ اڈے ادب کے مقتل بنے رہیں گے۔ جن میں صرف فن کاروں کی اُمیدوں ہی کا خون نہیں ہوگا۔ بلکہ شعر و ادب کی تدریجی ترقی بھی بد ذوقی اور بے فنی کی چھری سے بُری طرح ذبح ہوتی رہے گی۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

صبا متھراوی

# رقص ابلیس

# سرودِ زندگی

فریبِ بےخودی ہے اور میں ہوں — سرودِ زندگی ہے اور میں ہوں
تقاضائے کرم کچھ اور ہی ہے — مگر دامن تہی ہے اور میں ہوں
ترے ہمراہ شمس و ماہ و انجم — بھیانک تیرگی ہے اور میں ہوں
کروں کس طرح اظہارِ تمنّا — کسی کی سادگی ہے اور میں ہوں
وہ آئے ہیں سراپا کیف بن کر — روپہلی چاندنی ہے اور میں ہوں
دلِ غمگین میں طوفانِ غم ہے — مگر لب پہ ہنسی ہے اور میں ہوں
بساطِ میکدہ ہے ایک جُرعہ — انوکھی تشنگی ہے اور میں ہوں
ہے دل افسردہ آنکھیں شبنم افشاں — یہ ربطِ باہمی ہے اور میں ہوں

حبیبؔ اب شغلِ بیکاری یہی ہے
مسلسل میکشی ہے اور میں ہوں

علاءالدین حبیب

# سحر طرازی

نہ کوئی ہم نشیں اپنا نہ کوئی رازداں اپنا — نہ جانے پھر کھلا جاتا ہے کیوں رازِ نہاں اپنا
اثر انداز پھر ہو کیوں نہ یہ حسنِ بیاں اپنا — کہ شرحِ داستانِ دل ہے ہر اشکِ رواں اپنا
جہاں حسن و محبت ایک ہی مرکز پہ ہوں دونوں — اب اس منزل پہ چھوٹے جا رہا ہے کارواں اپنا
یہ آتش خیز نغمے اور یہ بھیگی رات کا منظر — پپیہے روک لے ظالم سرودِ پی کہاں اپنا
محبت کار فرمائے نظامِ بزمِ مکاں ہے — وگرنہ ہر نفس کیا ہو محیطِ جاوداں اپنا

سنائیں کس کو ساحرؔ اپنا رودادِ غمِ الفت
نہ کوئی ہم نوا اپنا نہ کوئی ہم زباں اپنا

ساحر سیمابی

بقیہ صفحہ ۲ لالہ مرلی دھر صاحب سرشری رام کے فرزند ہیں اور دلی کلاتھ مل۔ لائلپور کاٹن مل اور بہت سے دوسرے ملوں کے مالک۔

لالہ مرلی دھر صاحب کو فردوس کی طرف متوجہ کر دینا میرا کام نہیں اللہ کا کام ہے۔
خاص کراچی کے بھی ایک بہت ممتاز بزرگ بڑا کرم فرمارہے ہیں۔ لالہ مرلی دھر صاحب کے لئے اور ان بزرگ کے لیے فردوس کی کاروباری حالت درست کرا دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

(محمد واحدی)

# ایک اور حوصلہ افزائی

اخبار "مخبر عالم" رقم طراز ہے رسالہ نظام المشائخ دہلی کے مشہور و قابل مدیر ملا واحدی صاحب نے دہلی سے ہجرت کرنے کے بعد کراچی سے نظام المشائخ کے علاوہ ماہنامہ فردوس بھی جاری کیا ہے۔
صاحب موصوف شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کے تربیت دادہ اہل قلم ہیں جو اوائل عمر سے خواجہ صاحب کے ساتھ صحافتی زندگی میں رفیق و شریک رہے ہیں۔ انتظامی وسیع تجربات کے علاوہ خواجہ صاحب کی مانند دہلی کی شستہ و عام فہم روزمرہ کی زبان لکھنے میں امتیاز خصوصی رکھتے ہیں اور دنیائے صحافت کے کامیاب و پختہ کار اہل قلم میں شمار کئے جاتے ہیں۔
واحدی صاحب کی ذاتی علمی و عملی قابلیت و صلاحیت کے باعث ہمیں امید ہے کہ ان کا یہ نیا رسالہ بھی بہت جلد علمی حلقوں میں مقبولیت و ہردل عزیزی حاصل کرے گا اور ملک کے چوٹی کے معیاری پرچوں میں اس کا شمار ہوگا۔
۲۰×۲۶/۸ کی تقطیع پر ضخامت ۱۱۲ صفحات اور لکھائی چھپائی بہت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ قیمت سالانہ پانچ روپے آٹھ آنے۔ اور فی پرچہ آٹھ آنے ہے۔ جو سامان مطبوعات کی اس انتہائی گرانی و قحط القرطاس کے زمانہ میں زیادہ نہیں۔

ملنے کا پتہ۔ منیجر صاحب رسالہ فردوس۔ کراچی

# ایک اور

سردار صاحب جناب ماسٹر جگت سنگھ صاحب اپنے مشہور و معروف رسالہ "رہنمائے تعلیم" دہلی میں تحریر فرماتے ہیں:-

فردوس کراچی (باتصویر) یہ نادر اور نہایت مفید صحیفہ ستمبر ۱۹۴۸ء سے باقاعدہ پابندی وقت کے ساتھ کراچی سے نکل رہا ہے۔ رہنمائے تعلیم "فردوس" کے متعلق ایک بار پہلے بھی چند سطور شائع کر چکا ہے۔ مگر میں مجبور ہوں کہ ایسے مفید اور کارآمد رسالہ کی بابت کچھ دوبارہ لکھ کر اپنے ناظرین کرام کو اس کے پڑھنے کی طرف توجہ دلاؤں۔

"فردوس" کے کرتا دھرتا مدیر اعلیٰ محترمی محمد واحدی صاحب میدان صحافت و ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ ایک کہنہ مشق ادیب، تجربہ کار اور دلچسپ طبیعت کے مالک ہیں۔ آپ کے مضامین میں تنوع۔ دلکشی اور لطافت کے علاوہ کچھ کچھ مذہبی اور اصلاحی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ اب تک کے شائع شدہ پرچوں کے مطالعہ سے میری طبیعت بےحد مسرور ہو رہی ہے اور جی چاہتا ہے کہ ایسے اچھے اور کام کے آدمی کی دل کھول کر تعریف کروں اور عوام کی توجہ اس طرف منعطف کروں۔ کہ وہ جناب واحدی ایسی شخصیت کے جذبات اور عمدہ خیالات کا "فردوس" کے ذریعہ ضرور مطالعہ کیا کریں۔

فردوس کے ہر پرچہ میں دلچسپ افسانے، سماجی نقشے۔ چوٹی کے فنکاروں کے شاہکار۔ تاریخ و سیر سے متعلق اچھوتے مضامین اور دیگر نہایت ضروری، دل پسند اور کام کی چیزیں شائع ہوتی ہیں۔ چونکہ واحدی صاحب خود کامیاب صحافی، ادیب صالح اور زبردست مفکر واقع ہوئے ہیں اس لئے ان کی نظر انتخاب اور دلچسپ ڈھونڈھ بھال کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ کو شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی، خواجہ محمد شفیع دہلوی۔ ڈاکٹر سعید احمد بریلوی۔ آغا محمد اشرف ایم۔ اے۔ مولانا ماہر القادری۔ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی اور پرنسپل مشتاق احمد زاہدی ایسے ملک کے مایۂ ناز فنکاروں اور اعلیٰ ترین شخصیتوں کا تعاون حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ "فردوس" ملک و قوم کے اندر چوٹی کے جرائد و رسائل میں ممتاز جگہ حاصل کر رہا ہے اور اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے دیکھنے کے لائق ہے۔

محترمی واحدی صاحب کو جہاں ادب و اخلاق کی خدمت کا شوق ہے۔ وہاں خدائے برتر نے ان کے اندر مذہبی اور دھارمک خدمت کا چسکہ بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ میں اس بے مثال کامیابی پر اپنے بھائی واحدی صاحب کو صدق دلی کے ساتھ مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ میاں ان کے نیک ارادوں میں برکت دے اور زیادہ سے زیادہ ملک و قوم کی خدمت کرنے کی ہمت بخشے۔ آمین!

"فردوس" کا سالانہ چندہ صرف ساڑھے پانچ روپے ہے۔ جو اس کی خوبیوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔

جوشاندی
عالی جناب حکیم محمد نبی خاں صاحب جمال سوید دہلوی کی
حیرت انگیز ایجاد
نزلہ ام الامراض ہے اور جوشاندہ نزلہ کی بہترین اور مشہور و معروف دوا۔ جس کی ایجاد کا ر خانہ شریفی کی رہین منت ہے۔ لیکن زمانہ کی بڑھتی ہوئی مصروفیات نے دورِ حاضر کے تعلیم یافتہ حضرات کو اس نعمت سے محروم کر دیا تھا، اس لئے کہ وہ گھونٹنے، پلینے، یا بھگونے اور جوش دینے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اجمل اعظم کے پوتے عالی جناب حکیم محمد نبی خاں صاحب جمال سوید نے اس دشواری کو محسوس فرمایا اور موصوف نے اپنی ذہانت و حذاقت، نیز جدید سائنٹفک اصول کے پیش نظر کئی سال کی محنت اور تجربہ کے بعد جوشاندہ کے اجزائے مؤثرہ کو قرصوں کی شکل میں منتقل فرما دیا۔ اور اس طرح نزلہ کی یہ کامیاب ترین دوا، جدید تقاضوں کے سانچے میں ڈھل گئی۔ ابن مسیح الملک قبلہ دوہرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ایک طرف موصوف نے موجودہ نسل کے لئے طب یونانی کا سرمایۂ فخر کارآمد بنا دیا، اور دوسری طرف اپنے مقتدر اسلاف کی مایۂ ناز ایجاد کو معدوم ہونے سے بچا لیا۔
ترکیب استعمال:۔ ایک یا دو قرص حسب ضرورت ایک پیالی گرم پانی میں توڑ کر اچھی طرح ملا دیں۔ اور چینی شامل کر کے گرم گرم پئیں۔
نوٹ:۔ جوشاندی پینے کے کم از کم پندرہ منٹ بعد تک جسم کو ہوا سے محفوظ رکھیں۔
قیمت:۔ فی قرص دو پیسے۔ بتیس قرص کا بکس ایک روپیہ
ملنے کا پتہ:۔ منیجر دواخانہ حکیم اجمل خاں۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۹۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

# فردوس کا اگلا پرچہ

# کشمیر نمبر ہوگا

کشمیر کے متعلق پچھلے مہینوں میں میرے پاس کئی بہت اچھے اچھے مضمون آئے۔ لیکن میں انہیں سینت سینت کر رکھتا رہا، اس خیال سے کہ کشمیر کے لئے ایک پورا پرچہ وقف کروں گا۔

اتفاقاً مئی کے فردوس کی اشاعت میں مہینہ بھر کی دیر لگ گئی ہے اور پرچہ کو دوبارہ وقت پر لانے کی یہی صورت ہے کہ وہ مضامین اب چھاپ دیئے جائیں اور جون و جولائی کا پرچہ دوگنی ضخامت کا

## کشمیر نمبر

کے نام سے شایع کیا جائے۔

دوگنی ضخامت کے معنی ہیں۔ دوسو، سوا دوسو صفحے۔ مضامین کی اور ضرورت پڑے گی۔

اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ براہ کرم میری مدد فرمائیں۔

کشمیر مضمون آفرین عنوان ہے۔ کشمیر کی تاریخ۔ کشمیر کے مختلف دور۔ مغل شہنشاہوں کے سفرنامے۔ ذاتی سفرنامے۔ نظمیں۔ افسانے۔ کیا کچھ نہیں لکھا جاسکتا۔

ہر صنف کی بہترین چیز لکھنے والوں کی خدمت میں سَو، سَو روپے پیش کئے جائیں گے۔ یعنی بہترین تاریخی مضمون کے سَو روپے۔ بہترین افسانے کے سَو روپے۔ بہترین نظم کے سَو روپے۔ بہترین سفرنامے کے سَو روپے وغیرہ، وغیرہ۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو، پاکستان۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی، ڈپٹی منسٹر پاکستان اور ڈاکٹر محمود حسین صاحب، ڈپٹی منسٹر پاکستان سے عرض کروں گا کہ وہ تینوں مل کر انتخاب کردیں اور بتادیں کہ بہترین چیز کون سی ہے۔

مشتہرین حضرات اس خاص نمبر میں اشتہار دینے کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوں۔ اور منیجر صاحب فردوس سے جلد از جلد معاملات طے کریں۔

محمد واحدی

سیم عبد المجیب صدیقی بی ۔ اے ۔ ایل ایل ۔ بی نے مشہور آفسٹ پریس کراچی میں
دفتر رسالہ فردوس نمبر ۱۴ جمشید کوارٹرز ۔ کراچی سے شائع کیا —ایڈیٹر مع